نگارستان

ادبی جواہر ریزوں کا بے بہا خزینہ

آپ مفت بھی دیکھ سکتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ دو روپے پانچ آنہ (عہ/۲) ذریعہ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے اور دس دن کے اندر بغیر خراب کیے ہوئے واپس کر دیجئے تو آپ کو دو روپیہ بعد وضع کمیشن بھیج دینگے

ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟

اسلئے کہ ہمیں یقین ہے کہ آپ ایک مرتبہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد کبھی اس کو واپس کرنا گوارا ہی نہ کریں گے۔

یہ کتاب حضرت نیاز فتحپوری کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، جو سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور جن کی نظیر اردو ادب میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

جلد توجہ کیجئے

کیونکہ پہلا اڈیشن ختم ہونے کے قریب ہے

منیجر "نگار" بھوپال

نگار بک ایجنسی

تصنیفات علیاحضرت فرمانروائے بھوپال

معیشت و معاشرت۔ دونوں امور خانہ داری پر بہترین تصانیف ہیں قیمت علی الترتیب ۱۲ و ۱۲

فرائض النساء۔ عورتوں کو اس کا مطالعہ فرض ہے ۱۲

ہدایتہ الزوجین ۸ر مقصد ازدواج

تندرستی عہ ہدایات تیمارداری ۸ر

تربیت اطفال ۸ر حفظ صحت ۴ر

بچوں کی پرورش ۱۲ تہذیب نسواں ۱۲

ہندوستانی گھروں میں تیمارداری عہ

مہذب زندگی عہ الترتیب ۴ر

ہماری روح کا گھر عہ

سبیل الجنان۔ علیاحضرت کی مذہبی تقریروں کا مجموعہ ۱۲

عفت المسلمات۔ پردہ پر مدلل بحث عہ

مدارج الفرقان ۱۲ سیرت مصطفےٰ عہ

اخلاق سلطانی چار حصے ۸ر، ۱۲، ۱۲، ۱۲

افضال رحمانی

تصانیف جناب میمونہ سلطان شاہ بانو صاحبہ

آغاز اسلام۔ مولانا شبلی کی کتاب بدء الاسلام کا ترجمہ ۸ر

مبارک۔ تاریخ اسلام کا پہلا حصہ ۵ر خلافت راشدہ ۱۲

سلک مروارید۔ نہایت دلچسپ تاریخی کہانیاں ۱۲

دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ کی کتابیں

خلافت عثمانیہ۔ مصنفہ سید سلیمان ندوی عہ سمرنا میں یونانی مظالم عہ ترکی میں نصاریٰ کی حالت ۵ر

دیگر مصنفین کی تصانیف

روح نظیر۔ انتخاب کلام نظیر اکبر آبادی مع ایک فاضلانہ مقدمہ مرتبہ مخمور بی اے اکبر آبادی عا طواف زمین نہایت دلچسپ فسانہ عہ اسّی دن میں کرہ ارض کا سفر عہ

منازل السائرہ عہ سراب مغرب ۸ر الزہرا ۱۲ شب زندگی عہ نانی عشی ۸ر بنت الوقت ۸ر نوحہ زندگی ۱۲ دُر شہوار ۱۰ر یہ کتابیں مولوی راشد الخیری کی تصانیف ہیں اور ملک میں بے انتہا مقبول ہو چکی ہیں۔

جامعہ ملیہ علیگڈھ کی کتابیں

تاریخ الامت۔ اسلام کی بہترین تاریخ حصہ اول عہ حصہ دوم عا حصہ سوم عہ مبادی معاشیات اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب مصنفہ ذاکر حسین خاں بی اے عہ ترکوں کی کہانیاں ۱۲

جواہر ریزے۔ کپڑوں کے داغ وغیرہ دور کرنے کی ترکیب ۱۲ نیرنگ۔ ہر قسم کی زنانہ دستکاری سکھانے والی کتاب با تصاویر حصہ اول و دوم عا

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

کیوپڈ و سائکی

حضرت نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ ہے کہ اسوقت تک اسکی نظیر اردو ادب میں پیش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر آپ "نگارستان" دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس نوع کے جواہر ریزوں سے ساری کتاب مالامال ہے۔ نگارستان میں کیوپڈ و سائکی بھی شامل ہے اور قربانگاہ حسن بھی۔ قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر نگار بھوپال

ملاحظات

۱۔ ایک طرف تمنا تھی کہ جولائی سے پرچہ ۱۰۰ صفحات پر شائع ہوا کرے، دوسری طرف اندیشہ تھا کہ اس میں کامیاب ہونا مشکل ہے، اور آخر کار اندیشہ صحیح نکلا اور آرزو غلط، یعنی جولائی کا پرچہ بھی بدستور ۸۰ صفحات کا شائع ہوتا ہے، اسوقت تک ضخامت بڑھانے کے متعلق جسقدر خطوط موصول ہوئے ہیں، وہ یقیناً حوصلہ افزا ہیں، لیکن ان کی تعداد اسقدر نہیں ہے کہ اس پر "اکثریت" کا حکم لگایا جاسکے۔ بہرحال جب تک خریداروں میں سے کم از کم ۸۰ فیصدی اس کے لیے آمادہ نہ ہوں، ہم ایسی جسارت نہیں کرسکتے اور دسمبر ۱۹۲۴ء تک اور انتظار کرتے ہیں۔

۲۔ مئی کے پرچہ میں "نگار اور مسئلہ تصویر" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے، اسمیں ایک جگہ آپ یہ بھی لکھا ہوا پائیں گے کہ "نگار کا کاتب اچھا نہیں ہے" حالانکہ ہم نے اصل مسودہ میں یہ نہیں لکھا تھا اور نہ کاپی میں یہ الفاظ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پریس میں کاپی خراب ہوجانے کی وجہ سے اسکی دوبارہ کتابت کرائی گئی اور وہاں تبدیلی عبارت کے سلسلہ میں یہ الفاظ لکھدیئے گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے کاتب صاحب کو ان الفاظ سے صدمہ پہونچا، اور ہم ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان الفاظ کو واپس لیتے ہیں، حالانکہ یہ الفاظ ہمارے نہ تھے ہمکو اعتراف ہے کہ کاتب صاحب نے اس دوران میں نہایت محنت سے کام کیا اور کتابت کے لحاظ سے بھی انہوں نے کافی ترقی کی۔

1952

۳۔ جناب قمر کا جو افسانہ "حسن کی موت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسکو مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ یورپ میں مسئلہ نسائیات کسقدر خطرناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور شاعرانہ زاویۂ نگاہ سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یورپ کی عورت کیونکر عالم وجود میں آئی اور اس طرح اسکی فطرت کیا ہونی چاہیئے۔

۴۔ "ہندی شاعری کی تاریخ" اور "زبان اردو" دو مضمون سلسلہ کے شروع کیئے گئے ہیں، جو ستمبر تک ختم ہوجائیں گے۔

نیاز

بہترین ہدیہ

وہی ہے جو انسانی دماغ کے لیئے مفید و باعث فرحت ثابت ہو اور ایسا ہدیہ صرف "نگار" ہے۔ اپنے احباب کو اس سے محروم

اور دور سے دیکھنے سے یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ مرغیاں ہیں یا کوئی اور جانور۔ بعض مرغیاں بالکل تیتر بٹیر کے رنگ کی ہوتی ہیں ایسی مرغیاں بھی دیکھی گئی ہیں جن کے سروں پر خوبصورت کلغیں ہوتے ہیں۔

کبوتر دنیا میں سب سے بہتر کبوتر ہندوستان کا ہوتا ہے، یورپ میں جرمنی کے کبوتر بہت اچھے سمجھے جاتے ہیں، لیکن ہندوستان کے کبوتر کے سامنے انکی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے، ساری دنیا میں کبوتروں کی ڈیڑھ سو ذاتیں ہیں، اور ان ذاتوں کے مختلف رنگ چار ہزار تک پہونچتے ہیں، کبوتر کا عام قد تین انچ اور وزن سوا پاؤ سے پاؤ سیر تک ہوتا ہے، لیکن ایسے کبوتر بھی پائے گئے ہیں، جن کا قد ایک فٹ، اور وزن سیر سے اونچا ہوتا ہے، چوٹی دار کبوتریاں اعلیٰ ذات کی سمجھی جاتی ہیں، لقا، پاموز، موتی چور، اور دو یا تہ قسم کے کبوتر عالی نسب ہوتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ رنگ سیاہ، سفید، مکھی، کاسنی، صندلی، سبز، سرخ سفید و سیاہ، نیلا، صندلی گول مکھبارا، اور کاسنی و سفید ہوتے ہیں ان سب میں لقا ذات کا کبوتر بہت وفادار ہوتا ہے، ایک دفعہ ہل جانے کے بعد اڑنا جانتا ہی نہیں، اور جس سے مانوس ہوجاتا ہے اُسکے دکھ درد سے متاثر بھی ہوتا ہے، اسکی چال بہت شاہانہ ہوتی ہے، اور نامہ بری کا کام خوب دیتا ہے پاموز میں دلہن پن زیادہ ہوتا ہے۔ جسم میں نزاکت اور چال میں رعنائی ہوتی ہے، اسکے پاؤں خاص وضع کے ہوتے ہیں، موتی چور کی آنکھیں ستم کرتی ہیں، بلا کی کشش اور گھلاوٹ، چمک اتنی کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ موتی کوٹ کر بھر دیئے ہیں دو یا تہ قسم کا کبوتر اپنی خصوصیات میں بالکل الگ ہے۔ یہ کبوتروں کی ذات میں پہلوان قوم کا سمجھا جاتا ہے اسکی آنکھ ناک چہرہ مہرہ سب کھرا کھرا ہوتا ہے لیکن فرمانبرداری اسکی گھٹی میں ہوتی ہے، نامہ بری کے کام میں لقا سے زیادہ کامیاب ہے، سینکڑوں میل فراٹے سے چلا جاتا ہے۔ جرمنی میں اس ذات کے کبوتر زیادہ ہوتے ہیں۔ لقا کی پہچان یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا سینہ بہت نکلا ہوتا ہے، اور اسکی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، لیکن گولائی زیادہ، کہیں بیضویت غالب، اور کہیں چپٹے ڈھال جیسے، ان کی آنکھ میں فخر شرافت کی جھلک ہوتی ہے۔ اور اتنا تنتے ہیں کہ قلابازیاں کھانے لگتے ہیں۔ اس کبوتر کی آواز بہت دلآویز ہوتی ہے، اور کبوتریوں کی غٹرغوں میں سریلا پن ہوتا ہے، بعض اور کبوتروں کے بھی سینہ اچھے ہوتے ہیں، لیکن وہ نہ اتنے چوڑے ہوتے ہیں، نہ ان میں اتنی خوشنمائی ہوتی ہے اور نہ ان کا رنگ اتنا حسین و جاذب نظر ہوتا ہے، بعض ملکوں کے کبوتر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پوٹوں کی پھولن میں سر نظر ہی نہیں آتا اور بعض کے پوٹوں میں سر و گردن، دونوں بالکل چھپ جاتے ہیں۔ افریقہ کے بعض علاقوں میں اُلو کی وضع کے بھی کبوتر پائے جاتے ہیں۔ ہسپانیہ وغیرہ کے کبوتروں کی چونچ گوشت کے لوتھڑوں سے ڈھکی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں چھتری دُم کے کبوتر بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن امریکہ میں ایسے کبوتر بکثرت ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا وغیرہ میں بھی پھیلی اور

ڈھی اوم کے کبوتر بہت زیادہ ہوتے ہیں، یورپ کے عجائب خانوں میں اعلیٰ ذات کے کبوتر پانچسو پونڈ تک کے ہیں۔

مکڑی دنیا میں سب سے بڑی مکڑی، اسپاین، اور بورنیو میں ہوتی ہے، اس کا جالا پانچ سے دس فٹ تک کا ہوتا ہے، اور اتنا مضبوط کہ چڑیاں اسمیں پھنس کر نکل نہیں سکتیں۔ اسکی زندگی گوشت پر بسر ہوتی ہے، پرندوں کا خوب شکار کرتی ہے، لیکن اسکی محبوب ترین غذا مچھلی اور چڑیاں ہیں۔

کوا کووں کی جتنی قسمیں اب تک شمار میں آسکی ہیں انکی تعداد اسّی تک پہونچتی ہے، اس کا عام رنگ سیاہ ہے، لیکن یہ بہت ادنیٰ ذات ہے، اعلیٰ ذاتوں کے رنگ خوشنما بھی ہوتے ہیں، سب سے اچھی ذات کا رنگ سفید اور نیلگوں چمپئی ہوتا ہے اس کا ڈیل ڈول بھی عام کووں سے بڑا ہوتا ہے، اور چونچ یک رنگ سیاہ ہونے کے بجائے سنہری مائل سفید ہوتی ہے اسمیں ایک ذات ایسی بھی ہوتی ہے جسکی عمر گدھ کی طرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔

مچھلی سب سے بڑی مچھلی بحر الکاہل میں اور سب سے چھوٹی فلی پائن میں ہوتی ہے، بحر الکاہل کی مچھلی آدم خور ہے اس کا شکار مشکل سے ہوتا ہے، دریائی جانوروں کو بھی بے تکلف کھا جاتی ہے، ایک دفعہ اسکی لاش ملی تو بدقت پچاس آدمی اسے اٹھا سکے، اور لانے کے لیئے چار گاڑیوں کی ضرورت ہوئی، صرف اس کا سر چار من کا تھا اسکے بعد فلورنڈا کا نمبر ہے یہاں کی مچھلی ۴۵ فٹ لمبی، ۴۲ فٹ گول، ۳۳۶۰۰۰ پونڈ وزن ۸۳۴ انچ کا منہ ۳۴ انچ کا، جبڑا ۱۰۴ انچ کی زبان اور ایک ہزار سے زیادہ دانت ہوتے ہیں۔ اس کے لیئے ایک کارتوس کی مار ناکافی ہوتی ہے، اسکی کھال کی موٹائی عام اوسط ۱۳ انچ ہے، یہ مچھلی ۴۰۰ پونڈ تک کی مچھلی کو ویسے ہی نگل جاتی ہے۔ ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بالکل انسانوں کی طرح ہوتا ہے فلی پائن کی مچھلی کا نام شمرپن ہے، اس سے چھوٹی مچھلی آج تک نہیں دیکھی گئی، اس کا وزن ½ گرین ہوتا ہے، انتہائی لمبائی پون انچ اس کے پھیپھڑے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ماہرین کا خیال ہے کہ اس سے چھوٹے پھیپھڑوں کا جانور ان کے مشاہدہ میں نہیں آیا، بحر روم، ایڈریاٹک اور بحر شمال میں ایسی مچھلیاں بھی دیکھی گئی ہیں، جن کے منہ سے نہایت تاریک دھواں نکلتا ہے اور وہ اسکے اندھیرے میں یا اپنے دشمن سے چھپ جاتی ہیں، اور ماندھا کے اسپر حملہ کرتی ہیں۔ ان ہی مچھلیوں میں ایک ذات ایسی بھی ہے جس کے منہ سے زہریلا دھواں نکلتا ہے۔

ہاتھی چارپائے جانوروں میں ہاتھی اور بارہ سنگھے کی نسل بہت جلدی بڑھتی ہے بارہ سنگھے کے ایک جوڑے سے سو برس میں ۵۰۰۰۰۰، اور ہاتی سے ۲۵۰۰۰۰۔ ڈاروِن نے اندازہ کیا تھا کہ ہاتھی کے ایک جوڑے سے ساڑھے سات سو برس میں ایک کروڑ نوے لاکھ کی تعداد وجود میں آتی ہے، ہاتھی کی عمر کا کام اوسط ڈیڑھ سو برس ہے۔ ۶۰ برس میں اسپر شباب آتا ہے، اور نوے تک رہتا ہے، سو سے بڑھاپا شروع ہوتا ہے اور ۱۵۰ کو پہنچکر مر جاتا ہے اسکی دوڑ دس میل

فی گھنٹہ اور معمولی رفتار ۱۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے، بہترین ہاتھی افریقہ کا سمجھا گیا ہے۔

بندر

بندر حقیقتۃً نوع انسانی سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے اگوریلا وغیرہ بیچ کی کڑیاں ہیں، افریقہ میں خط استوا کے قریب گوریلا کی ایک ایسی قسم دیکھی گئی ہے جو بندر سے بہت مشابہ ہے لیکن ڈیل ڈول انسانوں کا سا ہے قوت ناطقہ سے محروم مگر ساخت کے لحاظ سے انسان سے بہت مشابہ، اس کا معمولی قد ۵ فٹ اور وزن سات من سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن علماء فن اسکو بندر ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں، یہ تو بندروں کی اس نوع کا بیان تھا جو انسانوں سے بہت ملتے جلتے ہوئے ہیں، ہوسٹینڈ کے علاقہ میں بہت قوی ہیکل بندر ہوتے ہیں۔ وہاں آبادی کا دور دور نام و نشان نہیں ہے، سارے جنگل میں انکی بادشاہی ہوتی ہے، ایک دفعہ اتفاق سے چند بندر، ایک آبادی کی طرف آ نکلے، لوگوں نے انہیں مار پیٹ کر نکالدیا، لیکن یہ وہاں سے ٹلے نہیں، گاؤں والوں کی گائیں بھینسیں جب چرنے آتیں تو یہ انہیں گھیر لیتے، اور ان کا دودھ پیکر پیٹ پالتے تھے، امریکہ کے ایک حدیقۃ الحیوانات کا افسر چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ یہ بندر بالکل انسانوں کی طرح دودھ پیتے ہیں، اور اگر انہیں کھلایا پلایا جائے تو بہت جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ گوریلا کی طرح چمپانزی بھی بندر کی ایک قسم ہے، اسکی باتوں سے غور و تعقل ٹپکتا ہے، ہر قسم کی غذا بے غل و غش نہیں کھاتا، انسانوں سے بہت جلدی مانوس ہو جاتا ہے، بچوں کی طرح تھوڑا بہت ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بول بھی لیتا ہے، گنتی بھی جانتا ہے، اور جس سے مانوس ہو جاتا ہے اسکے تیوروں کو خوب سمجھتا ہے۔

ابرہم ہیل نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بندروں کی مختلف قسموں کے معاملہ میں صرف کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو بندروں کی تمام قسمیں خصوصاً چمپانزی وغیرہ نوکروں کی طرح ہمارے کام کاج کر سکتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ایک چمپانزی مدتوں ان کا خادم رہا ہے، جھاڑو دیتا تھا، جو تا صاف کرتا تھا، جو چیز اسے دیجاتی تھی، اسکو حفاظت سے رکھتا، اور صرف وہی چیزیں کھاتا تھا جو اسے اسی غرض سے دیجاتی تھیں۔ وہ گنتا بھی جانتا تھا، اور روپیہ کی قیمت سے بھی واقف تھا، اسکے مقابلہ میں ابتدائی قسم کے انسان جو اب تک کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں بالکل ایسے پائے گئے کہ ان میں اور چمپانزی میں سوائے چند باتوں کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا، گفتگو وہ بھی نہیں کر سکتا، یہ بھی نہیں کر سکتا، عقل اسمیں بھی نہیں ہے اور انمیں بھی نہیں، استدلال کی قوت اسمیں بھی نہیں ہے وہ بھی محروم ہیں، غرض انسانوں کی اس ابتدائی قسم کو سوائے شکل و صورت کے اور کسی بات میں انسان نہیں کہا جا سکتا۔ بندروں کی اقسام کے متعلق علماء فن کا خیال ہے کہ ۵۰ سے زیادہ نہیں ہیں۔

بعض حشرات

حشرات الارض میں چیونٹیوں کا ایک خاص رتبہ ہے، بعض قدیم کتابوں میں ان کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ جنمیں سے اکثر ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے سے سچ معلوم ہوتے ہیں، چیونٹیاں

ڈیڑھ سو قسم کی ہوئی ہیں، ان میں کالی چیونٹیاں غریب، لیکن چیونٹا آزار رساں ہوتا ہے، اس قوم میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور جنگ جو، ساتھ ہی زہریلی قسم سرخ چیونٹیوں کی ہوتی ہے، اپنی ہی نوع میں جب کسی سے لڑائی ہو جاتی ہے تو زندگی دو بھر کر دیتی ہے، حملہ کبھی اچانک کرتی ہے، اور کبھی اعلان دیکر، لڑنے میں اتنی دیر ہوتی ہے کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ بہت آرام طلب بھی ہیں، کھانے پینے کا سامان ایکدفعہ جمع کر کے بے فکر ہو جاتی ہیں نوکروں کے بغیر اس کا گزارہ نہیں ہوتا، رہنے سہنے میں امیرانہ ٹھاٹھ رکھتی ہے، لیکن شان امارت کی بنیاد اپنی ہم جنس پر نہیں رکھتی، بلکہ دوسری کمزور جنس یا دوسری کمزور قسموں کے حشرات کو گرفتار کر کے غلام بنا لیتی ہے، اس قوم میں ایک ایسی قسم بھی پائی گئی ہے جس سے انسان بھی عاجز ہو جاتا ہے زہریلے سے زہریلا سانپ اس سے بھاگتا ہے، اور شیر بھی ڈکرا ڈکرا کر جان دیتا ہے، ان میں اتحاد و اتفاق بہت ہوتا ہے، کوئی کام بغیر مشورے اور ایک دوسرے کی شرکت کے نہیں کرتیں، ہزاروں کی جمعیت سے حملہ کرتی ہیں، اور جب تک کامیاب نہیں ہو لیتیں پیچھے نہیں ہٹتیں، انکے گھر دیمک کے سے ہوتے ہیں مگر اتنے مضبوط کہ ایک دفعہ اینٹ ٹوٹ جائے مگر وہ نہ ٹوٹے، ان کا گھر دس فٹ عرض، ۴۰ فٹ طول اور ۲۵ فٹ بلند ہوتا ہے کیسی ہی برسات ہو مگر وہ ٹپکنے کا نام نہیں لیتا، ایک ایک گھر میں لاکھ سوالاکھ چیونٹیاں مزے سے رل مل کر رہتی ہیں، چیونٹیوں کی طرح دیمک میں بھی بہت اتحاد ہوتا ہے، اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ایک بانبی میں لاکھوں کی تعداد ہوتی ہیں حشرات الارض کے ماہرین کا بیان ہے کہ حشرات کی جتنی اقسام اب تک شمار میں آسکی ہیں وہ ایک کرور تک پہونچتی ہیں۔ جنمیں سے صرف یورپ میں ۲۵۰۰۰ ہیں

حال میں ایک ایسا جانور ملا ہے جو جانوروں اور پرندوں کی خصوصیات کا جامع ہے، ڈیڑھ انچ لمبا ہوتا ہے، خشکی اور تری دونوں میں رہتا ہے، پیر اس قسم کے ہیں کہ زمین کھودنے، تیرنے اور خشکی پر چلنے میں یکساں مدد دیتے ہیں، دانتوں کی جگہ چونچ ہوتی ہے، اور پیچھے ایک لمبی سی دم، اس کے چار پاؤں ہیں، لیکن بالوں کے بجائے پر ہیں، بچے انڈوں سے نکلتے ہیں مگر دانا چگنے کے بجائے دودھ پیتے ہیں اور جسم کے جس حصہ میں چونچ لگا دیتے ہیں دودھ اترنے لگتا ہے۔

غزل

ایک میں ہوں عیش جس کا شیشۂ دل چور ہے
محفل ساقی میں ورنہ ہر کوئی مسرور ہے

اے نگاہ آشنا اتنی بھی بیگانہ نہ ہو
اسقدر بے اعتنائی دوستی سے دور ہے

کوئی بھی پرساں نہیں یارب وطن میں عیش کا
کس مصیبت کی جگہ یہ خاکِ بارکپور ہے

مرزا اشار علی بیگ عیش

جمّن کی موت پر حوروں کا اضطراب

—۱—

جمّن جولاہے کی موت سے کسی کو رنج ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن عالمِ لاہوت کی اُس نورانی آبادی میں جسے "حوروں" سے تعبیر کیا جاتا ہے یقیناً زبردست تہلکہ پڑ گیا۔

جمّن اپنے قصبہ میں سب سے زیادہ دیندار، متقی اور شب زندہ دار انسان تھا، لیکن بدقسمتی سے اس نے صورت ایسی مکروہ پائی تھی کہ زہد و اتقا کی اس نورانیت نے (جو ایک متقی اور مرتاض شخص کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگتی ہے) اس کی بدصورتی سے مغلوب ہو کر ایسی بہیمیت اسکے سراپا میں پیدا کر دی تھی، کہ مشکل سے کسی کا دل اسکی طرف کھینچ سکتا تھا۔ عنفوانِ شباب میں اسنے شادی بھی کی لیکن جب دو سال بعد بیوی مر گئی تو پھر اسنے دوبارہ ایسی جرأت نہیں کی۔ یا یہ کہ اسکی جرأت کی پذیرائی نہیں کی گئی، اور اسلیے وہ جسوقت مرا تو نہ گھر میں بیوی تھی نہ کوئی اولاد۔ اہلِ محلہ نے معمولی مراسمِ تجہیز و تکفین کے ادا کر کے اسے سپردِ خاک کر دیا، اور مغرب کی نماز کے وقت محلہ کی مسجد میں بعض نمازیوں نے اس کی موت پر اظہارِ تاسف کر کے رسمِ عزاداری بھی پوری کر دی۔

کہا جاتا ہے کہ جنت کی حوریں ہمیشہ حوّر یعنی جوان رہتی ہیں، وہی اٹھارہ سال کا آنکھوں میں چبھنے والا شباب، وہی لگاوٹ کرنے والی نشیلی آنکھیں، وہی کوثر و سلسبیل کے گوہر تاب پانی سے دھلا ہوا نکھرا رنگ، وہی لانبے لانبے چمکیلے بالوں کا ریشمی زنجیروں کی طرح لٹکتے رہنا، وہی نازک کمری، وہی غنچہ دہنی، وہی سرو قدی، وہی عشوہ زائی، الغرض وہ سب کچھ جو معصیت کا بہترین سامان کہا جا سکتا ہے، حوروں میں ہمیشہ یکساں تازگی، نرمی اور لچک کے ساتھ پایا جاتا ہے، یعنے نہ اُن کے چہروں پر جھریاں پڑتی ہیں، نہ بالوں میں سفیدی نمودار ہوتی ہے اور نہ اُن کی "دشہر آشوب" جوانی میں کبھی انحطاط ہوتا ہے، اسلیے جنت کی کوئی حور ایسی نہیں ہے جو دنیا کی پیدائش و اموات اور یہاں کی شیب و شباب سے پوری طرح واقف نہ ہو، اور ہر ایسا واقعہ جس کا تعلق اُن کی زندگی سے ہے، اُن میں اضطراب نہ پیدا کر دیتا ہو۔

جہاں کوئی بچہ پیدا ہوا، اس کے خط و خال اور صحت و توانائی کا حال معلوم کرنا انہیں فرض، اور جہاں کسی نے تسبیح سنبھالی یا کسی جوان نے بڑھاپے میں قدم رکھا، پیشانی پر شکنیں ڈال لینا انہیں لازم، لیکن اسی کے ساتھ جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نوجوان دم توڑ رہا ہے تو ان کے چہرے فرطِ مسرت سے چمک اٹھتے تھے، اسلیے جب جمّن مرا تو حوروں کی جماعت میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ ایسا ضعیف الاعضا، مرتاض و زاہد، اور بدصورت بڈھا اُن کے علم میں اس سے قبل کبھی نہ مرا تھا اور اُن میں سے ہر حور اپنی

جگہ ڈر رہی تھی کہ کہیں میاں جمن اس کے سر پر مسلط نہ کر دیئے جائیں۔

صبح کو جب حوریں اپنی اپنی آرائش کے کمروں میں بھیجی گئیں تو اُن کے چہروں سے افسردگی برس رہی تھی اور مشکل سے ان کے قدم اٹھتے تھے، آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی وہ اپنے بال سنوار رہی تھی اور جمن کا گنجا سر اُن کے پیش نظر تھا، آنکھوں میں سرمہ لگا رہی تھیں اور اُسکی آنکھوں کا خیال جو پڑبال کی وجہ سے ہمیشہ گندی رہتی تھیں ڈرائے دیتا تھا، وہ اپنی اُنگلیوں کی پوروں کو حنا آلودہ کر رہی تھیں۔ اور جمن کی موٹی اور سخت اُنگلیوں کا تصور انہیں تڑپا رہا تھا، وہ اپنے نرم و نازک پانوں میں ریشمی موزے پہن رہی تھیں اور جمن کے اس بھدے پانوں کا خیال جس کی کھال وضو کی کثرت کی وجہ سے جابجا شق ہو گئی تھی جس کا انگوٹھا کھڑاؤں کی وجہ سے گھٹے پڑ جانے سے اونگلی سے بالکل علیحدہ رہتا تھا، انہیں چراغ پا کئے ہوئے تھا۔۔۔ انہوں نے جلدی جلدی نہایت بددلی سے تمام مراسم آرائش و تزئین ادا کئے اور اس قصر میں جمع ہو گئیں جو موسیقی کی مشق کے لئے مخصوص تھا، انہوں نے اپنے اپنے دستانے اتار کر حسب معمول سازوں پر اونگلیاں چلائیں، لیکن چونکہ ان کے دل ملول تھے، اسلیئے بجائے اسکے کہ عدن میں انکی موسیقی سے سکون و نشاط پیدا ہوتا، آج اضمحلال طاری ہو گیا اور سازوں سے نکلنے والی آہنگ غم نے ایسی افسردگی پیدا کر دی کہ فردوس کے بہت سے نازک پودے اور اُن کے پھول متاثر ہو کر مرجھا گئے

چونکہ فردوس کی تاریخ میں یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ وہاں غم و الم کے آثار پائے جائیں، اسلیئے جنت کی تمام آبادی نے اس انقلاب کو فوراً محسوس کر لیا، اور ہر جنتی کو اس غمگین موسیقی نے اُس کی دنیاوی زندگی کی غمناکیوں کی یاد دلا کر بے چین کر دیا، طیور دم بخود ہو گئے، طاؤسوں نے اپنا رقص بند کر دیا، نسیم چلتے چلتے تھم گئی، دودھ اور شہد کی نہروں کی روانی بند ہو گئی کوثر و سلسبیل کا پانی میلا ہو چلا اور جو سیب و انار ابھی پختہ نہ ہوئے تھے وہ بھی ڈالیوں سے علیحدہ ہو کر گرنے لگے۔

رضوان، جو فردوس کی کبھی نہ بدلنے والی زندگی کے جمود سے بخوبی آشنا تھا اور نہایت اطمینان سے اپنے مکان میں (جو جنت کے دروازہ پر ایک کوٹھری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا) پڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا، دفعتہً اس ہنگامہ خاموش سے متاثر ہو کر جاگا اور ابھی وہ آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ ایک فرشتہ بارگاہ قدس کی سمت سے آتا ہوا نظر آیا، اور ایک فرمان دیکر چلا گیا۔ فرمان میں درج تھا:۔

"فردوس کا غم میرے پاس پہونچاؤ، اور حوروں کی بیزاریاں پیش کرو۔ اہل فردوس مضمحل ہیں اور تو بے خبر، سارا انتظام درہم برہم ہو رہا ہے، اور تو بے پرواہ، بارگاہ قدس سے کوئی راز پوشیدہ نہیں لیکن میرا فرض ہے کہ سارا حال تحقیق کر کے وہاں تک پہونچاؤں، اپنی نیند ختم کر، قبل اس کے کہ تازیانۂ خداوندی کی آواز تجھیں بیدار کرے، اور اس سے پہلے کہ دوسری صبح کو سپیدیاں افق سے

نمودار ہوں، تم مفصل کیفیت مجھ سے آکر بیان کرو۔

"عدنائیل"

یہ تھا فرمان فردوس کے اس ناظم اعلیٰ کا جس کے ذریعہ سے تمام احکام خداوندی رضوان کو پہونچتے تھے اور جس پر جنت کے تمام طبقات کا انتظام منحصر تھا۔

(۲)

عہد قبل مسیح میں حوروں کی حالت وہ نہ تھی جو اب نظر آتی ہے۔ اُس وقت وہ حد درجہ مطیع و فرمانبردار، بے انتہا رواوار اور خاموش طبیعت والیاں تھیں۔ وہ ہر جنتی کی پذیرائی کے لیئے آمادہ رہتی تھیں، خواہ وہ کیسا ہی غبی وجامد کیوں نہ ہو اور وہ عدنائیل کے ہر فرمان کی اطاعت اپنا فرض سمجھتی تھیں خواہ وہ کیسا ہی مستبد ہو۔ لیکن جب مسیحیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض کے نسوانی طبقے میں حریت و آزادی کے جذبات ترقی پذیر ہوئے، تو حوریں بھی متاثر ہوئیں اور تمام جدید فیشن طرازیوں کے ساتھ انہوں نے اقتراعیت کی روح بھی اپنے اندر پیدا کرنی شروع کی۔

پہلے ان کا لباس صرف ایک ڈھیلا سا کرتہ ہوتا تھا جو گھٹنے تک جسم کو ڈھانکے رہتا تھا، اور بال بھی اپنی فطری حالت پر چھوڑ دیئے جاتے تھے، لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک حور سو سو قسم کے بال بناتی ہے، سنہری عینک استعمال کرتی ہے، غازہ لگاتی ہے، اونچی ایڑی کا جوتہ، دستانہ، ریشمی موزہ، بلاوز، کارسٹ گون، اور پیٹی کوٹ وغیرہ بھی کچھ اسکے پاس ہے، جسمیں وہ روزانہ نت نئی ایجاد سے چار چاند لگا دیتی ہے، آزادی کا جو عالم ہے وہ حمین کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب رضوان نے عدنائیل کے فرمان کی تعمیل میں اس ہنگامہ کی تحقیق شروع کی تو تمام حوریں ایک جگہ جمع ہوئیں اور باقاعدہ جلسہ کرکے میاں حمین کے داخلۂ فردوس کے متعلق نہایت سخت صدائے احتجاج بلند کی۔

اس جلسہ میں جو کوثر کے ساحل پر طوبیٰ کے قریب ایک میدان میں زرین شامیانے کے نیچے منعقد ہوا تھا، حوریں کثرت سے شریک ہوئیں اور اپنی پوری شان دلربائی کے ساتھ، ہر حور نے ایک نیا ملبوس اختیار کیا۔ اُن کا ادھر ادھر چلنا پھرنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا کے تمام مختلف رنگ کی تیتریاں یکجا مجتمع ہوگئی ہیں۔ ان کے لباس کے شوخ رنگوں کے امتزاج سے قوس و قزح کی سی کیفیت پیدا تھی یا یوں کہیئے کہ کسی مثلثی شیشے سے نکل نکل کر آفتاب کی کرنوں کے تمام اجزا ترکیبی منتشر ہوکر رہ گئے تھے۔

یوں تو اب ہر ہر حور اپنی جگہ شوخ و بیباک تھی۔ لیکن ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ چار حوریں بہت زیادہ دلیر اور چربانک تھیں۔ یہی ہر کام میں پیش پیش رہتی تھیں، اور انھیں کے اشارہ پر تمام حوریں چلتی تھیں۔ یہ جلسہ بھی انہیں

کے اہتمام سے منعقد ہوا اور انہیں میں سے ایک حور جس کا نام خضرا رکھا اور جو دوشیزہ حوروں میں سب سے زیادہ حسین و ممتاز تھی، جلسہ کی صدر قرار پائی۔

جسوقت وہ ایک تراشیدۂ الماس کرسی پر بیٹھنے کے لیئے اٹھی تو نازک ہاتھوں سے بلند ہونے والی سمیں آواز ہر چہار طرف سے بلند ہوئی، اور اس آواز کی گونج میں اس نے ڈائیس پر چڑھکر، جماعت کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:-

"بہنو، اس سے قبل صدارت کا فخر مجھے بارہا حاصل ہوا اور ہر مرتبہ میں نے نہایت مسرت سے اُسے قبول کیا، لیکن آج کا جلسہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسقدر اہم ہے کہ کسی ذمہ داری کی خدمت کو قبول کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، اور اسلیئے اگر آپ یہ دیکھیں کہ میں اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکی، تو مجھے ہدف ملامت نہ بنایئے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ کا بارگاہ قدس (یہ نام سنکر ساری حوروں نے اپنا سر جھکا لیا) تک پہونچنا ضروری ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں ہمارے مطالبات کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے۔

بہرحال اب جبکہ آپ نے اپنی متفقہ آواز سے مجھ پر اس اہم ذمہ داری کا بار ڈال دیا ہے، میں انکار بھی نہیں کر سکتی اور کوشش کرونگی کہ اپنی بساط بھر اس مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کروں۔

گزشتہ نصف صدی کے اندر ہماری جماعت نے جذبات کے لحاظ سے جسقدر ترقی کی ہے وہ اب اہل جنت کے لیئے راز ہے نہ جناب عدنائیل کے لیئے جن کے استبداد نے ہماری حالت کو ذلیل و خوار بنانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا، لیکن عمل کے لحاظ سے ہماری کوششیں ابھی تک ابتدائی حالت سے بھی نہیں گزری ہیں۔

ہرچند یہ حقیقت مجھ پر اسوقت تک روشن نہیں ہو سکی کہ ایک انسان سے ہمارا تعلق کس نوع کا ہے اور ہم میں وہ کیا بات ہے کہ ایک انسان ہم کو حاصل کرنے کی غرض سے اپنی ساری عمر ترک لذات میں بسر کر دیتا ہے، لیکن اہم تر سوال یہ ہے کہ انسان میں وہ کونسی خوبی ہے جس کا لحاظ کرکے ہمارے تمام جذبات اسقدر آسانی کے ساتھ پامال کر دیئے جاتے ہیں۔

انسان کی ہستی، جہاں تک میں نے غور کیا، عبارت ہے اُسکی صورت و سیرت کی مجموعی حیثیت سے یعنی یہ کہ وہ اپنے ظاہری خط و خال سے کیسا ہے اور اُس کے اخلاق کی حالت کیا ہے، لیکن یہ بھی کرۂ ارض کے ان عجیب و غریب باشندوں کی عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ اُن کے ان دونوں حیثیتوں کا ایک دوسرے سے موافق ہونا ضروری نہیں ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ایک اچھے اخلاق کا انسان حد درجہ مکروہ صورت رکھتا ہے اور ایک حسین خط و خال رکھنے والا آدمی نہایت بداخلاق ہوتا ہے۔ جس کا کھلا ہوا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ فردوس چند دن میں بدصورت انسانوں سے بھر جائیگی۔ اور جنت

حسن کا تعلق اخلاق و عمل سے نہیں بلکہ صرف جمالیات سے ہے، دوزخ سے بدتر نظر آنے لگے گی۔ کہا جاتا ہے کہ اصل حسن اخلاق کا حسن ہے، ممکن ہے دنیا میں اس نظریہ کا کوئی مفہوم ہو، لیکن ہم کہ ہمارے سامنے کوئی صورت عمل و نتیجۂ عمل کی کبھی پیش نہیں کیگئی (اس لحاظ سے کہ فردوس دار العمل نہیں) اسکے سمجھنے سے عاری ہیں اور ہم تو صرف اسی چیز کی قدر کر سکتے ہیں جو ہمیں دیکھنے میں اچھی معلوم ہو۔

وہ خاص واقعہ جس نے آج ہمیں یہاں جمع ہو کر گفتگو کرنے پر مجبور کیا ہے۔ حمن کی موت کا ہے، جو اپنے اعمال کے لحاظ سے حد درجہ خوش اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے بہت نیک سمجھا جاتا ہے، لیکن صورت اور تہذیب معاشرت کے نقطۂ نظر سے وہ اسقدر قابل نفرت ہے کہ مشکل سے اس بات کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی فردوس ایسی جگہ میں بار پا سکتا ہو

افسوس ہے کہ ہم دوشیزہ حوروں کو اُن حوروں کا پورا علم حاصل نہیں جو متاہل زندگی بسر کر رہی ہیں اور نہ اُن کا حال معلوم ہے جن کی خدمت پر وہ مامور کیجاتی ہیں، تاہم جہاں تک قیاس کام دیتا ہو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان کی زندگی بہت تلخ گزرتی ہوگی اور طبائع کا اختلاف دونوں کو اپنی جگہ ایک دوسرے سے بیزار رکھتا ہوگا، بہرحال ایسا ہو یا نہ ہو، کم از کم ہم کو ضرور اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے اور ہمیشہ کے لیئے یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ ہمارے مطالبات کیا ہیں اور ہم کب تک اس کوفت کو برداشت کرتے رہیں گے

ہم کو عزم کر لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ یہ معاملہ صرف عدنائیل کے رحم پر نہ چھوڑ دیا جائیگا۔ بلکہ بارگاہ قدس تک پہونچا کر وہاں سے فرمان حاصل کیا جائیگا۔ تاکہ یہ روز روز کی زحمت کسی طرح دور ہو اور ہم لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ فردوس سے زیادہ سکون کہیں نہیں، لیکن کہنے والے اگر ہمارے حال کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ دنیا کا ہر مقولہ درست نہیں ہوا کرتا، اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہونگی کہ اگر موجودہ اصول میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کی جائے، تو پھر ہمیں فردوس سے علیحدہ کر دیا جائے کہ اس صورت میں ہماری قوت انتخاب تو آزاد رہیگی!"

صدارت کی اس تقریر سے تمام حوروں میں حد درجہ جوش پیدا ہو گیا اور کئی تقریریں ہونے کے بعد آخرکار یہ قرار پایا کہ اسی وقت ایک میموریل طیار کیا جائے جب یہ مسئلہ ہمارے مخالفین کی طرف سے بارگاہ قدس میں پیش ہو تو ہمارے مطالبات و عذرات پر بھی آسانی سے غور کیا جا سکے،

آخرکار دو تین گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد ایک میموریل طیار کیا گیا اور ایک ورق زر پر نورانی حروف میں تحریر کر کے تمام حوروں کے دستخط ابر حاصل کیئے گئے۔ اس کے بعد پانچ ممتاز حوروں کا وفد رضوان کے پاس پہونچا، وہ اس وفد کو دیکھکر چونکا لیکن قبل اسکے کہ وہ گفتگو کی ابتدا کرتا، اس وفد نے اپنا میموریل اس کے حوالہ کیا اور وہیں نورانی فضا میں غائب ہو کر اپنے اپنے مستقر کو چلی گئیں میموریل کا خلاصہ یہ تھا:-

بہ پایۂ عرش کبریائی، بارگاہ حریم بے ہمتائی، خداوند قدوس لم یزل ولایزال، ایزد مطلق، صاحب بذل ونوال
ہم جنت کے اس طبقہ سے متعلق ہونے کی بدبختی حاصل ہے جو سب سے زیادہ مظلوم و پامال ہو اور ازل سے لے کر اسوقت تک جس کے جذبات کو مجروح کیاجارہا ہو، سنتے ہیں کہ تونے ہماری تخلیق میں فن جمالیات کی تمام نزاکتیں صرف کردی ہیں۔ اور اس بات کو اتنی شہرت دیدی ہے کہ کرۂ ارض کا کثیف باشندہ بھی اپنی موت کا غم ہماری تمنا میں بھول جاتا ہو، لیکن اے معبود برتر واعلیٰ، اس حقیقت کے سمجھنے سے ہماری عقلیں عاجز ہیں کہ تونے ایک نوری مخلوق کو خاکی پتلوں کا تابع کیوں بنادیا، اور باوجود اس کے کہ تونے ہمارے اندر تمام بہاریں رنگینیاں، تمام الماسی تابناکیاں، حلہ کافوری صباحتیں، اور ہلالی نزاکتیں بھردی ہیں۔ لیکن ہم اسپر بھی مجبور کیئے جاتے ہیں کہ ایک کثیف انسان، ایک سیاہ و بدرو انسان، ایک غیر مہذب و ناشائستہ انسان کی خدمت میں رہ کر اپنے تمام ان لطیف احساسات وجذبات کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر ہر وقت انگاروں پر لوٹتی رہیں۔ کیا تیرے عدل کا یہی تقاضا ہے کیا تیری بارگاہ کا یہی انصاف ہے، نہیں، نہیں ہرگز نہیں، ہمیں معلوم ہو کہ اسمیں بڑا حصہ عزائیل کے ظلم واستبداد کا شامل ہے جسکو تونے فردوس کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا ہو اور تو کبھی اسکو گوارا نہ کریگا۔

اسلیئے ہم نہایت عجز والحاح کے ساتھ اپنی تکالیف کا اظہار کرکے ملتمس ہیں کہ:-

ا۔ کسی انسان کے جنت میں داخل ہونے کا سبب صرف اس کا زہد والقا نہ قرار دیا جائے بلکہ اسی کے ساتھ ظاہر اخلاق۔ حسن معاشرت، تہذیب و شائستگی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

۲۔ کوئی ایسا انسان جس نے نہایت مکروہ صورت پائی ہے، وہ کسی حال میں بھی فردوس کا مستحق نہ سمجھا جائے خواہ اسنے عبادت میں ساری عمر ہی کیوں نہ صرف کردی ہو۔ اور اگر فردوس میں اس کا آنا ضروری ہو تو صرف سلسبیل وکوثر کے ساحلوں پر پھرنا اور باغوں میں رہکر میوے کھاتے رہنا اسکے لیئے مخصوص کردیا جائے اور ہمارے اسکے درمیان ایک ایسا حجاب پیدا کردیا جائے کہ نہ ہم اسے دیکھ سکیں اور نہ وہ ہمیں۔

۳۔ جب کوئی انسان جنت میں داخل ہو اور اسکو یہاں کی تمام لذتیں حلال کردیجائیں تو اسی کے ساتھ انکی وضع قطع، تراش، خراش، (جسمیں داڑھی، مونچھ اور لباس وغیرہ کے تمام جزئیات شامل ہونگے) تہذیب ومعاشرت کا انتظام ہمارے سپرد کیا جائے، اور اسوقت تک کہ وہ ہمارے ذوق کے معیار پر پورا نہ اترے، ہماری معیت سے محروم رہے۔

۴۔ اسوقت یہ دستور جاری ہو کہ جن حوروں کے قصر جنتیوں سے آباد ہو جاتے ہیں ان کے دوشیزہ حوریں

نہیں مل سکتیں۔ آیندہ یہ قاعدہ منسوخ کر کے متاہل و غیر متاہل حوروں کو باہم ملنے اور تبادلۂ خیالات کی اجازت دیجائے، اسی طرح ہمیں یہ بھی اجازت دیجائے کہ جس جنتی سے اور جس وقت بھی چاہے آزادی سے ملیں اور ہم کسی ایسے حکم کے ماننے پر مجبور نہ کیئے جائیں جو ہماری آزادی کے منافی ہو

۵۔ جب ہم کو یقین ہوجائے کہ کسی جنتی کی حالت اصلاح پذیر نہیں ہے، تو ہماری درخواست پر اس کے ہمارے درمیان ایک حجاب حائل کردیاجائے اور ہمارے دلوں سے اس کا خیال بھی محو کردیاجائے کہ اُس کی یاد ہمارے حال کو بدمزہ نہ کرے۔

۶۔ حسن و قبح کی جانچ بالکل ہمارے اوپر چھوڑ دیجائے اور قبل اسکے کہ کوئی شخص جنت میں داخل ہو، ہماری رائے طلب کرلیجائے اور ہماری تجویز کے مطابق عدنائیل احکام جاری کرے۔

۷۔ اگر مذکورۂ بالا مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی ناقابل قبول ہو، تو پھر ہماری استدعا یہ ہے کہ جنت سے علیحدہ کر کے کسی ایسی جگہ آباد کردیاجائے جہاں ہم کو آزادی حاصل ہو۔ خواہ اس کے لیئے ہمیں کتنی ہی جسمانی و روحانی تکالیف کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔

(۳)

حوریں صف بستہ کھڑی ہیں، عدنائیل و رضوان سر جھکائے ہوئے کپکپا رہے ہیں، تمام فضا برق آلود ہو رہی ہے، خلا کا روشن سکون، ہر ہر چیز پر مستولی ہے اور سکوت مطلق سے مغلوب ہو کر ہر ہر ذرہ جامد و غیر متحرک نظر آرہا ہے۔

عرصہ تک یہی مرعوب کن حالت قائم رہی اور پھر دفعتہً فضا کا نور سخت آواز کے ساتھ شق ہوا اور اس آواز نے آہستہ آہستہ ایک مفہوم اختیار کرلیا جو ان الفاظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے:۔

"اے عدنائیل و رضوان، حوروں کے تمام مطالبات تمھاری وساطت سے ہم تک پہونچے، اور باوجودیکہ حقیقت کا علم صرف ہم کو حاصل ہے لیکن چونکہ مخلوق پر ظلم کرنا ہمیں پسند نہیں اور نہ ہم کسی کو اس کی عقل کے خلاف راستہ چلنے پر مجبور کرتے ہیں اس لیئے ہم انکی آزادی سے برہم نہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کے لیئے ضرور ایسے اسباب مہیا کیئے جائیں کہ وہ خود حقیقت کو سمجھ لیں۔

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے ہیں کہ حوریں اپنی جس صورت پر ناز کررہی ہیں اس کے حسن و جمال کا قیام منحصر ہے صرف اس بدصورت جنتی کے اخلاق پر جس سے وہ اسقدر گریز کرتی ہیں اور ایک جنتی کی صورت نہیں بلکہ اس کے اخلاق ہی حسین ترین صورت میں فردوس کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسلیئے ہم حکم دیتے ہیں کہ تمام اُن حوروں کو جو آزادی کی طالب ہیں جنت سے علیحدہ کر کے

کرۂ ارض میں بھیجا یا جائے، اور یورپ میں دریائے ڈینوب کے مشرقی و مغربی ساحل کے جانب جسقدر زمین ہے وہاں منتشر کر دیا جائے اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی اجازت دیجائے کہ وہ انسانوں سے اپنی اپنی پسند کے مطابق رشتہ اتحاد قائم کریں، اور اپنے اُن جذبات کو جنہیں کا تعلق اُن کے گوشت پوست سے ہے، نہایت آزادی سے کام میں لائیں، یہاں تک کہ اُن کے اخلاق بالکل محو ہوجائیں اور کرۂ ارض کی آبادی ان کے وجود سے بیزار ہو کر آخر کار خود ان کو بھی اپنی زیست سے بیزار کر دے

قمر

غزل

اِدھر برق تپاں رکھدی اُدھر برق تپاں رکھدی
محبت نے مری ہستی غضب کے درمیاں رکھدی

کوئی تخلیقِ عالم کا سبب عشاق سے پوچھے
بنائے عشق کیا رکھدی بنائے دو جہاں رکھدی

تری نسبت نے تکمیل مرادِ زندگی کر دی
تری الفت نے بنیادِ حیاتِ جاوداں رکھدی

تری فرقت کے صدمے جھیلنا اور خوش نظر آنا
ترے قربان، تاثیرِ خوشی غم میں نہاں رکھدی

خوشا آزاد کا غم اور خوشا اندازِ غم خواری
کہ جنسِ غم خریدی اور پیشِ دوستاں رکھدی

آزاد انصاری

غزل

کس حال کس خیال میں ہوں کیا خبر مجھے
مجھ سے ہی چھین لے گئی تیری نظر مجھے

ممنوں ہوں کہ میری خبر کو تم آئے ہو
تقدیر کر چکی ہے مگر بے خبر مجھے

سب جانتا ہوں میں تری محفل کے واقعات
یہ اور بات ہے، نہیں اپنی خبر مجھے

تکمیل درد ہوتی ہے جب ہر دوا کے بعد
حسرت سے دیکھتا ہے مرا چارہ گر مجھے

اب وہ ہیں اور فکرِ جفا ہائے ناروا
اکبر مری وفا کا ملا یہ ثمر مجھے

اکبر حیدری

ایک صاحبِ کشف انگریز

آج کل عام طور سے صاحبِ کشف ہونا بڑی چیز خیال کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض جہلا اسے مافوق الفطرت قرار دیکر اپنے پیر یا کسی ایسے شخص کے سامنے جو ایسے شعبدے پیش کرتا ہے سربسجود ہو جانے میں ذرا تامل نہیں کرتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکاشفہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے اور ہر شخص میں یہ قوت موجود ہے کہ وہ دوسروں کے دلوں کے حالات معلوم کر سکے یہ صحیح ہے کہ اس نوع کی قوت ہر شخص میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتی، بعض میں قوی ہوتی ہے اور بعض میں ضعیف لیکن یہ ایسی نادر الوجود چیز نہیں جسکو فطرت انسانی سے بلند قرار دیا جائے، اور ہر ایسی نمائش کرنے والے کو بزرگ یا ولی سمجھ لیا جائے۔

بہت عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر نائنٹینتھ سنچری میں مسٹر کمبرلینڈ نے اپنے خیالات ظاہر کئے تھے، اور چونکہ وہ اپنے زمانہ کا عجیب و غریب صاحبِ کشف انسان تھا، اسلیئے جو کچھ اسنے بیان کیا وہ "اپنی بیتی" ہونے کے لحاظ سے بہت زیادہ قابل لحاظ ہے، ہم اس کی تقریر کا خلاصہ جو حال ہی میں المقتطف نے شائع کیا ہے اس جگہ درج کرتے ہیں۔ مسٹر کمبرلینڈ کا بیان ہو کہ:۔

یوں تو اپنے لڑکپن میں بھی میں بہت ذہین و ذکی تھا، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ مجھ میں یہ قوت بھی موجود ہے کہ لوگوں کے دلی حالات معلوم کر سکوں، صرف ۱۶ سال ہوئے کہ اس کا پتہ مجھے چلا ہے — میں ڈاکٹر اسمتھ کے مکان میں بیٹھا ہوا تھا، کہ مسمریزم کے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ اسنے مجھ سے دریافت کیا "کیا یہ ممکن ہے کہ انسان دوسرے کے قلبی حالات معلوم کر سکے" میں نے کہا کہ یہ ممکن ہے اور میں ایسا کر سکتا ہوں، اسنے کہا کہ "میں تمہارا امتحان لیتا ہوں اور اپنے دل میں ایک بات سوچکر کہتا کہ بتاؤ، "میں کیا سوچ رہا ہوں"۔ میں نے اس کا ہات پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ میں اس کے دفتر میں پہونچا اور ادھر ادھر پھر کر ایک تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا کہ تم نے اسی تصویر کا خیال اپنے دل میں پیدا کیا تھا، وہ یہ دیکھ کر متحیر ہو گیا اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میں مشق سے اس قوت کو بہت بڑھا سکتا ہوں۔

پہلے میرا خیال تھا کہ میں صرف اس چیز کا حال بتا سکتا ہوں جو گھر کے اندر موجود ہو، لیکن ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں انگلستان کے داماد مارکوئیس لورین کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ ایک خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا، اسنے پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو؟" میں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی اور مارکوئیس کا ہات پکڑ کر چل کھڑا ہوا، میں مختلف کمروں اور دروازوں سے ہو کر مکان سے باہر نکل گیا اور اصطبل پہونچکر ایک چیز پر ہات رکھدیا کہ یہی آپ کے ذہن میں تھی، جب میں نے پٹی آنکھوں

سے جدائی تو دیکھا کہ وہ ہرن کا بچہ تھا جسے اسکی بیوی بہت چاہتی تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ آسٹریا کے ولی عہد کے ساتھ پیش آیا کہ اسنے ایک سیاہ رنگ کتے کا خیال کیا در آنحالیکہ مجھے بھی نہ معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے، لیکن میں نے حسب معمول آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسکی رہنمائی کی اور کتے تک پہونچگیا۔

اس کے بعد میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ چھپائی ہوئی چیزیں بھی میں دریافت کرسکتا ہوں، چنانچہ ایک مرتبہ اسپین کا سفیر مسٹر چارلس ٹیر اور پروفیسر رومانس یکجا تھے اور انہوں نے مشورہ کرکے ایک آلپین کسی جگہ چھپا کر رکھدی لیکن میں نے فوراً اسے ڈھونڈھ لیا۔

ایک مرتبہ برلن میں ہم نے عید فصح کے موقع پر ایک انڈا خریدا اور اُسے سونے سے بھر کر سفیر امریکہ کو دیا کہ جہاں جی چاہے اسے چھپا دے۔ اس صحبت میں کونٹ ملٹکی ڈاکٹر نوشیوس اور پرنس راتیبون بھی تھے، جب یہ سب ملکر چھپا آئے تو میں ان کو ساتھ لیکر چلا اور اصطبل میں پہونچا۔ یہاں میں ایک ایسے صندوق کے سامنے کھڑا ہوگیا جو مقفل تھا، اس کے بعد میں نے پرنس راتیبون کی جیب میں ہات ڈال کر کنجی نکالی اور بکس کو کھولا جہاں گیہوں کے اندر انڈا چھپا کر رکھا گیا تھا۔

۲۱ جون سنہ ۱۸۸۴ء کو مسٹر گلیڈسٹون کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ اُسنے اپنے دل میں ایک عدد تین ہندسوں کا لے لیا۔ پہلے دو ہندسے تو مجھے فوراً معلوم ہوگئے کہ وہ ۳ اور ۶ تھے لیکن تیسرے ہندسہ کا پتہ نہ چلا۔ میں نے مسٹر گلیڈسٹون سے کہا کہ اس ہندسہ کا خیال دل میں کیجئے اور اس کے بعد میں نے معلوم کرلیا کہ تیسرا ہندسہ ۶ تھا اور کل عدد ۳۶۶ تھا اس کے بعد میں نے گلیڈسٹون سے پوچھا کہ "جب آپ نے یہ عدد اپنے دل میں لیا تو آخری ہندسہ کے متعلق کیوں تردد پیدا ہوا۔ اور کیوں پہلے ۵ کا ہندسہ ذہن میں آیا اور پھر ۶ لیا گیا، وہ یہ سنکر سخت متحیر ہوا اور بولا کہ یہ واقعہ ہے۔ پہلے میں نے ۳۶۵ عدد خیال کیا تھا جو سال کے دنوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن بعد کو جب دیکھا کہ یہ سال کبیسہ ہے تو میں نے بجائے ۳۶۵ کے ۳۶۶ کا عدد اختیار کیا۔

ایک مرتبہ میں برلن گیا اور پرنس ہنری باٹنبرگ اور کاونٹ ہنزولٹ نے میرا امتحان لیا، کاونٹ نے ایک بینک نوٹ لے کر پوچھا کہ اس کا نمبر کیا ہے اور میں نے بتا دیا، اس کے بعد قیصر جرمنی نے ایک عدد اپنے جی میں لے لیا اور میں نے قلم لے کر ۶۱ لکھا اور اس کے نیچے ۴ کا ہندسہ لکھدیا۔ اسکو سخت تعجب ہوا اور بولا کہ "سنہ ۱۸۶۱ء میری تاجپوشی کا سال تھا اور ۶۱ کا عدد میرے ذہن میں آیا تھا" ۴ کا ہندسہ جو میں نے نیچے لکھدیا تھا اس بینک نوٹ کا ایک ہندسہ تھا جسکے عدد میں نے بتائے تھے اور اس کا صرف ایک ہندسہ ۴ اس کے ذہن میں رہگیا تھا۔

قیصر جرمنی اُن لوگوں میں سے ہے جن کے ذہنی افکار کا معلوم کرلینا نہایت آسان ہے، کیونکہ انسان جتنا بڑا ہوتا ہے

میرے لیے اُس کا مافی الضمیر معلوم کرنا اسی قدر آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ولی عہد انگلستان نے مجھے کھانے پر بلایا اور اپنا مافی الضمیر دریافت کیا۔ میں نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور اپنے سامنے ایک کاغذ رکھ کر اسپر ایک دُم کٹے ہاتھی کی صورت بنادی۔ ولی عہد نے اعتراف کیا کہ واقعی میں اسوقت اس ہاتھی کے متعلق سوچ رہا تھا، جسے میں نے جزیرۂ لنکا میں شکار کیا تھا۔ اور گولی سے اُسکی دُم کٹ گئی تھی۔

اس سے زیادہ حیرتناک واقعہ مصر میں پیش آیا، خدیو نے اپنے قصر میں مجھے طلب کیا اور ایک عربی لفظ اپنے دل میں لے لیا، ہر چند میں عربی بالکل نہیں جانتا اور نہ لکھ سکتا ہوں لیکن میں نے قلم لے کر کاغذ پر لفظ عباس لکھدیا اور یہی اُسکے ذہن میں تھا۔

اس کے چار ماہ بعد احمد عرابی سے ملاقات ہوئی، اسنے ایک انگریزی لفظ اپنے دل میں لیا (حالانکہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا) میں نے اس لفظ کو کاغذ پر لکھا تو پڑھا نہ جاتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ عربی کتابت کے لحاظ سے اس لفظ کا خیال کیجئے اور اسکے بعد میں نے بتادیا۔ چونکہ وہ انگریزی لفظ کو انگریزی خط میں نہ لکھ سکتا تھا اسلیئے پہلے مجھے دقت ہوئی لیکن بعد کو میں نے آسانی سے دریافت کر لیا۔

اسی طرح ہندوستان میں مہاراجہ کشمیر نے ڈوگرا زبان کا ایک لفظ اپنے دل میں لے لیا اور میں نے اسی زبان میں لکھدیا۔ مہاراجہ نے مجھے بہت روکا اور خواہش ظاہر کی کہ اس کے وزراء کے دل کا حال بتاؤں کیونکہ وہ اُن کی طرف سے بدظن تھا، لیکن میں چلا آیا۔

وارسا کے قصبۂ پولینڈ میں، جنرل کورکو کے پاس مقیم تھا کہ مجھے خبر معلوم ہوئی کہ بغاوت پولینڈ کے دوران میں کسی امیر نے ایک صندوق اشرفیوں کا کسی جگہ دفن کر دیا تھا، لیکن بعد کو وہ بھول گیا۔ اسی اثناء میں دو آدمیوں نے وہ زمین کھود کر صندوق نکال لیا، اور اس سے اشرفیاں نکال کر صرف کرنے لگے، حکام کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے گرفتار کر کے مقید کر دیا لیکن صندوق کا پتہ نہ چلا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس باب میں کچھ مدد کروں۔ چنانچہ میں، مالک صندوق، جنرل کورکو اور مجسٹریٹ کو لیکر قیدخانہ پہونچا، اور اُن آدمیوں کو کچھ روپیہ دیکر کہا کہ اسکو جہاں تمہارا جی چاہے چھپا کر دیکھ لو۔ یہ کہکر میں سب کو لے کر باہر چلا آیا، اور تھوڑی دیر بعد اندر گیا اور اُن میں سے ایک کا ہات پکڑ کر آگے چلا لیکن مجھے کچھ پتہ نہ معلوم ہوا۔ کیونکہ اس شخص نے روپیہ نہ چھپایا تھا، لوٹ کر دوسرے آدمی کا ہات پکڑا اور آتشدان کی راکھ سے وہ روپیہ نکال لیا۔ اس کے بعد میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تم نے صندوق کا پتہ نہ بتایا، تو میں اسی طرح اس کا حال بھی معلوم کر لونگا۔ چنانچہ انہوں نے اقرار کر کے صندوق حوالہ کر دیا۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کس شخص کا مافی الضمیر معلوم کرنا آسان ہے اور کس کا دشوار، تو میں کہونگا کہ رجال سیاست علمائے ریاضی اور لٹریری آدمیوں کا مافی الضمیر معلوم کرنا زیادہ آسان ہے۔ اسی طرح ترقی یافتہ قوموں کا مافی الضمیر بہ نسبت وحشی قوموں کے آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے اور مردوں کا دلی حال بہ نسبت عورتوں کے جلد ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ عورتیں جمع افکار پر کم قادر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ماہر موسیقی اپنے فن کے علاوہ کسی بات پر غور کرتا ہے تو اس کا معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اطبا، اگر اپنے فن کے متعلق کوئی بات سوچتے ہیں تو جلد معلوم ہو جاتی ہے۔

تثلیثِ معنوی

(۱)

شجر میں ہے نہ حجر میں نہ کوہ و قلزم میں
نہ مہر و ماہ کے پہلو میں ہے نہ انجم میں

وہ کیا ہے ؟
ایک بلا ہے ؟ ——— دلِ حزیں ہے وہی !

(۲)

دلِ فرشتہ میں ہے اور نہ قلبِ حورعیں ہے
وحوش ہی میں کہیں ہے نہ وہ طیور میں ہے

وہ کیا ہے ؟
ایک نگہ ہے ؟ ——— شعورِ امیں ہے وہی!

(۳)

وہ نور جس سے منور ہیں مہر و ماہ امیں
وہ طور جس سے ہے روشن ضمیر قلبِ زمیں

وہ کیا ہے ؟
ایک ادا ہے ؟ ——— ترا یقیں ہے وہی!

امین حزیں

مداوائے حرمان

فیروزہ دروازہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی اور بمشکل سانس لیتی معلوم ہوتی تھی: اُسے کسی کا انتظار تھا اور سخت، وہ اگر دوسری جانب دیکھتی بھی تھی تو صرف آہٹ کو سنکر، کہ کہیں کوئی آ تو نہیں گیا، اس وقت فیروزہ کا اضطراب نزع سے کم نہ تھا، مگر اس تکلیف کا دور کرنے والا ایک نوجوان تھا جسے دیکھ کر وہ ایک نئی زندگی سے معمور ہو گئی۔

خورشید اپنے مخصوص انداز بے پروا کے ساتھ فیروزہ کی طرف آ رہا تھا، اُس کے مردانہ حسن و شباب میں اُسکے سنجیدہ و مستقل تبسم نے ایک خاص دلکشی پیدا کر دی تھی "جو اُسے دیکھکر متاثر ہو جانے کے سوا" اور کسی طرح بیان نہیں کیجا سکتی وہ اُن تمام صفات کا مجموعہ تھا جو اس عہد جدید میں ضروری سمجھی گئی ہیں۔

فیروزہ کے حواس پر آن واحد کے لیئے، بجلی سی گری اور دوسرے لمحے میں اُسکی طولانی قامتی ایک لرزش میں منتقل ہو گئی: آغوش خود بخود وا ہو گئی اور فیروزہ دفور جذبات و جوشش شوق سے سراپا اضطراب نظر آنے لگی، خورشید نے بکمال متانت اُس کو اپنی آغوش میں لے لیا، اور اُسکی تپش و بے قراری دیکھ کر مسکرا دیا، غرض فیروزہ کی حسین گردن خورشید کے شانہ پر ڈھلکی ہوئی تھی، اور اُسنے اپنے تئیں ایک زخمی ہرنی کی طرح اُسکی تحویل میں دیدیا تھا،

"خورشید، تم آگئے، میں نے چاہا کہ تمہیں یاد نہ کروں، آہ کاش میں مرجا سکتی!" اُس نے جملوں کی ابتدا نہایت پر ہیجان لہجے میں کی لیکن آخری الفاظ بہت کمزور آواز میں ادا ہوئے جو بمشکل سنے جا سکتے تھے،

خورشید جی جاماس جی ایک ہی وقت میں شاعر بھی تھا اور نقاش بھی وہ فنانہ طرازی میں رنگوں کا حسن ظاہر کر دیتا تھا اور اُسکے خطوط سے نطق و وجدان پیدا ہوتا تھا، اُسکے نقوش کے تاثر کو نظم کر سکنا اُسی طرح دشوار تھا جس طرح اُسکے انعطاف و تخئیل شعری کا کسی نقاش کے لیئے نقش کر لینا، اُسکی باتیں نہایت حسین و دلچسپ ہوتی تھیں، اُسکے لہجہ میں ترنم تھا، مسرت تھی علم مجلس اور آداب صحبت میں کوئی اُس کا نظیر نہ تھا، ہر صحبت میں ہر بات کو پوری توجہ سے سننا اور موقع پر موقع کی بات کہنا اُسکی خصوصیت تھی۔

جب وہ اُسکے قریب پہونچا تو فیروزہ کو خورشید کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ تھی اُسکی جھکی ہوئی نگاہیں ایک ایسا فسانہ کہہ رہی تھیں، جو کبھی بیان نہیں ہو سکا۔ گردش خون کی سرعت سے چہرہ تمتما رہا تھا اور اُسکے لبوں پر ایک ارتعاش نمودار ہو رہا تھا۔

"خورشید، تمہیں میری کیفیات قلب کا کچھ پاس نہیں! تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا سفتوں صورت نہ دکھانا میرے دل کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے" فیروزہ نے یہ فقرہ ایسے لہجہ میں کہا کہ اگر خورشید اُسکے جذبات کی ذرا بھی پذیرائی کرتا تو یقیناً پرنم آنکھیں اسوقت دریا بہا دیتیں، لیکن خورشید کی ظالم مہربانیوں میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی، اور فیروزہ کی آنکھوں کا نم خشک ہوکر رہگیا۔

خورشید بولا کہ "علوی محبت کا افسانہ آج تک کبھی مسرت پر ختم نہیں ہوا۔ اس جذبۂ عالی کا انجام درد وغم کے سوا کچھ نہیں آتا اور دونوں میں سے ایک یا دونوں کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کرتا ہے"

(۲)

تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا جب خورشید پہلی مرتبہ اندھیری اسلیئے آیا تھا کہ مضافات بمبئی کے اُس حسین ساحل کا نقش طیار کرے اور کم و بیش ایک ہفتہ قیام کیا تھا، کاؤس جی ہرمزجی ایک نہایت ضعیف پنشنر تھا۔ اُسکی بیوی کے انتقال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا جسنے اُسے ضعیف تر کردیا تھا، اور فیروزہ جو اُسکی تنہا لڑکی تھی، اُس کا سہارا تھی، شام کے وقت باپ اور بیٹی ساحل کی سکوں خیزیوں کی سیر کیلیئے نکلے تھے، خورشید مصروف قلمکاری تھا اور سمندر کی ہوائیں اسکے لانبے بالوں سے شوخیاں کررہی تھیں۔ فیروزہ کی لبریز شوق آنکھوں نے زلف برہم کے اس منظر اور شباب کے اس نقش ذی حیات کو دیکھا اور اُسکی نقاشی دیکھنے کے بہانے سے خورشید کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی، خورشید کی طبعی فصاحت نے اُسکو اس مختصر خاندان کا مہمان بنادیا اور اسنے اول روز کے اندر ہی محسوس کرلیا، کہ اُسکی ہستی فیروزہ کے دریائے جذبات کا عکس فگن ماہتاب ہے۔

جس صبح کو وہ رخصت ہورہا تھا، اُسکی شب میں خورشید نے فیروزہ کے جبین و رخسار کو اپنے لبوں کے لمس سے ملتہب کیا۔ اُسکے سنبل طراز گیسوؤنکو پیار کیا، اور صبح ہوتے رخصت ہوگیا۔ فیروزہ نے اولین احساس فراق میں اپنے دل کو کسی چیز سے خالی پایا۔ اُسنے محسوس کیا اُسکے دل کے اندر سے سب کچھ جاتا رہا ہے اور یہ خلا بے پایاں ہے، اب اُسے یقین آیا کہ خورشید اُسے اپنی محبت میں مبتلا کرگیا ہے فیروزہ کا تعلق خاطر از حد عمیق تھا، ایک خلوص معصوم تھا، اور اُس کا ہر رگ و ریشہ خورشید کے لیئے بے قرار تھا۔

فیروزہ کی فطرت یہ فیصلہ نہ کرسکتی تھی کہ وہ خورشید کے دل میں اپنے قلب کی بیقرار صدائے بازگشت سن سکے گی یا نہیں، اُسنے ایک نامۂ محبت لکھا اور صرف یہ لکھا کہ "مجھے تم سے محبت ہے اور میں صرف تمہارے لیئے زندہ ہوں!" لیکن وہ اس خط کو کہاں بھیجتی؟ وہ تو اسکے پتہ سے بھی واقف نہ تھی، اُسنے کبھی خورشید سے دریافت نہ کیا تھا اُسے اس کی فرصت کہاں تھی؟

چند دن بعد خورشید پھر اندھیری آیا، وہ اب بھی اُتنا ہی دلکش ؟ اور اُسیقدر خودلپند تھا، فیروزہ نے مسکراتے ہوئے وہ خط اُسکے ہاتھ میں دیدیا۔ ایک صناع کی فطرت نے خورشید کو صاف صاف جواب دینے سے باز رکھا، اور وہ فیروزہ کے اقبال محبت کو اپنے لیے ایک لطف انگیز داد سمجھ کر خاموش ہو رہا، اس ملاقات میں وہ سمجھی تھی کہ خورشید اُسکی دعوتوں کو لبیک کہیگا، اعتراف محبت کی پذیرائی کریگا۔ مگر یہ دیکھکر کہ اس کا یہ خیال غلط تھا اسکی آرزوئیں دل کے اندر حرارت بنکر رہ گئیں۔ اسمیں شک نہیں کہ محبت کی خواریاں بے انتہا ہیں۔ فیروزہ غریب فیروزہ نے محبت کی بھیک بھی مانگی مگر خورشید اس سے زیادہ مغرور ہوگیا اور وہ اسدفعہ بھی اپنی معمولی نرمی و ملاطفت کے ساتھ وداعی بوسہ لے کر رخصت ہوگیا۔

فطرت کی تقسیم ہمیشہ سے قابل اعتراض ہے مگر خورشید کے معاملہ میں اتنا خیال رکھا گیا تھا کہ اُسے انشاء و نگارش کے جوہر کے ساتھ: صرف حسن و وجاہت عطا کیگئی تھی بلکہ معقول خاندانی ورثہ بھی مرحمت ہوا تھا، اسلیئے کوئی صحبت، کوئی مجلس اور کوئی دروازہ اُسکے لیئے اجنبی نہ تھا، وہ ایسی ذہانت کا مالک تھا کہ اُسنے لوگوں کے انتخاب اور اُن کے سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کی تھی۔

خورشید کا تکبر و استغنا اکثر مشکلوں کا حل ثابت ہوتا تھا، مگر منتہائے تمدن پر پہونچکر، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، لوگوں کو اپنی پیچیدہ اور میکانکی شخصیتوں کا احساس ہوتا ہے، اور یہ احساس اُسوقت ہوتا ہے جب وہ اپنے امتیاز و تشخص کی قیمت اپنے بطلان عقائد، اور انفعال و التہاب کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ خورشید اسوقت تمدن کے اسی درجہ پر تھا۔ بمبئی کی پر تصنع زندگی میں منہمک رہنے کے بعد اُسے ضرورت پیدا ہورہی تھی کہ اب وہ اپنی ذکاوت ذہانت کا تختۂ مشق کسی سادہ ہستی کو بنائے اور اُسکے قلب و دماغ کے صفحہ سادہ پر اپنا احترام قائم کرکے اُسکی اچھوتی داد سے اپنے خستہ و ماندہ قلب کو تسکین دے۔ کیونکہ جن کمالات کا وہ پیکر تھا وہی خصوصیات سوسائٹی کے ہر فرد میں، کم و بیش پائی جاتی تھیں۔ اور اسوجہ سے اُس کا پندار مجروح ہوتا تھا۔ فیروزہ میں اسے ایک ایسی ہستی مل گئی تھی، چنانچہ اب وہ اپنے دنیائے تمول و تصنع کے پیدا کردہ اضمحلال روح کے لیئے فیروزہ کی دو دن کی صحبت کو نوشدارو پا رہا تھا، وہ اپنے تشخص و تکبر کو تازہ کرکے پھر بمبئی واپس چلا گیا، فیروزہ کی سادگی نے اپنی طبیعت کے خلاف ہزار ترکیبیں اسکو لبھانے کی اختیار کیں اور بظاہر اسکا التفات فیروزہ کو بھی حاصل ہوگیا۔ لیکن وہ خورشید کو روک لینے میں کامیاب نہو سکی، اُسے نہیں معلوم تھا کہ خورشید کا دل ہی وہ چیز تھا جو قدرت نے اُسکے دوسرے کمالات کے پیمانے پر نہیں بنایا تھا اور اسمیں "محبت" کے لیئے کوئی جگہ نہ تھی، انجام کار، فیروزہ پر ردعمل کا دور آیا اور اسے اپنے نسوانی پندار و خودداری کے پامال ہونے کا احساس ہوا، اُسے یہ ناگزیر احساس ہوگیا کہ محبت جتنی عالی ہوگی، اذیتیں اتنی ہی شدید تر ہونگی، خورشید چند بار بمبئی سے اندھیری آیا اور فیروزہ کو پہلے سے زیادہ خستہ

و مجروح کرکے اس کا یقین دلایا گیا۔

خورشید اپنی لباط نقاشی لے کر ساحل کی طرف جا رہا تھا اور فیروزہ جھلملیوں میں سے اپنی نگاہوں کو اُسکی مشایعت میں بھیج رہی تھی، سڑک پر بمبئی کو جاتی ہوئی ایک نہایت شاندار موٹر اُسکے پاس سے گزری اور چند قدم بڑھکر رُک گئی۔ ایک نقاب پوش خاتون ذرا جھکی اور نہایت شیریں آواز اور شیریں تبسم کے ساتھ خورشید سے کہنے لگی:۔

"کیا، خورشید! تم یہاں کیا کر رہے ہو! عجب حسن اتفاق ہے!" یہ کہکر اُسنے اپنی آواز کو سرگوشی میں بدل دیا، جس کا اثر یہ تھا کہ خورشید کی گردن میں ذرا سا خم پیدا ہوا، سر کسی قدر بلند ہو گیا اور اُسنے اپنے مستقل مضحک انداز میں کہا:۔

"یہ آپ کا خیال ہی خیال ہے" اور پھر طفلانہ شوخی و سرعت کے ساتھ موٹر میں اُسکے برابر بیٹھا نظر آیا۔ موٹر روانہ ہو گئی اور گو جھلملیوں سے دیکھنے والی نگاہوں نے اس واقعہ کو نہ دیکھنا چاہا مگر نتیجہ یہ تھا کہ آثار محبت و مسرت کی جگہ وحشت و غمگینی کو ملگئی تھی، فیروزہ اپنی بے صدا چیخیں خود اپنے ہی تئیں سناتی معلوم ہوئی اور اسکی نمناک آنکھیں خشک آنسو بہاتی نظر آئیں

"الٰہی! میں کیا کروں؟ میں کر ہی کیا سکتی ہوں!" ایک آہ بھر کر اُسنے خود ہی سوال کیا اور پھر "اُسے نہ دیکھوں، اُس سے نہ ملوں!" خود ہی جواب بھی دے لیا۔

(۳)

فیروزہ کی ماں کی زندگی میں، جہانگیر جی دادا بھائی نے جوان کا ہمسایہ بھی تھا کوشش کی تھی، کہ فیروزہ کے ساتھ اپنی شادی کا پیغام دے، لیکن فیروزہ کی ماں نے اُسکی اس خواہش کو طفلی ہی میں پامال کر دیا، اُسوقت سے کہ فیروزہ اور جہانگیر نے شعور سیکھا وہ اس خیال کی آبیاری کرتا رہا تھا۔ جہانگیر کا باپ اس مختصر آبادی میں سب سے زیادہ دولت مند آدمی شمار کیا جاتا تھا، لیکن بدقسمتی سے روئی کے سٹہ میں اُسکی تمام دولت ہاتھ سے نکل گئی اور اب دفتر کی کلرکی جہانگیر کی بسر اوقات کا ذریعہ تھی۔

جہانگیر نے اپنی حالت کا اندازہ کیا اور فیروزہ پر کبھی اپنی محبت کا اظہار بھی نہ کیا، ورنہ یہ ممکن تھا کہ وہ خود فیروزہ کو شادی کا پیغام دیتا اور وہ اسکو منظور بھی کر لیتی اور پھر اُسکی ماں بھی مجبور ہو جاتی۔ بہرحال فیروزہ کو اُسکی طرف محبت کا خیال بھی نہ آیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ جہانگیر اپنی نصف زندگی اُسے بیوی بنانے کے لیئے قربان کر سکتا ہے مگر خود اپنے دل میں اُسکے لیئے کوئی جگہ باقی تھی، جہانگیر کو اپنی محرومی کا سخت احساس تھا۔ فیروزہ و خورشید کی دوستی اُسکے علم میں تھی لیکن اُسکے حیات کے عجز نے رشک و حرماں کا اثر بہت کم ہونے دیا۔ اور چند روز بعد اُسنے قطعاً آنکھیں بند کر لیں: وہ اپنے مکان کے دریچے ہر وقت بند رکھتا تھا کہ کہیں ان دونوں کو ساتھ نہ دیکھ لے۔ شام کے وقت ساحل کی سیر کو نہ جاتا تھا کہ مبادا یہ دونوں ساتھ مل جائیں۔

(۴)

دوسرے روز وہی پرشان و شوکت موٹر فیروزہ کے دروازہ پر آکر ٹھہر گئی اُسے اطلاع ہوئی اور اُسنے خورشید کا جو سامان وہاں تھا نوکر کے ہاتھ بھجوا دیا، اور جو خط اُسے دیا گیا بغیر پڑھے اپنے نام کو کاٹ کر خورشید کا نام لکھا اور واپس کر دیا۔ دو دن کے بعد ایک اور خط بذریعہ ڈاک وصول ہوا: وہ ایک ایسی حالت تاسف و ملال میں مبتلا تھی جو از حد قابل رحم تھی۔ تھوڑی دیر تو انتہائے تذبذب کی حالت میں فیروزہ اس خط کو الٹی پلٹتی رہی، لیکن یکایک اُسکے خدوخال اور حرکات و سکنات میں سوائے عزم کے اور کسی چیز کا اعتنا نہ رہگیا، اور اُس خط پر "واپس" لکھ کر لیٹر بکس میں ڈالنے کے لیئے خود گئی اور اس اضطراب و عجلت کے ساتھ کہ گویا وہ کوئی شعلہ تھا جو اسکی انگلیوں کو جلائے دے رہا تھا۔

خورشید کو خطوں کے ذریعہ سے کامیابی نہیں ہوئی تو ایک روز وہ تنہا اُسی موٹر پر سوار ہو کر پہونچا۔ فیروزہ نے دور سے موٹر کو آتے دیکھکر دروازہ بند کر دیا، اور خدمتگار کو ہدایت کر دی۔ خورشید دروازے میں داخل ہونا چاہتا تھا اور خدمتگار اُس سے کہہ رہا تھا کہ "بائی جی ملاقات نہیں کر سکتی ہیں" فیروزہ تڑپ کر دروازہ کھولدینا چاہتی تھی، لیکن جب تک وہ نوکر کو دوسرا حکم دینے کے لیئے اپنے تئیں طیار کرے خورشید اس خجالت کو اپنی مستقل ادائے متسخر میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے واپس ہو گیا تھا۔ وہ اسوقت اپنے تئیں انتشار کی ایک ایسی حالت میں مبتلا دیکھ رہا تھا جس کا تجربہ اسے اسوقت تک نہ ہوا تھا، اور جسکی وہ کبھی توقع بھی نہ رکھتا تھا، اُسکے محسوسات متضاد تھے، وہ چاہتا تھا کہ اس واقعہ کو اُسی طرح جسطرح وہ سوسائٹی کے اور بہت سے معاملات پر نظر ڈالتا تھا، گزار دے، لیکن اُسکی حسیات کی بیچینی مانع آرہی تھی کہ وہ اسے اپنے ذہن سے محو کر سکے۔ یہ اُسکے لیئے ایک نیا تجربہ تھا، اور اُسکی فطرت کے لیئے شدید درس۔

آفتاب غروب ہو گیا تھا اور فضا کے سوگوارانہ تاثر نے فیروزہ کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، وہ کچھ اس درجہ محو ہو گئی تھی کہ ہر چند وقت معمول سے بہت زیادہ گذر گیا تھا مگر اُسے واپسی کا خیال بھی نہ آیا۔ منظر کی اُداسیوں میں اُسنے اپنے دل کے لیئے کچھ ایسی ہمدردی پائی کہ وہ وہاں سے اُٹھنے پر قطعاً آمادہ نہ تھی، خورشید کو آخری مرتبہ اندھیری آئے ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے، اور فیروزہ اسوقت اس کا خیال بھی بہتر کر رہی تھی، اس انہاک و خود فراموشی کی حالت میں کسی نے پیچھے سے آکر فیروزہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ چونک پڑی، ہر چند وہ خوف سے سپید ضرور ہو گئی لیکن جب اسنے خورشید کو دیکھا تو وہ کچھ نہ تھی مگر تسلیم و رضا اور عجز و فتادگی کی ایک تصویر۔ اُسکی تمام برہمیاں اور تمام ارادے بے معنی ثابت ہوئے اور اسکے بعد یہ دونوں اکثر ساتھ دیکھے گئے اور فیروزہ فتادگی محبت کی مسرتوں میں کھو گئی۔ اسدفعہ جب وہ بمبئی جانے لگا تو عدے وعید کے ساتھ۔ فیروزہ نے دکھتے ہوئے دل اور مسرور امیدوں کے ساتھ اُسے رخصت کیا۔

بمبئی پہونچکر خورشید کی پھر کوئی خبر نہ ملی اور اُسکی خودغرض فطرت پھر بروئے کار آگئی - اس پیمان شکنی نے فیروزہ کے دل کو پاش پاش کر دیا - اُسنے کسی قسم کی کوشش نہ کی اور اکثر مکان میں بند رہنے لگی، چند دن بعد جب اُس کا قلب اس صدمے کا متحمل ہوسکا، تو اس خیال سے کہ خورشید پھر اپنی صورت دکھا کر اُسکے عزم کو متزلزل نہ کر دے - فیروزہ نے جہانگیر کو بلا بھیجا، جہانگیر جب اُسکے پاس پہونچا تو خوف و عجز کی تصویر بنا ہوا تھا، فیروزہ از حد نڈھال تھی، اور اسکی حالت خستہ و زار - جہانگیر نے ڈرتے ڈرتے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا -

"جہانگیر! میرا دل ٹوٹ چکا ہے، اور اگر یہ تمہارے کام کا ہے تو حاضر ہے!" جہانگیر اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا، اور اس کا جواب اُسنے اسطرح دیا کہ اپنے لبوں کو اُسنے فیروزہ کی نازک اُنگلیوں پر رکھدیا اور دیر تک اسی حالت میں رہا -

فیروزہ کے باپ کا کوئی ارادہ اپنا ارادہ تھا اور اُسنے کبھی کوئی بات فیروزہ کی مرضی کے خلاف نہ کی تھی - چنانچہ ان دونوں کی شادی اُسی ہفتہ میں ہوگئی اور وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے لگے :- فیروزہ، جس کا نصیب یہ تھا کہ "جذبۂ عالیہ" سے روشناس ہو اور جہانگیر جسکی تقدیر یہ تھی کہ اپنی تنہائیوں اور مایوسیوں میں فیروزہ کو چاہتا رہے، یہ دونوں سکون حیات کے زمانہ میں دیکھنے کی چیز تھی!

خورشید کا یہ فلسفہ کہ "جذبۂ عالیہ" کی زندگی حرمان و الم ہے اور اگر وہ المناک انجام سے بچ سکتا ہے تو پھر شعریت سے معرا ہوجاتا ہے، ایک حد تک مان لینے کے قابل ہے، لیکن خورشید نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا اُسکی کیا تاویل ہوسکتی ہے کہ فیروزہ کی دلشکستگی جہانگیر کی غیر شاعرانہ آغوش میں پناہ گزین ہوگئی! کیا خورشید کی قوتوں نے اُسکی محبت کو مضمحل نہیں کر دیا

فیروزہ کی شادی کی اطلاع خورشید کو پہنچی اور اس خبر نے اسکے خوابیدہ دل کو بیدار کیا، اور اب وہ اپنی ہستی سے بھی خفا تھا، سوسائٹی نے اسکے بعد سے خورشید کو پھر نہ دیکھا، وہ آبادی سے علیحدہ ایک تنہا و مختصر مکان میں رہنے لگا ہے اور ایسا نقش بنانے میں مشغول ہوگیا جس کا عنوان اُسنے "مداوائے حرماں" قائم کیا ہے :- اس نقش میں وہ خود اپنا اور فیروزہ کا رومان نظم کر رہا ہے اور اگر وہ اُسے مکمل کرسکا تو دنیا اس موضوع پر بہتر نقش نہ دیکھ سکیگی!

ل - احمد

اطلاعات

۱۔ (شیدائی نظامی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں) آپ کا استفسار درج نگار نہیں ہوسکتا، دل کا تعلق ایک قسم کی کہربائی کیفیت ہے جسمیں جذب ضروری ہے۔ اسلیئے اگر کوئی ایسی کیفیت آپ میں پیدا ہوجائے تو اس کا اثر ہونا ضروری ہے

۲۔ (ن۔۔۔۔ ایولہ) آپ کی نظم "گل بلبل" میں پامال مضامین کا اعادہ ہے اسلیئے اشاعت سے معذور سمجھیئے۔ علاوہ اس کے یوں بھی اب "گل وبلبل" کا افسانہ چھیڑنا زمانہ و موسم کے اقتضا کے خلاف ہے کسی مفید مشغلہ کی جانب اپنی توجہ مبذول کیجیئے۔

۳۔ (عبد الفتاح خاں۔ بلارم) آپ کا استفسار درج نہیں ہوگا۔ توحید و رسالت کا سچے دل سے اقرار کرنا مستلزم ہے درستی اخلاق کو، اور نماز روزہ و تسبیح و توبہ استغفار کا بھی یہی مقصود ہے، لیکن چونکہ ہر شخص کے معتقدات اس کے اعمال پر موثر نہیں ہوتے اسلیئے مرشد و ہادی کی ضرورت ہر زمانہ میں تسلیم کیگئی ہے، البتہ اگر آپ خود اپنی صلاحیت نفس سے اپنے اخلاق درست کر سکتے ہیں تو آپ کو کسی پیر کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ (پورن سنگھ محتاج۔ گجرات) آپ اپنی غزل کی اشاعت کے منتظر نہ رہیئے، آپ کا ایک شعر اچھا ہے، اور اسے یہاں درج کیئے دیتا ہوں:۔

میں نہیں کرتا مقدر کا گلہ
جو ہوا محتاج سب اچھا ہوا

۵۔ (غلام رسول۔ لاہور) آپ کا صفحۂ معلومات درج ہونے کے قابل نہیں، آیندہ آپ بجائے ڈمسکس کے دمشق اور بجائے سائیریا کے شام لکھا کیجیئے۔

۶۔ (غلام قادر محمود حسین۔ ادیپور) آپ کے استفسار کا تفصیلی جواب نہیں دیا جاسکتا (۱) بزرگان دین کے متعلق میری وہی رائے ہے جو ہونی چاہیئے (۲) مزاروں پر جانا برا نہیں اگر اس سے مقصود صرف عبرت حاصل کرنا ہو (۳) ایک بزرگ مرنے کے بعد کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا سوائے اسکے کہ آپ خود اس کے اخلاق کی یاد کو پیش نظر رکھکر خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرلیں (۴) عرس کی تقریب پر روپیہ صرف کرنا اسراف ہے اور ممنوع (۵) رہا عورتوں کا وہاں جانا، سو ظاہر ہے کہ جب مردوں کے متعلق کلام ہے تو عورتوں کا جانا بدرجہ اولی قبیح فعل ہے

۷۔ (۰۰۰۰ ایولہ) آپ کی نظم "دریائے گنگا" میں نے شروع سے اخیر تک پڑھی۔ آپ نے شاید اسے مرہٹی زبان سے لیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اصل زبان میں یہ لطیف چیز ہوگی، لیکن اُردو میں منتقل ہونے کے بعد ذرا پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے، علی الخصوص اسوقت جبکہ اسی موضوع پر ہماری زبان میں اس سے قبل متعدد نظمیں بہت زیادہ دلکش انداز میں لکھی جا چکی ہیں، آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں اور شائع نہ کرسکنے پر نادم ہوں۔

۸۔ (سید مظفر الدین۔ عادل آباد) ممکن ہے آپ کے استفسار کا جواب کسی وقت تفصیلی طور پر دے سکوں، فی الحال یوں سمجھ لیجئے کہ مسئلۂ ارتقاء تمام عالم کون پر حاوی ہے اسلیئے عہد تاریک کے کسی انسان سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوسکتی جو عہد روشن میں ہوسکتی ہے مسئلہ توحید بھی جس کی تعلیم کی تکمیل نبی آخرالزماں کے ذریعہ سے ہوئی، تربیت کی تدریجی ارتقاء کا مقتضی تھا، اسلیئے اگر کوئی قوم کسی وقت شجر پرست یا حجر پرست تھی تو اسپر کوئی الزام نہیں، رہا ابوالبشر کا سوال، سو آپ کو کیا معلوم کہ اس سے قبل کرۂ ارض کی آبادی پر کتنے دور گزر چکے ہیں اور کتنی مرتبہ دنیا کی تہذیب بن بن کر بگڑ چکی ہے۔

۹۔ (یوسف۔ گجرات) آپ کی غزل درج نہیں ہوسکتی۔ ابھی آپ چند دن اور مشق کیجیئے، اس کے بعد پبلک کے سامنے اپنا کلام پیش کرنے کی جرأت فرمائیے گا، وحشی شاہجہانپوری اور حضرت دل کے جن دو مصرعوں کا مطلب آپ دریافت کرتے ہیں۔ انمیں کوئی پیچیدگی نہیں ہے غور کرنے سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے مصرعہ میں

جہاں تھا داؤد سا مغنی، جہاں تھا یوسف سا حسن مطرب

یوسف کو حسن مطرب کہا ہے اور مطرب حسن کی صفت ہے۔ مضاف مضاف الیہ نہ سمجھیئے، البتہ بجائے "یوسف سا" کے "یوسف کا سا" ہونا چاہیئے

۱۰۔ (سید مجتبیٰ حسین کوثر۔ علیگڈھ) آپ نے جس مضمون کی اشاعت کا تقاضہ کیا ہے، اگر وہ انیس کے متعلق ہے، تو اسکی نسبت میں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ مکمل کرکے بھیجیئے، اور اگر کوئی اور مضمون ہے تو براہ کرم اس کے عنوان سے آگاہ کیجیئے۔

۱۱۔ (محمد شریف قریشی۔ بلہڑاول) ڈاکٹر اقبال کے جو دو شعر آپ نے لکھے ہیں وہ رباعی کے نہیں ہیں بلکہ ان کی مثنوی کے ہیں۔ غالبًا لفظ نہاد نے آپ کو الجھا دیا۔ اس کے معنے اس جگہ بنیاد کے ہیں۔

۱۲۔ (محمد عطاءالحق۔ سراوہ) آپ کے استفسار کا جواب اگست میں شائع ہوگا۔

۱۳۔ (اصغر حسین خاں نظیر۔ لودیانہ) آپ کے استفسارات ہرچند مذہبی معتقدات سے متعلق ہیں اور میں ایسے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ذرا پس و پیش کرتا ہوں، تاہم اگست میں مختصرًا عرض کرونگا۔

۱۴۔ (سید رضا احمد جعفری۔ متھرا) آپ کے جو استفسارات قابل اعتنا ہیں ان کا جواب اگست میں ملاحظہ فرمائیے

مطبوعات جدیدہ

تاریخ عرب

مصنف: موسیو سیدیو فرانسیسی۔ مترجم: مولوی عبدالغفور خاں رامپوری و مولوی محمد حلیم انصاری
پبلشر: الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔ ضخامت ۵۳۰ صفحات، تقطیع $\frac{29+22}{8}$، کتابت طباعت غنیمت
کاغذ معمولی، قیمت قسم عام (جلد پارچہ) صہ، قیمت قسم خاص (جلد چرمی) معہ

مستشرقین مغرب و مورخین یورپ میں سب سے پہلا وہ شخص جس نے اسلامی عرب کی تاریخ کو ژرف نگاہی سے دیکھنا پسند نہیں کیا، غالباً موسیو سیدیو فرانسیسی ہے، اس سے قبل یورپ کے علمبرداران علم و فضل و مدعیان تحقیق و تفتیش کی محنت و کاوش کا مقصود صرف یہ ہوتا تھا، کہ جہاں تک ممکن ہو محاسن و فضائل کو چھپائیں اور نقائص کو نمایاں کرکے پیش کریں۔ جب موسیو سیدیو نے یہ کتاب شائع کی جو اس کی بیس سال کی مورخانہ کاوش کا نتیجہ تھی، تو مغرب کی فضا میں اس مسئلہ کے متعلق انقلاب پیدا ہوگیا اور وہ بدظنی جو عام طور پر عرب و اہل عرب کی طرف سے پیدا ہوگئی تھی اسمیں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے علی پاشا مبارک (سابق) ناظم تعلیمات مصر کو اس تصنیف کے محاسن کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے اس کا عربی ترجمہ موجودہ صدی ہجری کے ربع اول کے اختتام پر شائع کیا، میں نہیں کہتا کہ گزشتہ (تقریباً) ۲۵ سال کے اندر علی پاشا مبارک کی اس کتاب کو ہندوستان کے کسی صاحب علم و فضل نے نہیں دیکھا، لیکن اسکو اردو لباس میں پیش کرنے کا خیال سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جناب ظفر الملک صاحب علوی اڈیٹر الناظر کے دماغ میں آیا، جو اب ۱۹۲۴ء میں ہمارے سامنے ایک کتاب کی صورت میں پیش ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب کوئی بسیط تاریخ نہیں ہے، بلکہ بہت سے ضروری واقعات و حالات بھی تاریخ اسلام کے اسمیں نظر نہیں آتے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ ایسی مختصر کتاب میں ایسا جامع و حاوی تبصرہ تاریخ عرب اہل اسلام پر کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اس کتاب میں عرب قبل الاسلام سے لیکر ۱۸۵۰ء تک کے تمام ادوار اسلام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس زمانہ میں اسلامی سلطنتیں جہاں جہاں قائم ہوئیں ان میں سے ایک کو بھی ترک نہیں کیا، لیکن میرے نزدیک اس کا اہم ترین حصہ اُن ابواب پر مشتمل ہے جنمیں اسنے مورخانہ دیانت سے پوری طرح کام لیکر علماء عرب کی ذہنی و علمی ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔

قابل مبارکباد ہے علی پاشا مبارک کی ذات جس نے اس کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا اور اس سے زیادہ مستحق ستائش ہے ظفر الملک صاحب کی کوشش جنھوں نے اسے ترجمہ کرکے تمام اردو داں پبلک کے لئے قابل فہم بنا دیا۔ کثر اللہ امثالہ

ترجمہ صاف، شگفتہ اور سلیس ہے، صحت کے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے محترم مولوی سید سلیمان ندوی بالاستیعاب اسپر نظر ڈال چکے ہیں۔

گوہرین نامہ جسے میں اپنی انشاء میں "نامۂ گوہرین" لکھتا، مولوی محمد احسن اللہ خانصاحب ثاقب (پروفیسر عربی و فارسی وکٹوریہ کالج گوالیار) کے منظوم و منثور افکار کا مجموعہ ہے۔ غالباً اس حقیقت سے ناظرین بیخبر نہ ہوں گے کہ موجودہ جماعت "ثاقبین" میں سب سے پہلا وہ "شہاب" جو افق ادب پر رونما ہوا اور جس نے ایک زمانہ تک اپنی فضا روشن قائم رکھی، وہ مولوی احسن اللہ خاں ہی کی ذات تھی،

ثاقب صاحب عہد حاضر کے ان چند نفوس میں سے ہیں جو فطرت سے نہایت پاکیزہ ذوق علم و ادب لیکر آئے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اردو زبان کی بہت کچھ سنجیدہ خدمت کر سکتے ہیں۔ اس مجموعہ میں بڑا حصہ جناب ثاقب کے فارسی منظومات و رقعات کا ہے چونکہ ادارت "قند پارسی" کے زمانہ میں آپ اہل ایران سے بھی داد حاصل کر چکے ہیں اسلیئے اسکی "فارسیت" کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے، چند اوراق میں آپ کے عربی مکتوبات بھی نظر آتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک ہندوستان کے لیئے سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جسمیں آپ کی اردو غزلیں نظر آتی ہیں جنہوں نے مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ دیکھا ہے وہ آپ کے اردو کلام سے نا آشنا نہیں ہیں یہ مجموعہ ۱۹۲ صفحات کو محیط ہے اور ۱۲ میں جناب ثاقب صاحب سے گوالیار کے پتہ پر مل سکتا ہے۔ ضرورت تھی کہ کتابت و طباعت کی طرف بھی ایسی توجہ صرف کیجاتی کہ ظاہری صورت کے لحاظ سے بھی اسے گوہرین نامہ کہہ سکتے۔

اسرار ہستی سید ضامن حسین صاحب گویا کی اردو مثنوی ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۴۸ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اصناف سخن میں کوئی صنف مثنوی سے زیادہ اہم نہیں کہ اسمیں ہم ہر خیال کو جسطرح جی چاہے ایک مربوط سلسلہ کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں، لیکن کسقدر افسوس ہے کہ اردو میں اسوقت تک اسکے صحیح استعمال کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوئی، اور سوائے افسانۂ حسن و عشق کے کسی اور خیال کا اظہار ہی مثنوی کے ذریعہ سے نہیں کیا، اسلیئے جناب گویا کی یہ جدت قابل داد ہے کہ انہوں نے محض مذہبی، فلسفی اور تصوفی مسائل پر اپنی مثنوی کی بنیاد قائم کی ہے، مثنوی بھر میں کہیں اس قسم کے افسانہ ہائے حسن و عشق کی جھلک نظر نہیں آتی، جو عام طور پر مثنویوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ بلکہ اسمیں صرف وجدانیات و متعلقات وجدان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ایسی زبان میں کہ انسان کامی پڑھنے اور سمجھنے کو چاہنے لگے یہ نتیجہ ہے اس خوشگوار انقلاب کا جو ادبیات اردو کے متعلق ہمارے افکار و اذہان میں پیدا ہو رہا ہے فن شعر کے لحاظ سے میں اس مثنوی پر کوئی رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ جو کتاب خیالات و جذبات کی بلندی کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہے اسپر لسانیات کے اصول سے بحث نہیں کیجاتی۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ:- سید ضامن حسین گویا۔ محلہ احمد زئی۔ بیلی بھیت

ندائے اسلام یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ ہے جو دفتر الامان دہلی سے مولوی مظہر الدین صاحب اڈیٹر الامان کی ادارت میں گذشتہ چند ماہ سے شائع ہو رہا ہے اس رسالہ کا مقصد دین کے نام سے ظاہر ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ وہ مقاصد تبلیغ کو پوری طرح انجام دے رہا ہے، مولوی مظہر الدین صاحب ایک مخصوص رنگ کے لکھنے والے ہیں اور ان کے مذہبی مضامین میں بھی انشاء کا خاص لطف پایا جاتا ہے اس رسالہ کے شذرات جو زیادہ تر تبلیغی معلومات پر مشتمل ہوتے ہیں اور وہ مضامین جنمیں تعلیمات اسلام کی صداقت سے بحث کیجاتی ہے، مخصوص طور پر قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تمام ایسے رسائل کو جو پندرہ روزہ جاری کیئے جاتے ہیں ماہانہ کر دینا چاہیئے، کیونکہ یوں بھی وہ مہینہ میں ایک ہی بار شائع ہوتے ہیں (الجامعہ کلکتہ)، (درویش دہلی) ابھی پندرہ روزہ ہی کہلاتے ہیں حالانکہ وہ شائع ہوتے ہیں مہینے کے بعد ہی۔ اسطرح زیادہ وقت ملنے کی وجہ سے زیادہ غور و فکر سے مرتب کرنے کا بھی موقعہ ملتا ہے اور مقصود بات رہ نہیں جاتا۔ تقطیع بڑی۔ قیمت چار روپیہ سالانہ۔

جلد ۶ | فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۲۴ع | شمارہ ۲

صحابیات

امہات المومنین، بنات طیبات، مہاجرات، و انصاریات، مبایعات و غرائب النساء العرب کے حالات زندگی نہایت معتبر اسناد کی بنا پر مع ایک فاضلانہ مقدمہ کے یکجا کر دیے گئے ہیں، سرورق نہایت ہی خوشنما، کتابت و طباعت ازبس دلکش، حجم ۲۴۰ صفحات۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک وغیرہ ۱۲

منیجر نگار بھوپال سے طلب کیجیے۔

ملاحظات

۱- اگست کی کاپیاں طیار ہیں، اور میں عازم سفر۔ باوجود کوشش کے میں انھیں دیکھنے سے مجبور ہوں اور کاتب و منیجر پر (نا قابل اعتماد) اعتبار کر کے روانہ ہوتا ہوں۔

۲- افسوس ہے کہ اس مرتبہ بہت سے استفسارات کی جگہ، ہمارے عزیز دوست مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب کے نذر ہو گئی جن کے "ایرادات" پر اعتنا کرنا اسلیئے ضروری تھا کہ شاید اسطرح میری گمراہیاں دور ہوسکیں، لیکن آیندہ کے لیئے میں نگار کے صفحات کو اس نوع کے نزاعی مسائل سے پُر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

۳- وہ حضرات جو "شہاب کی سرگزشت" کو یکجا کتابی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں یہ اطلاع پہونچانا چاہتا ہوں کہ اسکی کتابت شروع ہوگئی ہو اور پہلے دو جزو پریس بھیجے جاچکے ہیں

۴- "دنیا کا اولین بت ساز" بہت عرصہ ہوا، میں نے محمد عالم صاحب اڈیٹر "عالمگیر" کی فرمائش پر لکھا تھا، لیکن جب اسکی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تو اسی خیال کو زیادہ بسط کے ساتھ میں نے "ایک مصلح بت تراش" کی صورت میں پیش کیا جو نگار میں اس سے قبل شائع ہو چکا ہے۔

۵- دفتر نگار میں بہت سے ایسے رسائل و اخبارات موصول ہوتے ہیں جن کے ساتھ نگار کا تبادلہ نہیں کیا جاتا، اسلیئے میں بتا نا چاہتا ہوں کہ بغیر طے کیئے ہوئے صرف "بغرض ریویو یا تبادلہ" لکھ کر کسی رسالہ کا کہیں بھیجدینا، تہذیب صحافت کے خلاف ہے اور انسانی خودداری کے منافی۔

میں امید کرتا ہوں کہ آیندہ سے تمام ایسے اخبارات و رسائل جن کے عوض نگار روانہ نہیں کیا جاتا۔ میرے پاس نہ بھیجے جائیں گے، اگر مجھے ضرورت ہوئی تو خود خواہش کرونگا یا چندہ ادا کر کے خریدار بنونگا۔

۶- جو حضرات ہندوستان کے تمام مشہور رسائل کی مکمل جلدیں شروع سے لیکر اسوقت تک اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں وہ ماسٹر محمد حمزہ خاں صاحب ڈاکخانہ ناندورہ (Nandaura) سے خط و کتابت کریں، جو بعض مجبوریوں کی بنا پر اس خزینۂ ادب کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔

تاج جنتری و ڈائرکٹری ایک لاکھ کی تعداد میں ۲۹×۲۲ کی تقطیع پر زیر طبع ہے ہندوستان اور غیر ممالک میں اس کے خریدار کثرت سے ہیں
اشتہار دینے والے اصحاب اسکے لئے جلد اشتہارات بھیجکر اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ خط و کتابت بنام خواجہ شوکت حسینی [illegible] آگرہ اخبار ہونا چاہیئے۔

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰۸

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

نگار

جلد (۶)	بابت ماہ اگست ۱۹۲۴ء	شمار (۲)

انقلاب روس اور بالشیوک حکومت

ماہ مئی کے مقالۂ افتتاحیہ میں انقلاب روس کی داستان اس حد تک پہونچی تھی کہ سوویٹ جمہوریت نے حد درجہ کشاکش میں مبتلا رہنے کے بعد آخرکار اسمیں کامیابی حاصل کرلی کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۰ء کو اس نے تمام لڑائیوں کی بساط الٹ دی اور بالشویک روس کی حدود میں جنگ کا خاتمہ کردیا، لیکن چونکہ اس انقلاب کا افسانہ اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ اس کے بعد بالشیوکی دور حکومت کے مناظر بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں، اسلیئے آج کی صحبت میں ہم انھیں پیش کرنا چاہتے ہیں:-

تین سال سے کچھ زائد عرصہ، ارتجاعی تحریکات اور اعادۂ ملوکیت کی کوششوں کے خلاف سخت حوصلہ آزما لڑائیوں میں بسر کرنے کے بعد، اب بولشویکوں کے سامنے دوسرا اور سب سے زیادہ اہم مرحلہ تعمیر حکومت کا تھا۔ انہیں ایک ایسے ملک کی تنظیم کرنی تھی جسپر اقتصادی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے موت طاری ہوچکی تھی، اور اسپر مزید یہ کہ انہیں دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ اشتراکیت کا عملی تجربہ کرنا تھا وہ اس ڈھنگ کو چھوڑکر جسپر مدتوں سے ملکوں کی تنظیم ہوتی چلی آرہی تھی، ایک ایسے طریقہ کو عمل میں لانا چاہتے تھے جو اب تک صرف نظریہ کی صورت میں موجود تھا۔ اور خود اسکے وکلا میں سے بھی اکثر افراد کو اسکے قابل عمل ہونے کا دلی یقین نہ تھا، علاوہ اس کے انہیں باہر سے بھی کسی قسم کی مدد ملنے کی توقع نہ تھی بلکہ مخالفت و مزاحمت کا اندیشہ تھا، اسلیئے انکی مشکلات اور بھی شدید تھیں کیونکہ کوئی ملک اپنے ہمسایہ ملکوں سے قطع علائق کرکے اقتصادی فلاح حاصل نہیں کرسکتا۔ لہذا ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان سب مشکلات پر بولشویکوں نے کیونکر غلبہ حاصل کیا، اور وہ کیا طریقے تھے جنہیں اختیار کرکے انہوں نے اپنے نرالے اصول کے مطابق انقلابی روس کی تعمیر و تنظیم کی۔

اسکے لیئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان حالات پر ایک نظر ڈالی جائے جو انقلابات کے دوران میں پیش آئے

اس سے قارئین کرام کو معلوم ہو جائیگا کہ کس طرح ایک جماعتی کشمکش کے بعد سوویٹ طرز حکومت نے روس میں مضبوط بنیاد حاصل کر لی۔

مئی کے نگار میں بتایا جا چکا ہے کہ مارچ اور نومبر ۱۹۱۷ء کے درمیانی عہد میں جو پے در پے انقلاب برپا ہوئے اُن سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی تھی کہ روس میں سوویٹ اور مجلس انتظامیہ دونوں ایک ساتھ قائم نہیں رہ سکتے، یعنی ان دونوں میں سے ایک کو بالادستی حاصل ہونی ضروری تھی۔ یہ بھی اوپر لکھا جا چکا ہے کہ کرنسکی کی آخری تجویز یہ تھی کہ ایک عام انتخاب کے ذریعہ سے اہل ملک کے نمایندوں کی ایک مجلس قائم کی جائے اور اسکے فیصلہ پر روس کے آیندہ طرز حکومت اور انتظامی مشین کی ترکیب کا انحصار ہو۔ چنانچہ ۲۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو عام انتخاب ہوا جسمیں ارتجاعی تحریک کے کارکنوں نے بولشویکوں کو شکست دینے کی سخت کوشش کی اور آخر کار ایک حد تک اکثریت حاصل کر لی، مجلس میں بولشویکوں اور اشتراکیت پسندوں کو صرف ۳۰ فی صدی نمایندگی حاصل ہوئی جو ظاہر ہے کہ بہت کم تھی اس کا مقابلہ کرنے کے لیئے بولشویکوں نے ایک اعلان میں اپنے تعمیری پروگرام کی تفصیلات مرتب کیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک متحدہ بین الجماعتی کنونشن قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی جسے ان کے نزدیک تمام پارٹیوں کی تائید حاصل ہو سکتی تھی۔ مگر اس اعلان کو مجلس نے ارتجاعی اکثریت کے ساتھ رد کر دیا۔ جس پر اشتراکی جماعت نے ایوان مجلس کو خالی کر دیا، اور صرف مخالف پارٹی اپنا کام کرنے کے لیئے رہ گئی۔

مگر یہ مخالف جماعت اکثر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی قوت سے محروم تھی، اسکی اکثریت محض اس پروپیگنڈا کا نتیجہ تھی جو کرنسکی کے عہد اقتدار میں طبقۂ امرا کے متوسلوں، اور طبقۂ مزارعین کے مرفہ الحال افراد نے آزادی کے ساتھ نہایت بڑے پیمانہ پر کیا تھا۔ اس سے انکو مجلس میں نمایندگی تو اکثریت کے ساتھ حاصل ہو گئی مگر بری و بحری فوج کے ان سپاہیوں کی تائید حاصل نہ ہو سکی جو اپنے افسروں کی نافرمانی کر کے بالشویکوں کی اطاعت پر کمربستہ تھے اور نہ ان مسلح مزدوروں اور کسانوں کی ہمدردی حاصل ہو سکی جو دل و جان سے بولشویک مقاصد کے مؤید ہو چکے تھے، پس انکی آئینی قوت بولشویکوں کی عملی قوت کے مقابلہ میں غلبہ نہ حاصل کر سکی۔ عوام نے مجلس کو برملا برا بھلا کہا، عام طور پر اسے سرمایہ داروں اور خوشحال طبقہ کا آلۂ کار قرار دیا گیا۔ تمام اقصائے روس سے بولشویک پروگرام کی تائید میں صدائے احتجاج بلند ہوئیں اور مجلس خود بخود منتشر ہو گئی، بولشویکوں کا نظام پہلے ہی مکمل تھا، ہر تعلقہ میں مقامی سوویٹ کونسل قائم تھی جسمیں کسانوں، مزدوروں اور عوام کے نمایندے شریک تھے، ان مقامی کونسلوں کا تعلق ضلع کی سوویٹ کونسل سے تھا، اضلاع کی کونسلیں، صوبوں کی کونسلوں سے متعلق تھیں اور یہ سب تمام روس کی متحدہ سوویٹ کونسل کی تابع

فرمان معین جس کے انتظامی امور سوویٹ کمشنروں کی مرکزی مجلس انتظامیہ سے متعلق تھے، اس نظام نے مذکورۂ بالا مجلس کے منتشر ہو جانے کے بعد آئینی تفوق حاصل کرتے ہی کاروبار مملکت کا چارج لے لیا۔ اور بولشویک آئین کے مطابق ملک کی تنظیم شروع کر دی۔

بولشویک آئین کی پہلی شرط اقتصادی انقلاب پیدا کرنے کی متقاضی تھی، اشتراکیت کا بنیادی اصول جس پر اس نئی بولشویک جمہوریت کی تعمیر کی گئی تھی، ملک کے اقتصادی ذرائع کو اشخاص و افراد کے قبضہ سے نکال کر پوری قوم کی ملک بنا دینا تھا، اس اصول کے مطابق تمام ذاتی ملکیت کے حقوق کو مٹا کر زمین، مکان، کارخانہ، بنک، بیوپار اور اس قسم کے تمام دوسرے اقتصادی ذرائع کو قوم کی ملکیت میں لے لینا، اور ان کا انتظام قوم کی نمایندہ حکومت کے سپرد کر دینا ضروری تھا، جسے دوسرے الفاظ میں اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ جو نیا اقتصادی نظام روس میں قائم کیا جانے والا تھا اسکی رو سے ایک کارخانہ کا مالک، ایک قطعۂ زمین کا زمیندار، ایک تجارتی کوٹھی کا صاحب تجارت اور ایک عمارت کا مکاندار مجبور تھا کہ اپنی ملکیت کو قومی ملکیت سمجھے اور آیندہ سے اپنے لیئے محض ایک تنخواہ دار ناظم کی حیثیت قبول کرے جسے اپنے کام کے مطابق معاوضہ پر قناعت کرنا اور ہر قسم کے منافع سے بے غرض رہنا چاہیئے۔

چنانچہ بولشویکوں نے اقتدار حاصل کرتے ہی اس قسم کے احکام جاری کر دیئے اور ان کے مطابق مزدوروں نے اب انھی لوگوں سے جن کے سامنے وہ کسی زمانہ میں اپنی قلیل اجرتوں کے لیئے ہاتھ پھیلاتے تھے، انکی جائدادوں اور کارخانوں کی کنجیاں طلب کرنی شروع کر دیں۔

ظاہر ہے کہ اتنا عظیم الشان اصولی انقلاب خاموشی کے ساتھ برپا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کو جو ارباب املاک تھے، قدرتی طور پر یہ بات شاق گزرنی چاہیئے تھی، کہ اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو کر خود اپنی ملکیتوں پر محض تنخواہ دار کی حیثیت قبول کر لیں۔ ان کی مزاحمت ایک فطری اقتضا کا نتیجہ تھی۔ عام ضبطی کا حکم نافذ ہوتے ہی تعلیم یافتہ طبقۂ متوسط نے جس کے ہاتھ میں تمام نظامات اقتصادی تھے، ایک متفقہ ہڑتال کر دی اور ایک ہی وقت میں کارخانے، رفاہ عام کے محکمے، ہسپتال، سامان خورد و نوش کے ذخائر، اور ریلوے وغیرہ کے کام بالکل بند ہو گئے۔ بولشویکوں نے اس کے جواب میں فوجی قوت سے کام لیا اور جبراً تمام بنکوں اور کارخانوں کا قبضہ حاصل کر کے اہل قلم کو ناگزیر ضروریات زندگی کی تکلیفیں دیں جنسے وہ کچھ عرصہ بعد کام پر آنے کے لیئے مجبور ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بولشویکوں نے اپنے اصول کو جبراً نافذ کرنے کے لیئے انتہائی سختی سے کام لیا، ہڑتالیوں کا دانہ پانی بند کر دیا گیا، ان کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر کے انھیں اہم ترین ضروریات زندگی کے سامان سے محروم کر دیا گیا اور جب اسپر بھی وہ نہ مانے تو قید کر کے اتنی تکلیفیں پہنچائی

گئیں کہ آخر کار انھیں کام پر جانا پڑا۔ تاہم انھوں نے اول اول تعلیم یافتہ طبقہ کے ان لوگوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جو کسی اقتصادی نظام سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، اور کراسنوف، کرلنکی وغیرہ کی کارروائیوں کے زمانہ میں بھی یہ لوگ بالکل آزاد رہے۔

مگر اس عام سختی کا ردعمل بھی لازمی امر تھا۔ اسلئے جب جرمن فوجوں نے پیٹروگراڈ کی طرف فاتحانہ پیشقدمی کی، اور سرخ فوجیں ان کے سامنے بٹھیہ موڑ کر بے تکلف بھاگنے لگیں تو ان لوگوں نے جو اپنے حقوق سے جبراً محروم کئے گئے تھے بولشویکوں سے بدلہ لینا چاہا اور جرمنوں سے مل کر مفتوحہ علاقوں اور سرحدی مقامات پر سوویٹ طرز حکومت اور اسکے حامیوں کا نام ونشان مٹا دیا۔ پھر جب اسی طرح یوکرین اور بالٹک کے کھوئے ہوئے صوبوں میں بولشویک طبقہ کو سخت سزائیں دی گئیں، دوسری طرف جب نئی اشتراکی جمہوریت نے اپنی حیات کو بچانے کے لیئے برسٹ لٹوسک کے ذلیل ترین صلحنامے کو قبول کر لیا تو اشتراکی انقلابیوں کا ایک طبقہ سوویٹ کمشنروں سے بدظن ہوگیا اور اس نے بولشویک حکومت کو سرمایہ داری کی اطاعت کا مجرم قرار دیکر اسکی سخت مخالفت شروع کردی۔ ایک من چلے انقلابی نے جدید جمہوریت کی منزل لانے کے لیئے ماسکو میں جرمن سفیر کو قتل کر دیا۔ ایک اور غضبناک جماعت نے سوویٹ کمشنروں پر حملہ کیا، وولارڈار اسکی ریوالور کی مار سے گئے اور لینن سخت زخمی ہوا، اور بہت سے مقامات پر بھی اسی قسم کی انقلابی تحریکات کی گئیں جنسے جدید جمہوریت کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ اس حالت کا مقابلہ کرنے کے لیئے بولشویکوں کی مرکزی مجلس انتظامیہ نے ایک غیر معمولی کمیشن بٹھایا جسنے تحقیقات کرکے فیصلہ کیا کہ اس جوابی انقلاب کی تحریک کو عام سختی کے ساتھ کچل دیا جائے، چنانچہ تمام آئینیت بلکہ انسانیت کے بنیادی اصولوں کو خیرباد کہدیا گیا اور ساری مملکت روس ایک ہولناک خانہ جنگی اور عام قتل و غارت سے پامال ہوگئی۔ بولشویک جماعت نسبتہً طاقتور تھی اور ملک کی اعلیٰ قوت۔ فوج اور مزدوری پیشہ عوام۔ اسکی حمایت پر تھی۔ اسلیئے کچھ مدت میں مخالف عناصر کہیں نیست و نابود ہوگئے اور کہیں سختی کے ساتھ دبا دیئے گئے مگر اس بدامنی و طوائف الملوکی نے روس کی اقتصادی و اخلاقی تباہی کو کمال کے آخری نقطہ تک پہونچا دیا۔ ریلیں بند، سڑکیں مسدود، کارخانے بیکار، آئے دن کے قتل و غارت کی بدولت امن و امان مفقود اور مناسب فضا نہ ہونے کے باعث سارے کاروبار ماند ہوگئے۔ ڈھائی تین برس کی طویل بیرونی جنگ نے جس کام کو شروع کیا تھا وہ چند مہینوں کے اندرونی فساد کی بدولت پوری طرح انجام کو پہونچ گیا اور جب اسکے لیئے تمام مخالف قوموں کو مٹانے کے بعد ۱۹۱۸ء میں بولشویکوں نے اپنے لیئے روس کی ملکیت غیر مسئولہ حاصل کی تو اسوقت یہ ملک زندہ رہنے کی تمام صلاحیتوں کو کھو چکا تھا، اور حال یہ تھا کہ ایک طرف اس کے اندرونی ذرائع کلیتہً بیکار ہوچکے تھے دوسری طرف بولشویک اصولوں کی بدولت ہمسایہ ممالک سے کسی قسم کے تجارتی و سیاسی

تعلقات باقی نہیں رہے تھے، اور تیسری طرف شمالی روس کا صنعتی علاقہ جنوبی و مشرقی روس کے پیداواری علاقہ کی مدد سے محروم ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں بالشیوکی حکومت کیا کر سکتی تھی اور ان تباہیوں کی تلافی آسان نہ تھی علی الخصوص اسوقت جب کہ تباہ شدہ زراعتی علاقہ کو اپنی اصلی حالت پر لانے کے لیئے روپیہ کی ضرورت تھی، صنعتی کاروبار چلانے کے لیئے مشینیں درکار تھیں (اور یہ ان دونوں سے محروم تھے) تاہم انہوں نے اسی طرف اپنی توجہ کو مبذول کیا۔ اور رفتہ رفتہ کارخانے بھی قائم کیئے سرمایہ بھی بہم پہونچایا۔ چونکہ ذرائع آمدنی کے مقابلہ میں مصارف زیادہ تھے، انقلاب کے اثرات مابعد کا سخت مقابلہ کرنا تھا، اسلیئے جو کچھ بھی وہ کر رہے تھے، بہت کم تھا۔ اور غذا کے فقدان نے عام اضطراب پیدا کر دیا تھا۔

بالشیوکوں کا مقصود ابتدا ہی سے یہ تھا کہ اشتراکیت کے اصول مساوات کو قائم کیا جائے اور چونکہ اسوقت غذا کی ضرورت ملک کو نہایت شدید تھی اسلیئے سب سے پہلے انہوں نے اسی پر تجربہ کرنا شروع کیا اور ایک عام اعلان کے ذریعہ سے غلہ کی تجارت اپنے ہات میں لیکر ہر شخص کی ضرورت اور محنت کے لحاظ سے ٹکٹ شایع کیئے جس سے مقصود یہ تھا کہ صرف اسی شخص کو غلہ مل سکیگا، جس کے پاس ٹکٹ ہوگا اور ٹکٹ اسی کو ملیگا جس نے کوئی محنت کی ہوگی۔ کوئی کام کیا ہوگا۔

یہ ایک ایسی نئی بات تھی جس سے نہ سرمایہ دار خوش ہو سکتے تھے اور نہ مزارعین، کیونکہ اس طرح نہ وہ غلہ کی تجارت کر سکتے تھے اور نہ یہ اپنی پیداوار کو جمع۔ البتہ مزدوری پیشہ لوگ اور عوام ضرور خوش تھے۔ مگر ان کی خوشی بیکار تھی کیونکہ اصل کام تو مزارعین سے تھا یا ان لوگوں سے جن سے روپیہ ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔

چونکہ اسوقت حکومت کے پاس آلات، خام پیداوار صناعت وغیرہ کی صورت میں بھی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اور غیر ملکوں نے اپنے ہاں کی مصنوعات سے روس کو محروم کر رکھا تھا، اسلیئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ان چیزوں کے عوض میں لوگوں سے غلہ حاصل کیا جائے۔ الغرض عجیب کشمکش تھی اور لوگوں کو روٹی کا ملنا دشوار ہو گیا تھا، بالشیوکی حکومت غلہ کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیئے اس غرض سے بھی بیتاب تھی کہ وہ اپنی سرخ افواج کا آذوقہ اسی طرح فراہم کر سکتی تھی اور سرخ افواج کا قیام ضروری تھا۔ ہر چند تمام مملکت روس میں تو یہ انتظام دشوار تھا، لیکن اپنے حدود کے اندر اسنے کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کی اور اسطرح اشتراکیت کے اصول کا سب سے پہلا منظر اس طرح رونما ہوا۔

جو کچھ غذا میسر آتی تھی وہ برابر نہیں تو انصاف سے ضرور تقسیم ہوتی تھی، بچہ کا حق سب پر مرجح سمجھا جاتا تھا۔ اور دوا یہ ہے درنو کو دودھ تقسیم کیا جاتا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا گیا کہ اشتراکی اصول کا پروپیگنڈا کیا جائے، چنانچہ مدارس، سنیما، اشتہارات، کتب، اخبارات و نقوش کے ذریعہ سے اسکی تبلیغ ہونے لگی۔

ریلوں کی حالت زار کے زمانہ میں بھی خراب تھی، اور کرنسکی کے عہد میں وہ زیادہ ابتر ہوگئی۔ اسلیئے بالشویک حکومت کے ہات میں جو ریلیں آئیں وہ بالکل تباہ حالت میں تھیں اور کوئی اصول و نظام ان کا مقرر نہ تھا۔ سڑکیں خراب تھیں، پُل اور اسٹیشن مخالفین کے ہاتھوں تباہ و مسمار ہو چکے تھے اور ان سے کوئی کام نہ لیا جا سکتا تھا۔

سوویٹ حکومت نے اس طرف بھی توجہ کی اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر کام یہ کیا کہ تمام اشتراکی افراد نے خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق ہوں، سنیچر کا دن اسلیئے وقف کر دیا۔ کہ وہ ماہرین فن کے زیر ہدایت ریلوں، سڑکوں، پلوں کی مرمت کریں۔ اسمیں بہت سے غیر اشتراکی افراد بھی شامل ہوگئے اور جب ۱۹۲۰ء میں جنگ کا اختتام ہوا تو سرخ افواج بھی اسی کام پر لگادی گئیں۔ اسمیں کلام نہیں کہ یہ تدبیر ایسی تھی کہ گزشتہ نقصانات کی تلافی نہایت آسانی سے اور جلد ہو جاتی لیکن بدقسمتی سے ایک طرف پولینڈ کی جنگ اور رینگل کے اقدامات اسمیں حارج ہوئے اور دوسری طرف فصل کی خرابی حائل ہوگئی۔

اسمیں شک نہیں کہ اگر کوئی دوسری سرمایہ دار حکومت ان مشکلات میں ایک ہفتہ کے لیئے بھی مبتلا ہو جاتی تو اس کا سارا نظام پارہ پارہ ہو جاتا، لیکن سوویٹ حکومت کی تاریخ کا یہ حیرت ناک واقعہ ہے کہ باوجودیکہ اس نے ان مصائب کو برسوں تک برداشت کیا، لیکن وہ نہ صرف اپنی جگہ پر قائم رہی بلکہ اسنے رفتہ رفتہ اپنی حالت کو اسقدر درست کر لیا کہ آج مشکل سے ہمیں یقین آتا ہے کہ کبھی وہ اسقدر خوار و ذلیل رہی ہوگی۔

اس کامیابی کا حقیقی راز سوائے اسکے کچھ نہ تھا کہ اصولاً وہ ایسے خیال کے حامی تھی، جس کی اعانت کے لیئے فطرت بھی تیار ہو جاتی ہے۔ سوویٹ حکومت کا نصب العین صرف یہ تھا کہ وہ عوام میں بیداری پیدا کر دے اور معمولی سا معمولی انسان بھی اپنی جگہ یہ سمجھنے لگے کہ حکومت میں اس کا حصہ ہے اور حصہ دار ہونے کی حیثیت سے اسپر کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ طبقۂ عوام کی اقتصادی حالت خراب ہوتی ہے اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ روس میں جہاں اسکو ایک جانور سے زائد کبھی نہیں سمجھا گیا۔ اسلیئے اسکی حمایت آسان نہ تھی اور تمام سرمایہ دار جماعتوں اور ملکوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے حد درجہ اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی، اسلیئے انہوں نے اپنی مخاطبت کو عام کر دیا اور امیر و فقیر، سرمایہ دار و مزدور زمیندار و مزارع سب کو دعوت دی کہ وہ حکومت کو آکر سنبھالیں اور بہ حیثیت ایک روسی باشندہ ہونے کے اپنے ملک کی سقیم حالت کی طرف توجہ کریں۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ روس میں سوائے زراعت کے کسی اور صنعت یا حرفت کا وجود نہ تھا اور اسلیئے وہ اپنی تمام ضروریات زندگی فراہم کرنے، اسباب تمدن و تہذیب حاصل کرنے میں دوسرے ممالک کا محتاج تھا، لیکن بالشویکی حکومت

نے اس فقدان کو بہت زیادہ محسوس کیا، کیونکہ اس کے کارکن وہمدرد سب کے سب نہایت ہی معمولی طبقہ کے تھے اور وہ نہیں سراسر جاہل ہی جاہل نظر آتے تھے، مگر اس نے انہیں لوگوں سے کام لینے کو مناسب سمجھا، کیونکہ ماہرین فنون کا تعلق ایسے طبقہ سے تھا جس پر اعتماد نہیں ہوسکتا تھا اور جسکی طرف سے ہر وقت اندیشہ تھا کہ خدا جانے کب وہ مخالف ہوکر حکومت کو نقصان پہونچادیں۔ اسلیئے سب سے پہلے بالشویک حکومت نے عوام کی جماعت میں ایک نظام پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک مرکزیت قائم کرکے اس سے وابستہ کردیا۔

اس کے بعد انہیں کے ذریعہ سے اطراف ملک میں اشتراکیت کے خیال کو منتشر کرنا شروع کیا۔ اور اسی کے ساتھ مخصوص جماعتیں انھیں میں سے ایسی مرتب کی گئیں جو خطرہ اور ضرورت کے وقت عسکری خدمات بھی انجام دے سکیں اور یہی وہ جماعتیں تھیں جنہوں نے پری کوپ کے ناقابل تسخیر مقام پر حملہ کرکے رینگل کے تمام اقدامات کو بیکار کردیا۔

اسی طرح ہر ایسے کارخانہ یا صنعتی کاروبار میں جہاں آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی انہیں جماعتوں کو بھیجدیا جاتا تھا اور وہ انتہائے صداقت وخلوص کے ساتھ کام کرتی تھیں جب غذا کی کمی ہوتی تھی تو بھی انہیں جماعتوں کے افراد قصبات ودیہات میں بھیجدیئے جاتے تھے جو وہاں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے اور کامیاب واپس آتے تھے۔

الغرض یہ اشتراکی جماعتیں بالشویکی حکومت کی روح تھیں اور کارخانوں میں دفاتر میں، فوج اور پولیس میں، جاسوسی کے خدمات میں ہر جگہ انہیں سے کام لیا جاتا تھا،

اس انقلاب کا بدترین رُخ جو ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے، وہاں کا قحط ہے کہ ہزاروں لاکھوں نفوس فنا ہوگئے، لیکن تم تاریخ اٹھاکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دنیا کا کوئی عظیم الشان انقلاب ایسا نہیں ہے جسمیں مصائب رونما نہ ہوئے ہوں کیونکہ یہ ردّعمل کا لازمی نتیجہ ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باوجود اسقدر شدید مخالفتوں کے کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جو اس تحریک کا دشمن نہ ہو، بالشویک جماعت نے کیسی کامیابی حاصل کی، اور آج کرۂ ارض کے کتنے باشندے اس تحریک کے حامی ہیں۔ جرمنی کا انقلاب، اطالیہ کا اضطراب، یونان کے تخت استبداد کا الٹ دیا جانا، انگلستان میں حکومت عمال کا برسر اقتدار ہونا اور ترکی میں جمہوریت کا قیام یہ سب نتائج ہیں اسی روس انقلاب کے، ایک سیل تھا، جو سرزمین ماسکو سے بلند ہوا اور جہاں جہاں اسکی امواج پہونچیں، لوگوں کے افکار وأذہان میں ہنگامۂ انقلاب برپا کرگئیں۔

کہا جاتا تھا کہ بالشویک تحریک ناقابل عمل ہے، لیکن آج اسی ناقابل عمل تحریک کے علمبرداروں سے مساوات کے معاہدے ہوتے ہیں، کانفرنسوں میں ان سے شرکت کی درخواست کی جاتی ہے اور دنیا کا کوئی معاہدہ اسوقت تک مستحکم نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب تک ان کی رضامندی یا شرکت حاصل نہ کرلی جائے۔ یہ یقینی ہے کہ بالشویک حکومت نے اپنے

اصول نظام میں کچھ تبدیلی پیدا کی ہے، لیکن وہ تبدیلی بھی اس درجہ سے نہیں آئی، جس تک پہونچنے کی امید دل میں پیدا نہیں کر سکتے اور جس کے ایک جلوۂ گریز پا کا نظارہ بھی ہماری نجات کے لیئے کافی ہے۔

غزل

جگر کو دیکھیے کب تک میسر ہو جگر ہونا ۔۔۔ کہ اسکو خون ہونا ہے ابھی پھر اشک تر ہونا

کبھی اُسکی نگاہ شرمگیں اُٹھتے نہیں دیکھی ۔۔۔ سکھایا کس نے یارب آسمان کو فتنہ گر ہونا

کہا سب نے مرا افسانہ چاکِ جیبِ داماں سے ۔۔۔ ستم ہے پردہ پوشوں کا الٰہی پردہ در ہونا

سنبھل کر غش سے اک وارفتہ پھر محو تماشا ہے ۔۔۔ ذرا اے حسن پھر رونق فزائے بام و در ہونا

اُدھر شوق آفرینی اُس نگاہ ناز پرور کی ۔۔۔ ادھر انجام ہے اک سادہ دل کا بے خبر ہونا

کوئی آیا ہے پھر دل میں ہزاروں حسرتیں لیکر ۔۔۔ ذرا پھر برق خرمن سوز منکر جلوہ گر ہونا

نسیم عنبر افشاں اسطرف رحمت نہ فرمائے ۔۔۔ کہ اک افسردہ کا اچھا نہیں افسردہ تر ہونا

مجھے اے عندلیب نوحہ گر تو دیکھتی کیا ہے ۔۔۔ بڑی مدت میں سیکھا ہے فغاں کا کارگر ہونا

یہ وہ دریا ہے جس کا قطرہ قطرہ رشکِ طوفاں ہے ۔۔۔ خدارا تم نہ ہمت آزمائے چشم تر ہونا

اگر اس پردۂ قدرت میں کوئی سننے والا ہے
تو وحشی اک قیامت ہے دعا کا بے اثر ہونا

وحشی شاہجہانپوری

گہوارۂ تمدن

مولینا نیاز کی وہ مشہور تصنیف جسمیں ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن جنس لطیف کا کسقدر ممنون ہے، اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

قیمت عگار

منیجر نگار بھوپال

میاں نظام شاہ رامپوری

فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم اور خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر نواب کا عہد بھی رامپور کی تاریخ میں ہمیشہ احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ جب ہندوستان کے اصحاب ذوق و ارباب کمال کھنچ کھنچ کر بارگاہ حکومت میں جمع ہو رہے تھے اور ایوان شاہی ہر وقت انہیں سے معمور نظر آرہا تھا۔

مغلیہ بزم کی آخری شمع گل ہو چکی تھی اور اس کے پروانے ادہر ادہر منتشر ہو چکے تھے کہ افق مصطفیٰ آباد میں روشنی کی جھلک نظر آئی اور ان سب نے اسی طرف کا رخ کر دیا ہر چند برہمی "رنگ محفل" کی داستان سے ابھی تک قلب مجروح اور لب خونچکاں تھے، لیکن دربار رام پور کی قدر شناسیاں و نکتہ نوازیاں حقیقتاً مرہم کافور تھیں کہ چند دن میں تمام زخم بھر گئے اور بھولی ہوئی نغمہ سنجیاں پھر یاد آگئیں۔

چنانچہ اسی عہد کے شعراء میں سے ایک میاں نظام شاہ بھی تھے جن کے نام سے اسوقت بھی شاید بہت سے لوگ نا آشنا ہوں گے، لیکن ان کا یہ شعر:- انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو مجھکو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ یقیناً ہر شخص نے سنا ہوگا اور اس سے کافی لطف اٹھایا ہوگا۔

ان کے والد احمد شاہ گو عمائدین ریاست میں سے نہ تھے لیکن ان کا شمار شرفائے شہر میں سے ضرور تھا اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ میاں نظام شاہ کا سلسلۂ نسب کیا ہے، اس کا حال تو اب معلوم ہونا دشوار ہے لیکن خود ان کے کلام سے کچھ روشنی اسپر ضرور پڑتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

دولت فقر ہے آل شہ جیلاں ہوں نظام اسکی پروا ہے کسے ہات میں زر ہو کہ نہ ہو

ان کی ابتدائی تعلیم کے متعلق صرف اسقدر معلوم ہوتا ہے کہ عربی فارسی کی ضروری تعلیم جو عام طور پر شرفاء کے ہاں رائج تھی، انھوں نے بھی حاصل کی، اور چونکہ فطرت کی طرف سے طبع موزوں لے کر آئے تھے، اس لیئے جب ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے چاروں طرف شعر و شاعری کا چرچہ دیکھا، تو یہ بھی اس طرف مائل ہو گئے اور سب سے پہلے شیخ علی بخش بیمار کے سامنے (جو مومن کے مشہور شاگرد تھے) زانوئے ادب تہ کیا، بیمار نہ صرف خوشگوار اور پرسوز شاعر تھے بلکہ ان کے کلام میں ایسا زور تھا جو بہت کم نظر آتا ہے، ان کی ایک غزل کا مطلع ہے:-

کون پرساں ہے حال بسمل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

میرے نزدیک بیمار کا یہ شعر اُن اشعار میں سے ہے جو داد سے مستغنی ہے، اور جن کی کیفیت کا بیان الفاظ سے ناممکن ہے، اس غزل کا مقطع ہے:-

سانس آہستہ لیجیئو بیمار ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میاں نظام شاہ نے کب تک بیمار سے استفادہ کیا، لیکن ہمارے نزدیک یہ مدت زیادہ طویل نہ رہی ہوگی، کیونکہ میاں نظام شاہ کا رنگ طبیعت ذرا اُن سے مختلف تھا اور یقیناً استاد و شاگرد ایک دوسرے سے جلد بیزار ہوگئے ہونگے۔

اسمیں شک نہیں کہ میاں نظام شاہ فطرتاً آزاد و رند منش انسان تھے، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ طبیعت میں ایک کیفیت بھی موجود تھی، اسلیئے اُن کی روح کسی ایسی ہستی کے لیئے بیتاب تھی جو مطلوب معنوی تک پہونچادے اور آخر کار انکی یہ جستجو انہیں میاں احمد علی شاہ صاحب کے آستانے تک لے گئی جو اسوقت رام پور کے نہایت مشہور بزرگ تھے اور جن کے کمال کا ہر چہار طرف شہرہ تھا۔

جب فطرت میں جوہر قابل موجود ہوتا ہے تو کسی کی صرف ایک نگاہ وہ کام کرجاتی ہے کہ دوسروں کو برسوں کی محنت و ریاضت سے بھی میسر نہیں آتا، اسلیئے جب میاں نظام شاہ حاضر خدمت ہوئے تو میاں احمد علی شاہ نے ان کو دیکھا، اور اولین نگاہ میں ان پر ایک ہلکی سی کیفیت جذب کی پیدا کردی، جو آخر وقت تک قائم رہی۔ چونکہ میاں احمد علی شاہ خود بھی شعر کہتے تھے اسلیئے اس فن میں بھی ان سے بیعت حاصل کی، اور رات دن وہیں آپ کی خدمت میں رہنے لگے

یہ زمانہ نواب محمد یوسف علیخاں بہادر کا تھا جو ناظم تخلص کرتے تھے اور فن شعر کے بے مثل نقاد تھے، خود ان کا کلام جس پایہ کا ہوتا تھا وہ ان کی اس غزل سے ظاہر ہے جس کا یہ مطلع ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو چکا ہے۔

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کسقدر غلط

جب میاں نظام شاہ کی شاعری کی خبر شہر میں عام ہوئی تو نواب نے انہیں بلایا اور منصب مقرر کرکے شعرائے دربار کے سلسلہ سے وابستہ کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ میاں نظام شاہ نے اسکے بعد خود نواب سے بھی فن شعر حاصل کیا، ایسا ہونا بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ ناظم کو نظام ایسا شاگرد اور نظام کو ناظم ایسا استاد کہاں میسر آسکتا تھا۔

میاں نظام شاہ دُبلے، پتلے، گورے رنگ کے خوش رو آدمی تھے اور شریعت ظاہری کے زیادہ پابند نہ تھے، ساری عمر تجرد میں بسر کی اور قلیل معاش پر نہایت صبر و توکل سے زندگی گزار دی، آپ کی ولادت ۱۲۳۵ھ میں ہوئی، بچاس برس کی عمر میں وہیں وفات پائی (۱۲۸۹ھ) اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ کے پائین میں اب بھی آلودۂ خاک ہیں۔

ہرچند میاں نظام شاہ کی ساری عمر شعر گوئی میں صرف ہوئی، لیکن چونکہ طبیعت لا اُبالی تھی اسلئے نہ کہیں مسودہ رکھا اور نہ دیوان مرتب کرنے کا خیال کبھی پیدا ہوا۔ ۱۳۱۷ھ میں منشی قدرت علی خاں قدرت رام پوری نے آپ کا کلام مرتب کرکے شایع کیا، لیکن اسمیں شک نہیں کہ میاں نظام شاہ کا بہترین کلام اسمیں نظر نہیں آتا اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کب کیونکر اور کس کے تصرف میں آگیا۔

یہ دیوان (جسکی ایک جلد اتفاق سے مجھے رام پور میں مل گئی) ۲۷۶ صفحات کا ہے، لیکن مشکل سے ۱۰۰ شعر ایسے نظر آتے ہیں جنہیں نگاہ انتخاب پسند کرسکے، میں اسکو بھی میاں نظام شاہ کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ سے جو انکے نزدیک بالکل بیکار و قلمزد کلام کا مجموعہ ہے اتنے اشعار نکل سکے، منشی امیر احمد مینائی نے اپنے تذکرہ یادگار انتخاب میں لکھا ہے کہ نواب یوسف علی خاں بہادر نے مسودات جمع کرکے ان کا دیوان مرتب فرمایا تھا، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دیوان طبع بھی ہوا یا نہیں، لیکن اگر طبع بھی ہوا تو اب اس کا ملنا دشوار ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ دیوان سے وہ کسقدر ممتاز تھا۔

میاں نظام شاہ کے رنگ کے متعلق عام طور پر یہی مشہور ہے کہ وہ "ادا بندی" کے بڑے مشاق تھے، چنانچہ وہ خود بھی ایک جگہ لکھتے ہیں:-

حالیہ شعر سکے مرے کہتے ہیں نظام ۔۔۔ اب فن شاعری میں مجھے بھی کمال ہے

حالیہ شاعری سے ان کی مراد غالباً معاملہ بندی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ ان پر یہی رنگ غالب تھا۔ وصل و ہجر کی کیفیات، معشوق کا اداؤں کا بیان، محبوب کی کج ادائیاں، اغیار کے ساتھ اسکی وفاداریاں وغیرہ یہ وہ مباحث ہیں جنپر عام طور سے معاملہ بندی کے تحت میں خامہ فرسائی کی جاتی ہے اور ان کے ہاں بھی یہ بکثرت نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیئے انہیں سوز و جرأت کا مقلد کہا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک مصوری کے لحاظ سے یہ بعض مقامات پر جرأت سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور جذبات نگاری کی حیثیت سے تو خیر ان کا مرتبہ اسقدر بلند ہے کہ وہاں تک جرأت کا خیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔

معاملہ بند شعراء کے ہاں سب سے زیادہ عریاں مضامین "وصل و متعلقات وصل" کے ہوا کرتے ہیں۔ اور میاں نظام شاہ نے بھی بعض جگہ بہت عریانی سے کام لیا ہے مثلاً:-

ایسے کو شب وصل لگائے کوئی کیا ہاتھ ۔۔۔ ہر بار جھٹک کر جو کہے ٹوٹے ترا ہاتھ

اس دستِ نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا ۔۔۔ کس ناز سے کہنے لگے اُف چھوڑ گیا ہاتھ

لیکن اس نوع کے اشعار ان کے ہاں اسقدر کم ہیں کہ مشکل سے سارے دیوان میں ۳۰-۴۰ سے زیادہ مل سکیں گے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ رنگ بھی ایک حد تک پایۂ تہذیب سے گرا ہوا ہے اور ذوق سلیم پر ایسے اشعار کا سننا بار ہوتا ہے، لیکن

نہ اسقدر کہ اُسے صنعت (آرٹ) کے حدود سے علیحدہ سمجھا جائے۔ مگر جن شعراء کو اس طرف غلو ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ "مبتذل نگاری" پر اتر آتے ہیں اور ان کا شعار صرف بیہودہ گوئی ہو جاتا ہے۔ جرأت کے ہاں ایسی مثالیں بہت ملیں گی، لیکن نظام کے ہاں شاید دو تین ہی شعر ایسے نظر آئیں گے۔ مثلاً:-

نظام آتی ہے اس منہ سے کیا دم بوسہ　　وہ کچھ تو پان کی بو اور کچھ شراب کی بو

میاں نظام کے ہاں عنصر غالب ان اشعار کا ہے جنہیں "ادا نگاری" اور "معاملہ بندی" کے تحت میں داخل کر سکتے ہیں، "ادا نگاری" سے میری مراد وہ اشعار ہیں جن میں معشوق کی مختلف اداؤں اور اسکی دلربا کیفیات کا ذکر کیا جائے مثلاً:-

بگڑ کر وہ اُس کا اُدھر دیکھنا　　ستم وہ بھی پھر اک نظر دیکھنا

وہ یوں مُسکرا کر نہ منہ پھیرتے　　نہ منظور ہوتا اگر دیکھنا

وہ جل جل کے رکنا کسی کا غضب　　وہ پھر پھر کے اپنی کمر دیکھنا

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ　　اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اس کا کہنا وہ شب وصل نظام　　ہات مجھ کو نہ لگائے کوئی

یا میاں نظام شاہ کی دوسری غزل کے یہ اشعار:-

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہات　　دیکھا جو مجھکو چھوڑ دیے مسکرا کے ہات

بیساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں　　کیا منہ پر اسنے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہات

وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے　　اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہات

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام　　منہ پھیر کر اُدھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہات

"معاملہ بندی" کے تحت میں وہ تمام اشعار آ سکتے ہیں جنہیں حسن و عشق کے تمام وہ واردات و معاملات، مقالات و مطایبات طنزیات و مضحکیات جن کا تعلق جذبات عالیہ سے نہیں ہے، نہایت سادگی سے بیان کر دیے جائیں، اور اسمیں انتہائے صنعت (آرٹ) یہ ہو کہ اُسوقت یا حالت کی تصویر یا کیفیت نگاہوں کے سامنے آ جائے، محاکات عام ہے جو ادا نگاری اور معاملہ بندی دونوں کو شامل ہے اور اسی کو حالیہ شاعری سے خود نظام نے تعبیر کیا ہے۔ اس قسم کے اشعار بھی نظام کے ہاں بہت ملتے ہیں اور بعض بعض تو اسقدر لطیف و پاکیزہ ہیں کہ ذوق سلیم وجد میں آ جاتا ہے مثلاً:-

خدا جانے مجھکو دکھائے گا کیا — یہ چھپ چھپ کے اپنا اُدھر دیکھنا

وہ ہائے بگڑ کے اُس کا جانا — رونا وہیں زار زار میرا

تمہیں یہ بھی کہیں خیال آیا — کہ کوئی راہ دیکھتا ہوگا

گو نہ کیا عرض تمنائے دل — منہ کو وہ لیکن مرے دیکھا کیا

یوں دیکھ کے مجھ کو مسکرانا! — پھر تم کو میں بے خبر کہونگا

مجھ کو سنا سنا کے وہ کہنا کسی کا ہائے — "جس سے کہ جی میں رنج ہو اس سے کلام کیا"

کبھی کچھ سنکے وہ کچھ آنکھ ملا کر کہنا — کبھی کچھ کہہ کے وہ کچھ آپ ہی شرما جانا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں — اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں آتا

کہہ "نظام، اب ترے کیا جی میں ہے کہدے مجھ سے" — ہائے پوچھے وہ کبھی مجھ سے یہ تنہا ہو کر

میں حالِ دل ان سے کہہ رہا ہوں — وہ کہتے ہیں "تجھ سے میں خفا ہوں"
اے جان کہو پھر اُس ادا سے — "میں آج نظام سے خفا ہوں"

عبث یہ ہر دم کا چونکنا ہے، عبث یہ اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا ہے — بھلا وہ ایسے ہوئے تھے کس دن، وہی تو وعدہ وفا کرینگے

یوں وہ اُٹھ جائیں سنبھالے ہوئے دامن اپنا
اور مرے ہات دوپٹہ کا نہ آنچل آئے

بدنام کون ہو گا اگر مر گیا نظام
یہ جانتے ہو کوئی اُسے جانتا نہیں؟

یوں تو روٹھے ہیں، مگر لوگوں سے
پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

معاملہ نگاری کے ساتھ جب صحیح جذبات شامل ہو جاتے ہیں تو شعر بہت بلند ہو جاتا ہے، چنانچہ انتخاب بالا میں آپ دیکھیں گے کہ بعض بعض اشعار کسقدر لطیف و پاکیزہ ہیں۔

محبوب کا جدا ہونا یوں تو ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ وقت جب اس کا جانا برہمی کے ساتھ ہو حد درجہ روح فرسا ہوا کرتا ہے۔ عاشق جو اسوقت نہ برہمی کی وجہ سمجھ سکتا ہے نہ اسکو دور کر سکتا ہے، سراسیمہ ہو کر دیوانہ سا ہو جاتا ہے اور آخر کار اسکے جذبات گریۂ بے اختیار کی صورت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ نظام ان تمام کیفیات کو اس شعر سے ظاہر کرتا ہے کہ:-

وہ ہائے بگڑ کے اُس کا جانا
رونا وہ میں زار زار میرا

اس شعر میں وہ ہیں اور زار زار سے شدت تاثر کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ کے انداز بیان سے محاکات کا رنگ پیدا ہے۔

جب کوئی صورت دل میں کھپ جاتی ہے تو اول اول انسان تکلف و حیا کے وجہ سے اپنے میلان خاطر کو چھپاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اُسے یا کسی اور کو حقیقت کی خبر نہ ہو، لیکن چونکہ دل کی مجبوریاں قوی ہوتی ہیں اسلیئے کسی نہ کسی طرح اسکو دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی تمنا پوری کرنی ہی پڑتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ تمام تکالیف و مصائب جو الفت کو مستلزم ہیں رونما ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ نظام اسی ابتدائی کیفیت اور اسی کے ساتھ انتہائی اندیشہ کو یوں ظاہر کرتا ہے کہ:-

خدا جانے مجھ کو دکھاسنے گا کیا
یہ چھپ چھپ کے میرا اُدھر دیکھنا

فن شعر میں وہ انداز بیان نہایت دلکش سمجھا جاتا ہے جسمیں کسی واقعہ کی درمیانی کڑیوں کا ذکر نہیں کیا جاتا، لیکن طرز ادا سے ذہن سامع از خود اس خلا کو پر کر کے مفہوم معلوم کر لیتا ہے۔ چنانچہ مومن کی شاعری اسی رنگ کی ہے

اور غالب کے ہاں بھی اسکی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ نظام کا یہ شعر

یوں دیکھ کے مجھ کو مسکرانا! پھر تم کو میں بے خبر کہوں گا

اسی قبیل کا ہے۔ شعر کے پڑھنے سے فوراً یہ بات ذہن میں آجاتی ہے کہ معشوق نے یہ ظاہر کیا تھا کہ "مجھے تمھارے حال کی خبر نہیں" درآنحالیکہ شعر میں اس کا اظہار کہیں نہیں گیا۔ اسی کے ساتھ شاعر نے اپنے حال کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا، لیکن "یوں دیکھ کے مجھکو مسکرانا!" ثابت کرتا ہے کہ میرا حال صرف خراب ہی نہیں ہے بلکہ محبوب بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے۔

حقیقتاً شعر اوانکاری کے تحت میں آنا چاہیئے، لیکن چونکہ اسمیں شاعر نے معشوق کی لگاوٹ ظاہر کرنے والی ادا کے ساتھ اپنی کیفیت کو بھی متعلق کر دیا ہے، اسلیئے میں معاملہ بندی کے ذیل میں اس کا شمار کرتا ہوں۔ اس قسم کے چوچلے شعرِ داغ کے ہاں عجیب وغریب رنگ کے نظر آتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

سنائی جاتی ہیں در پردہ گالیاں مجھکو کہوں جو میں تو کہیں "آپ سے کلام نہیں"

برہمی کا اظہار جب تک نہیں ہوتا، اسوقت تک وہ یقیناً نہایت تکلیف دہ چیز ہوتی، لیکن جب برہم ہونے والا یہ کہدے کہ "میں خفا ہوں" تو یہ غصہ لذت میں تبدیل ہوجاتا ہے، کیونکہ یہ برہمی کی آخری اور لطف وعنایت کی ابتدائی منزل ہوا کرتی ہے۔ نظام اس کیفیت کو کسقدر پُر لطف اور وجد آور انداز سے ظاہر کرتا ہے:-

اے جان کہو پھر اُس ادا سے "میں آج نظام سے خفا ہوں"

اس شعر میں لفظ نظام کے اظہار سے جو لطف پیدا ہوگیا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ کہنے والے کا مقصود یہی ہے کہ نظام اسکو سُنے، لیکن اُس سے مخاطب نہیں ہوتا اور اسکو ایک شخص غائب سمجھکر یوں کہتا ہے کہ "میں آج نظام سے خفا ہوں" یہ وہ خوش ادائی ہے اور اسمیں وہ عجیب وغریب لذت پنہاں ہے کہ اسکو صرف قلب محسوس کرسکتا ہے اور انسان کی وجدانی کیفیت غیر معمولی طور پر حرکت میں آجاتی ہے۔

پندرھویں شعر میں جس لطف کے ساتھ اپنے اور محبوب کے تعلقات کو ظاہر کیا ہے اس کا لطف وہی حاصل کرسکتا ہے جس نے حقیقتاً کبھی محبت کی ہے۔ آپس کی شکر رنجی اور باہمی کشش خواہ کسی حد تک ہو، لیکن وہ "پرسش پنہاں" جو کبھی صرف نگاہوں سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی اور بہانہ سے بدستور قایم رہتی ہے۔

یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

نظام کے دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر ایک شخص اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا کہ یہ کسی بہترین شاعر کا کلام ہے تو کم ازکم یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظام محبت کی نفسیات کا بڑا جاننے والا ہے اور اس کے قلم سے صرف وہی بات نکلی ہے، جو معاملات

محبت میں کبھی کبھی نہ اسپرٹ پیش آئی ہے، اور یہ شعر میں جس بات کو ظاہر کیا ہے، یہ وہ تمنا ہی جو ہر عاشق کے دل میں مرکوز رہتی ہے، اور وہ گھنٹوں اس خیال کی لذت سے لطف اٹھایا کرتا ہے کہ اگر کبھی مجھ پر اسقدر مہربانی ہو جائے تو کیا ہے، لیکن چونکہ ہر عاشق شاعر نہیں ہوتا اسلیئے وہ کہہ نہیں سکتا، مگر چونکہ نظام عاشق ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے اسلیئے وہ کہہ سکے کہ:-

کہہ نظام، اب ترے کیا جی میں ہے کہدے مجھ سے" ہائے پوچھے وہ کبھی مجھ سے یہ، تنہا ہو کر

انتخاب بالا سے ایک حد تک نظام کا رنگ واضح ہو گیا ہو گا، لیکن اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ واردات قلب اور معاملات حسن وعشق کے سمجھنے اور بیان کرنے میں ان کو اور زیادہ قدرت حاصل تھی اور بعض دفعہ جب جذبات عالیہ ان سے ظاہر ہو جاتے تھے تو ان کا کلام بہت بلند ہو جاتا تھا۔

معاملۂ محبت میں یہ معمولی بات ہے کہ عاشق، اپنے محبوب کی کج ادائیوں کو دیکھ کر، ذرا کھنچ جاتا ہے، اور آیندہ نہ ملنے کا عہد کر لیتا ہے لیکن یہ عہد جیسا استوار ہوتا ہے ظاہر ہے، تمام شعراء نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے اور مختلف اسالیب بیان کے اختیار کیئے ہیں، لیکن میر کے ہاں اس کیفیت کے بڑے بڑے پاکیزہ شعر پائے جاتے ہیں۔ غالب نے اپنے پر شوکت انداز بیان میں اس خیال کو اسطرح ظاہر کیا ہے ؎

رہے آزردہ ہم اس شوخ سے چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال کے ظاہر کرنے کے لیئے نہایت آسان اور سادہ زبان کی ضرورت ہے اور یہی سبب ہے کہ میر کے ہاں اس نوع کے جذبات نہایت موثر انداز میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ نظام کی شاعری بھی سادہ الفاظ کی شاعری ہے اسلیئے ان کے ہاں بھی یہ رنگ خوب ہے مثلاً:-

عہد کیا تھا ابھی کیسا نظام پھر وہیں جانے کا ارادہ کیا؟

ابھی تو توبہ کی تھی تم نے نظام اس طرف سے ابھی گزرنا تھا؟

توبہ واں جانے سے کرتے ہو نظام کیا کروگے وہ اگر یاد آیا ؟

لے وہاں جائے کھڑا ہم رہا گئے کہاں دل سے اس نے مرا جانا گئے کہاں

پھر اسی سے تو جا ملیگا نظام تیری توبہ کا اعتبار نہیں

جب محبت کی کیفیات قوی ہو جاتی ہیں اور انسان ایک خاص قسم کی تکلیف، ویرانی، درمندی اور بیزاری محسوس کرنے لگتا ہے تو اسمیں ایک کیفیت یاس کی پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ کچھ بیان بھی نہیں کرسکتا۔ یہ وہ کیفیت ہے جب اسکی زبان صرف آہ اور اس کا بیان صرف کراہ ہوتا ہے، اس حالت کے اشعار میر درد کے ہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ نظام کے دیوان میں بھی ایسے اشعار موجود ہے اور حق یہ ہے کہ بعض بعض تو اسقدر بلند ہیں کہ اگر کوئی واقف نہ ہو تو انہیں میر کا کلام سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

اب ہمارا نہ حال پوچھ نظام کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا

اس رنگ میں یہ شعر بالکل ابتدائی کیفیت کا ہے۔ اس کے بعد مرتبہ آوارگی کا جسے صحرانوردی سمجھ لیجیئے، جس کو نظام نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظام کی بیچارہ تنگ آکے وطن سے نکل گیا

لیکن اس کیفیت کی شدت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسمیں اور اضافہ ہوتا ہے حتی کہ ایک شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:۔

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو غم ہوگا تمھیں بھی گر کہوں گا

اس رنگ سے ذرا ہٹا ہوا لیکن قیامت کا شعر تو نظام نے یہ کہا ہے کہ:۔

آج کل آپ سے باہر ہے نظام کہیں محفل میں نہ بلوائیے گا

ایسے مکمل شعر نظام کیا بڑے بڑے اساتذہ کے دواوین میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ محفل میں بلوانا اور آپ سے باہر ہونا ان دونوں کا جو بغیر قصد کے بے ساختہ تقابل ہو گیا ہے تو عجب لطف پیدا ہو رہا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ معنوی کیفیت جو اس میں پنہاں ہے اسکو صاحبان ذوق سمجھ سکتے ہیں۔ مستی و دیوانگی کا کہیں ذکر نہیں ہے، لیکن اس کی ایسی مکمل تصویر پیش کر دی ہے کہ شعر سنتے ہی سارا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور از خود ذہن سامع کہنے والے کی از خود رفتگی پر ایمان لے آتا ہے۔

چونکہ عاشقانہ تاثرات کی کوئی حد نہیں ہے اسلیئے رنگ تغزل کے اسالیب محدود نہیں ہو سکتے، ہزاروں جذبات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ہزاروں ہی صورتوں سے انہیں وہ پیش کرتا ہے، اسلیئے کسی شاعر کے کلام کو ہم متعین و محدود عنوانات کے تحت میں تقسیم نہیں کر سکتے، اس کا ہر شعر ایک مستقل عنوان کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کا ہر جذبہ

علیحدہ تفسیر کا محتاج، اسلیئے اب ہم مختلف مقامات سے مختلف جذبات کے شعر نقل کرتے ہیں، جس سے میاں نظام شاہ کے رنگ سخن کا پورا حال معلوم ہو سکیگا۔

ایک دم دل سے بھلایا نہیں جاتا تم کو　　کچھ خدا جانے کہ کس حال میں دیکھا ہے تمہیں

چین ملتا نہیں ذرا دل کو　　تم سے مل کر یہ کیا ہوا دل کو

کسی چرچہ میں جی نہیں لگتا　　یا الٰہی یہ کیا ہوا دل کو

جانتے ہو نظام کو کیا تم　　ایک ہے اپنی وضع کا وہ بھی

کیا کہیں آپکے نزدیک ہی رہتا ہے نظام　　روز پچھلے کو جو رونے کی صدا آتی ہے

ان کو میں کس طرح بھلاؤں نظام　　یاد کس بات پر نہیں آتے

کیا قہر وعدہ نے ورنہ شب ہجر　　مجھے غم تو ہوتا پر اتنا نہ ہوتا

تجھ سے کچھ کہنے کو تھا، بھول گیا　　ہائے کیا بات تھی کیا، بھول گیا

جو دل میں آئے کسی کے وہ کچھ کہے مجھکو　　مجھے تو ناز ہے اس در پہ جبہ سائی کا
نظام ان کی تو عادت کبھی ستم کی نہ تھی　　خیال آگیا کیا الفت آزمائی کا

یوں آپ تو کہو نگا نہ رنجش کا ماجرا　　پوچھوگے، تم، تو مجھ سے چھپایا نہ جائیگا
سچ ہے نظام یاد بھی اسکو نہ ہونگے ہم　　پر کیا کریں وہ ہم سے بھلایا نہ جائیگا

کہنے سے نہ منع کر کہونگا تو میری نہ سُن مگر کہونگا
تجھ سے ہی چھپاؤں گا غم اپنا تجھ سے ہی کہونگا گر کہونگا

کہا کیوں دوست تم نے خدا جانے وہ کیا سمجھے ہمارا حال اُن پر آپ ہی اظہار ہو جاتا

خدا ہی جانے کہ کیا دل پہ چوٹ لگتی ہو تمھارے پاس جو آیا وہ دردمند ہوا

میں نے جو تجھ سے کہا تھا، وہ تو تو نے کہہ دیا نامہ بر مجھ سے نہ کہنا اس ستمگر کا جواب

نظام کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

وہ جھروکے سے جو دیکھیں تو میں اتنا پوچھوں بس ترا اپنا پس دیوار کروں یا نہ کروں

لیکن اس غزل کا مقطع عجیب و غریب رنگ کا ہے اور داد سے کلیتہً مستغنی۔ لکھتا ہے:۔

تو بھی اس شوخ سے واقف ہے بتا کچھ تو نظام مجھ سے دل مانگے تو انکار کروں یا نہ کروں

میر کا وہ شعر جسمیں وہ اپنے آپ کو دعوت دیتا ہے کہ "آ، میر سوئیں منہ پہ دوپٹہ کو تان کر" بہت مشہور ہے۔ نظام کا بھی ایک شعر اس رنگ کا ملاحظہ ہو۔

بیٹھے منہ پڑے رہنا تری کچھ یاد لا لا کر بنایا کرتے ہیں دل سے ہم دو دو پہر باتیں

اس شعر میں "تری کچھ یاد لا لا کر" کسقدر پُر لطف ہے۔ دورانِ محبت میں ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے جب انسان تدابیر سے کام لیکر ایک عزم کر لیتا ہے، لیکن آخر کار وہ اس "سعی لاحاصل" کی حقیقت کو بھی جان لیتا ہے۔ چنانچہ نظام اسی کیفیت کا اظہار کرتا ہے:۔

یہ کیا کہ یہ نہیں یاد وہ نہیں نظام اک روز ایسا ہوگا کہ ہونگے نہیں نہیں

اگر اس شعر کو آپ زیادہ بلند و وسیع مفہوم میں بیجائیں تو تمام کاروبار عالم اور اسکے آخری نتیجہ پر بھی منطبق کر سکتے ہیں

ہر چند محبت خودداری و وقار کی دشمن ہے لیکن کبھی کبھی اس کا بھی خیال آجاتا ہے اور اپنی ذلت کا اظہار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کیفیت نظام نے یوں ظاہر کی ہے:۔

کیا کہیئے کہ کہاں تک ہے رسائی اپنی پوچھنے والوں سے کہتے ہیں کہ ہاں مل آئے

عاشق جب تک محبوب کے سامنے نہیں پہونچتا، دل ہی دل میں ہزاروں شکوے لیئے رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ روبرو سب کچھ کہہ ڈالوں گا۔ لیکن صورت دیکھتے ہی تمام گلے محو ہو جاتے ہیں۔ میر کا یہ شعر اس خیال کے اظہار میں بہت مشہور ہے:-

یہ کہتے وہ کہتے، تھا دل میں جو یاد آتا کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

میاں نظام نے بھی متعدد شعر اس جذبہ کے اظہار میں لکھے ہیں اور بعض بعض خوب ہیں مثلاً:-

باتیں تھیں دل میں کیا کیا، کہنے کو تھے نہ کیا کچھ منہ سے نہ اسکے آگے کچھ بھی کلام نکلا

اس سے زیادہ پرلطف انداز یہ ہے:-

حیران سے رہجاتے ہیں ہم سامنے اُسکے ہم سے تو نظام اس سے گلہ ہو نہیں سکتا

انداز بیان کی خصوصیت بھی شعر کو بہت بلند کر دیتی ہے اور مضمون کی پامالی بھی اس صورت میں نظرانداز کر دیجاتی ہے، اس خصوصیت کے شعر نظام کے ہاں ذرا کم پائے جاتے ہیں لیکن جتنے ہیں وہ قیامت کے ہیں۔ دشمن یا غیر کی عدم وفا کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے اور یہ مضمون اسقدر پامال ہے کہ اب قریب قریب سب نے اسے ترک کر دیا ہے، لیکن ایک جگہ میاں نظام نے اس مضمون کو اسقدر پُرلطف طریقہ سے بیان کیا ہے کہ میں اس کے انتخاب پر مجبور ہوں لکھتے ہیں کہ:-

مجھے امید وفا تم سے، تمہیں دشمن سے یہ اگر ضبط ہے تو، مجھ سے زیادہ ہے تمہیں

اصل مقصود دشمن کی غیر وفاداری ظاہر کرنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ محبوب کی بیوفائی کا بھی ذکر نہایت حسن کے ساتھ آگیا ہے اور اس انداز بیان نے کہ "یہ اگر ضبط ہے تو مجھ سے زیادہ ہے تمہیں" اس شعر کو بہت پرلطف بنا دیا ہے، اسی کے ساتھ اعتماد وفا کو ضبط سے تعبیر کرنا ایسی بلیغ و نادر تعبیر ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

طرز ادا کی خوبی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

کل کا وعدہ کیا پھر آ کے سنئے آج اور بھی ایک دن جیئے ہی بنی

اصل مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہمیں تمہارے وعدہ کا اعتبار نہیں، لیکن الفاظ میں کہیں اس کا ذکر نہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ باوجود عدم اعتبار کے ہماری زندگی کا سہارا ابھی صرف تمہارا یہی جھوٹا وعدہ ہے اور اس کو بھی الفاظ سے ظاہر نہیں کیا۔

اب ہم چند اشعار اور درج کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد میاں نظام سے رخصت ہوتے ہیں:-

تیرا ملنا تو ایک آفت ہے — غیر کا حال کیا ہوا ہو گا
آپ ہی آپ ایسے روئے نظام — دل میں کچھ دھیان آگیا ہوگا

جو مرے دیکھنے کو آتا ہے — پھر وہ بار دگر نہیں آتا

واں جانے سے فائدہ معلوم — دل ادھر بھی بقرار رہوگا

وہ مجھکو نظام کیوں مناتے — کیا جانیئے یہ بھی کیا محل تھا

ہم تو کہہ گزرے حال دل اپنا — نہیں معلوم اُس نے کیا جانا

جز اُس گلی کے دل نہیں لگتا کہیں نظام — سو بار ہم تو ساکن دیر و حرم ہوئے

سب کہتے ہیں مجھ کو نہیں بچنے کا نظام اب — کس واسطے مرتا ہے تم اتنا نہیں کہتے
ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بُری لگے — اس بیوفا سے گو مری رنجش ہزار ہے
روٹھ کر بیٹھے ہو اُن سے کس توقع پر نظام — ہوش میں آؤ، وہ آئیں گے منانے کے لیئے!
یہ بات پوچھتے ہیں اُن کے جانے والوں سے — ہمارے باب میں وہ کچھ کہا بھی کرتا ہے

شکوہ اُس بُت کا ہر کسی سے نظام؟ — اس سے کہدے خدا کرے کوئی

کہیں اس بزم تک رسائی ہو — پھر کوئی دیکھے اہتمام مرا

ہندی شاعری کی تاریخ

(بسلسلہ ماہ گزشتہ)

عہد شاہجہاں و جہانگیر عہد اکبری میں جو صورت ہندی لٹریچر کی ترقی کی قائم ہوگئی تھی وہ اکبر کے بعد بھی قائم رہی کیونکہ جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) اور شاہجہاں (۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) نے قدردانی شعراء میں اسی قدر حصہ لیا جتنا عہد اکبری میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ داراشکوہ، شاہجہاں کا بیٹا تو اسقدر مائل تھا کہ بعض لوگوں نے اُسے لفظاً ہندو کہدیا۔ عہد اورنگ زیب میں (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) بھی باوجود اس کے کہ عام طور سے وہ تعصب کا دور کہا جاتا ہے مستحق ہندی شعراء کو رائے کے خطاب دیئے جانے کا دستور رہا۔

۱۶۳۱ء میں کوی رائے کا خطاب ایک شخص سندر کو دیا گیا جو ذات کا برہمن تھا، اسکی ایک کتاب فن شعر پر سندر سرنگار اور دوسری سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ برج بھاشا زبان میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

سناپت ۱۵۸۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۹ء تک زندہ رہا، یہ قنوجی برہمن تھا، اور پرستار کرشن میں سے تھا ۱۶۴۹ء میں اسنے ایک کتاب کوت رتناکر کے متعلق تصنیف کی۔ مناظر فطرت کے بیان میں اسکو خاص ملکہ حاصل تھا، چنانچہ اُس نے جہاں موسموں کا بیان کیا ہے وہ حصہ ہندی لٹریچر کی جان کہا جا سکتا ہے۔

رتناکر ترپاٹھی ایک قنوجی برہمن تھا اور ٹکوامیور (ضلع کانپور) میں رہا کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے اور چاروں مشہور شاعر ہوئے۔ انہوں نے عہد شاہجہاں و اورنگ زیب میں ترقی حاصل کی اور کیسوداس کے مذاق تصانیف کو زیادہ مقبول بنایا، ان میں سے بڑے بھائی کا نام چنتامنی تھا، اور شاہ جہاں تک بھی اسکی رسائی تھی، اسکی متعدد تصانیف ہیں جنمیں چھند بچار فن عروض پر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی کا نام نیل کنٹھ تھا اور یہ بھی نہایت مشہور شاعر تھا۔ باقی دو بھائی بھوشن اور متی رام تھے۔ جو شاعری میں چنتامنی اور نیل کنٹھ سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتے تھے، بھوشن مختلف ہندو راجاؤں کے درباروں میں، رہا لیکن بندیلکھنڈ کے راجہ چھتر سال اور سیواجی (مرہٹہ) نے خصوصیت کے ساتھ اسکی بہت قدر کی، ان دونوں کی تعریف میں اس نے بہت سے قصائد کہے، چنانچہ سیورام بھوشن اسکی بہت مشہور کتاب ہے جسمیں اس نے سیواجی کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رزمیہ مناظر کے بیان کرنے میں اسکو خاص ملکہ تھا۔

ستی رام کا تعلق پہلے راجہ راؤ بھاؤ سنگھ (بوندی) سے رہا اور پھر راجہ شمبھو ناتھ سلطانی سے۔ راجہ بوندی کے سامنے پیش کرنے کے لئے اسنے علم معانی پر ایک کتاب للت الام تحریر کی اسمیں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ خود اسی کی مصنفہ ہیں اور اکثر میں راجہ بوندی کی تعریف کی ہے، علم بدایع و معانی پر اسکی یہ تصنیف خاص عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اسکی دوسری تصنیف عروض پر چھند سار پنگل ہے جو راجہ شمبھو ناتھ کی خاطر سے لکھی گئی تھی، اسکی تیسری تصنیف رس راج جو خالص عاشقانہ شاعری ہی، بہترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے، اسکی ست سئی متی رام بھی بہت مشہور رہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا کلام بہاری لال کے کلام سے (جس کا ذکر آئے گا) ٹکر کھاتا ہے

عہد شاہجہاں کے شعراء

شمبھو ناتھ ستارہ کا راجہ (۱۶۵۰ء) شعراء کا قدر شناس صرف اسلئے تھا کہ وہ بھی اچھا کہنے والا تھا، چنانچہ اسکی تصانیف نایکہ بھید اور نک سکھ بہت مشہور ہیں۔

سرستی (۱۶۵۰ء) بنارس کا برہمن تھا اور سنسکرت کا فاضل، شاہجہاں کے اشارہ سے اسنے ہندی زبان میں شاعری شروع کی۔ چنانچہ کوندر الکلپ میں اس کی مشہور کتاب ہے جسمیں شاہجہاں اور دارا شکوہ کی تعریف میں بہت سی نظمیں پائی جاتی ہیں

تلسی (۱۶۵۵ء) ایک معمولی شاعر تھا لیکن اُسنے ایک کوئی مالا مرتب کرکے اپنے تئیں غیر فانی بنا دیا۔ اس کتاب میں اسنے ۱۴۴۳ء سے ۱۶۴۳ء تک کے خاص خاص ۷۵ شعراء کا منتخب کلام درج کرکے وہ کام کیا جو اس سے قبل کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا اور غالباً ہندی زبان میں تذکرۃ الشعراء کے سلسلہ کی یہ پہلی کتاب تھی۔

عہد مغلیہ کے باقی شعراء

عہد مغلیہ کے تمام شعراء کی اگر فہرست مرتب کی جائے اور یہ سوال ہو کہ سب سے پہلے کس کا نام درج کرنا چاہیئے تو یقیناً فن شعر کے لحاظ سے بہاری لال ہی کا انتخاب عمل میں آئیگا۔ جس کا کلام آج بھی ویسا ہی شگفتہ و پُر مغز نظر آتا ہے جیسا اب سے تین صدی قبل۔ یہ ذات کا برہمن تھا، گوالیار میں پیدا ہوا۔ اور زمانہ بچپن بندیلکھنڈ میں صرف کیا، بعد کو متھرا میں اسکی شادی ہوئی اور برج بھاشا کی اس حقیقی مسکن میں اسنے اقامت اختیار کرلی، اس کا سرپرست جے سنگھ راجہ جے پور تھا جو ہر شعر کے عوض اُسے ایک اشرفی دیا کرتا تھا۔

بہاری لال کی موجودہ شہرت اسکی ست سئی پر ہے جسمیں تقریباً سات سو دوہے اور سورٹھا پائے جاتے ہیں۔ ان دوہوں میں رادھا اور کرشن کے تعشق کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ ہر دوہا اک مکمل مضمون پیش کرتا ہے اسلئے مختلف نسخے مختلف ترتیب کے ساتھ منضبط ہوئے، لیکن ان سب میں مشہور وہ نسخہ ہے جو اورنگ زیب کے تیسرے

بیٹے اعظم شاہ کے لیئے کیا گیا تھا - اور اسی لیئے اُسے اعظم شاہی نسخہ کہتے ہیں - اسکی ترتیب اسطرح ہے کہ پہلے چند مختلف دوہے درج کیئے گئے ہیں، اسکے بعد نایک کی چاروں قسموں کا بیان ہے اور پھر دوسو شعر نایکہ کی اقسام سے متعلق ہیں - اس کے بعد مختلف کیفیات کے متعلق الگ الگ مجموعۂ اشعار مرتب کیا گیا ہے، ایک سوستر دوہے صرف فراق کے بیان میں ہیں، تیسرے حصہ میں نک سکھ (سراپا) ہے جو ۶ موسموں کے بیان پر ختم ہوتا ہے اور چوتھے حصہ میں دیگر مختلف جذبات سے بحث کی گئی ہے -

ہر چند بہاری لال اس انداز بیان اور ترتیب کا موجد نہ تھا (اس سے قبل سنسکرت میں سبت سئی موجود تھی اور تلسی داس بھی ایک ست سئی لکھ چکے تھے) لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسکی ست سئی بہت زیادہ مقبول ہوئی اور کم از کم بتیس شرحیں اسکی لکھی گئیں - بنارس کے ایک شخص ہری پرشاد نے اسکو سنسکرت میں بھی منتقل کیا -

جسونت سنگھ مارواڑ (جودھپور) کا راجہ (جو تاریخ میں اورنگ زیب کے مخالفین کی فہرست میں دکھایا جاتا ہے) ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۸۱ء تک زندہ رہا - ۱۶۳۴ء میں جبکہ وہ بہت کمسن تھا تخت نشین ہوا - لٹریچر میں اسکی خاص شہرت کا باعث بھاشا بھوشن ہے - اسکی اور کتابیں بھی فلسفہ و یدانت پر ہیں -

دیو کوی اس کا اصلی نام دیودت اور ذات کے لحاظ سے سناڈھیا برہمن تھا - یہ ۱۶۷۳ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوا اسکی عمر سولہ سال کی تھی کہ اس نے شاہزادۂ اعظم شاہ کے سامنے اپنی سب سے پہلی نظم پڑھی اس نے سرپرست کی تلاش میں ہندوستان کا بہت سفر کیا، اور اکثر رؤسا نے اسکی قدر بھی کی لیکن وہ کبھی مطمئن نہ ہوا، راجہ بھوگی لال اس کا ایک مشہور سرپرست تھا چونکہ اسنے سیاحت بہت کی تھی اسلیئے وہ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے حالات سے پورا وقوف رکھتا تھا، اور ان کے بیان کرنے میں اسکو خاص ملکہ حاصل تھا، کہاجاتا ہے کہ اس نے ۷۲ کتابیں لکھیں جنمیں سے اب صرف بیس باقی ہیں - اسکی بہت مشہور کتابیں حیات بلاس اور پریم چندر کا ہیں - انداز بیان اور زبان کے لحاظ سے اس کا شمار ہندی کے مخصوص طبقۂ شعراء میں کیا جاتا ہے -

شاہ جہاں کے بعد باوجود اسکے کہ اورنگ زیب کو متعصب کہاجاتا ہے لیکن بہت سے ہندی زبان کے شعراء اسکے دربار سے متعلق تھے اور ہندی شاعری کی سرپرستی قائم تھی جو اس کے بیٹے بہادر شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی ہم یہاں ایک فہرست پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ شاہ جہاں کے بعد ڈیڑھ صدی کے اندر کتنے مشہور شاعر پیدا ہوئے -

(۱) چلپت مصر۔ یہ آگرہ کا باشندہ اور بہاری لال کا بھتیجہ یا بھانجا تھا ۱۶۳۲ء اس کا سنہ پیدائش ہے جے پور کا راجہ رام سنگھ اس کا سرپرست تھا۔ اسنے ۱۶۷۰ء میں ایک کتاب رس رہس لکھی جو بہت مشہور ہے۔

(۲) رام جی۔ ۱۶۴۶ء میں پیدا ہوا، اس نے متعدد تصانیف لکھیں، جنمیں ناٹکہ بھید خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

(۳) منڈن۔ ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا۔ یہ بند لکھنڈ میں پیدا ہوا اور متعدد تصانیف چھوڑ گیا۔

(۴) سکھ دیو مصر۔ یہ کمپلا کا رہنے والا تھا اور متعدد درباروں سے وابستہ رہا۔ راجہ گورنے اسے کوی راج کا خطاب دیا۔ اس نے فن عروض وغیرہ پر متعدد تصانیف لکھیں۔ ۱۶۷۰ء اس کا زمانہ ترقی رہا۔

(۵) نواج ذات کا برہمن اور چھتر سال راجہ پنا کے دربار سے متعلق تھا۔ شکنتلا ناٹک اسکی مشہور کتاب ہو ۱۷۰۰ء میں اس نے ترقی حاصل کی۔

(۶) کالی داس ترویدی۔ نواج کا ہمعصر اور بنا پورہ کا رہنے والا تھا۔ عرصہ تک دربار اورنگ زیب سے وابستہ رہا پھر راجہ جمبو نے اسکو اپنے سرپرستی میں لے لیا۔ یہ بڑا خوشگو شاعر تھا، اسکی تصنیف کالی داس ہجارہ، جسمیں دو سو شعرا کی ایک ہزار منتخب اشعار درج ہیں، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

(۷) عالم (۱۷۰۳ء) ایک برہمن تھا جو ایک مسلمان رنگریزن پر جو خود بھی شاعرہ تھی عاشق ہوکر مسلمان ہوگیا اور اس سے شادی کرلی۔ شاہزادہ معظم شاہ کا ملازم تھا اس کا کلام نہایت دلکش ہے۔

(۸) سری پت (۱۷۲۰ء) فن شاعری کے لحاظ سے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے، اسکی بہت مشہور کتاب کاوی سروج ہے۔

(۹) سورتی مصر (۱۷۲۹ء) آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اسنے بہاری لال کی ست سئی اور کیشو داس کی رسک پریا کی شرح لکھی اور خود بھی متعدد تصانیف کیں جنمیں نک سکھ بھی شامل ہے۔

(۱۰) گنجن (۱۷۲۹ء) بنارس کا برہمن اور قمر الدین خاں وزیر محمد خاں کا ملازم تھا، قمر الدین خاں اسے اکثر انعامات سے سرفراز کرتا تھا۔ اسنے اسکی فرمائش سے ایک کتاب فن شعر پر لکھی اور اپنے سرپرست کی بہت تعریف کی۔

(۱۱) گرودت سنگھ (۱۷۳۴ء) امیٹھی کا راجہ تھا اور بھوپت اس کا تخلص تھا، اسنے بہاری لال کی تتبع میں خود بخود ایک ست سئی لکھی ہے۔

(۱۲) توش ندھ (۱۷۳۴ء) سنگرور ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اسکی تصانیف میں سدھانذھ اور نک سکھ

زیادہ مشہور ہیں۔

(۱۳) دلپت رائے اور بنسی دھر (۱۷۲۵ء) یہ دونوں احمد آباد کے رہنے والے تھے، انھوں نے باہم ملکر ایک کتاب النکار رتنا کر تصنیف کی اور اودے پور کے راجہ جگت سنگھ کے نام منسوب کی۔ اسکو راجہ جسونت سنگھ کی مشہور تصنیف بھاشا بھوشن کی شرح سمجھنا چاہیئے۔

(۱۴) سومناتھ (۱۷۳۷ء) یہ برہمن زادہ تھا اور راجہ بھرت پور کا ایک لڑکا اس کا سرپرست تھا۔ اسکی متعدد تصانیف میں پیوشن ندھ فن شاعری کے نہایت عمدہ کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

(۱۵) رس لین (۱۷۴۰ء) اس کا نام سید غلام نبی اور بلگرام اس کا وطن تھا۔ اس کے متعدد تصانیف ہیں جنمیں رنگ درپن خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

(۱۶) اودے ناتھ ترویدی (۱۷۴۰ء) یہ کالی داس ترویدی کا بیٹا اور بن پورہ کا رہنے والا تھا۔ یہ راجہ امیٹھی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ فن شاعری پر یہ اک اچھی تصنیف کا مالک ہے۔ اس کا بیٹا دولہ ترویدی بھی اسی موضوع کا شاعر تھا۔

(۱۷) بیری سال (۱۷۶۸ء) نے علم بدائع و معانی پر ایک کتاب بھاشا برن لکھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت عمدہ تصنیف خیال کی جاتی ہے۔

(۱۸) کشور (۱۷۶۸ء) یہ بھی اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا، اس کا منتشر کلام ایک جگہ جمع ہوکر کشور سنگرہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۱۹) دیودت (۱۷۷۰ء) اسکی تصنیف للت لتا بہت مشہور ہے جو متی رام کے للت للا رام سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔

(۲۰) چندن رائے (۱۷۷۳ء) راجہ گور کے دربار کا شاعر تھا۔ اسنے فن شعر پر متعدد کتابیں لکھیں۔ اسکے بارہ شاگرد تھے جو بعد کو سب کے سب مشہور شاعر ہوئے۔

(۲۱) رتن کوی (۱۷۴۱ء) میں پیدا ہوا۔ فن شاعری پر اس تصنیف فتح شاہ پرکاش اور فتح بھوشن بہت مشہور ہیں۔ فتح شاہ بندیلہ اس کا سرپرست تھا۔

(۲۲) متی رام مصر (۱۷۷۲ء) اسنے اپنی تصنیف چھند چھپنی میں نہایت مختصر طریقہ پر فن شاعری سے بحث کی ہے۔

موت کا خوف

"ولیم ہیزلٹ وہ شخص تھا جس کے متعلق مغربی اہل نقد کی رائے ہے کہ سرزمین یورپ ایسا مقالہ نگار (Essayist) پیدا نہیں کر سکی۔

ان خیالات کی بنیاد اسی کے ایک مضمون پر قائم کی گئی ہے اور یہ ایک ایسی ہستی کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے کہ اگر وہ اپنی حقیقی عظمت سے آگاہ ہو جاتی، تو آج اردو بزم ادب کی صف اول میں نظر آتی۔

آپ فرماتے ہیں کہ "اسمیں کافی سے زیادہ خشکی موجود ہے، اسلیئے شاید پسند آجائے" میں اس الزام کا جواب دینے کی کوشش کیے بغیر، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری زبان میں لوگوں کو ایسے خشک مباحث پر اسقدر شگفتہ انشاء کا سلیقہ حاصل ہو جائے تو دنیا اسی خشکی کے لیئے اپنی بیتابیاں صرف کرنے کے لیئے آمادہ ہو سکتی ہے۔ (ایڈیٹر)

"ہماری مختصر زندگی کے چاروں طرف ایک قسم کی نیند ہی نیند ہے"

موت کے خوف کا سب سے بہتر علاج شاید یہی ہے کہ انسان یہ سوچتا رہے کہ زندگی کی اگر ابتدا ہے تو انتہا بھی ہے، اس بات سے ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، کہ ایک وقت ایسا تھا جب ہم نہ تھے، تو پھر اس خیال سے ہم کو کیوں دکھ ہو کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب ہم نہ ہونگے، جب مجھے یہ تمنا کبھی نہیں ہوئی کہ میں آج سے سو برس پہلے یا اکبر و اورنگ زیب کے زمانہ میں کیوں نہ تھا، تو پھر میں اس بات پر کیوں دل دکھاؤں کہ میں آج سے سو برس بعد یا فلاں بادشاہ کے زمانہ میں (جس کا نام نہیں بتا سکتا) نہ ہونگا۔

حکماء یونان کے حلقہ درس و تدریس میں مجھے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع نہیں ملا، روستہ الکبریٰ کی مجلس قانون کا میں رکن نہیں تھا، انقلاب فرانس میں مجھے کوئی دخل نہیں۔ فتوحات نپولین میرے مشورہ سے تمام تر خالی تھیں، امریکہ کی آزادی بغیر میری جد و جہد کے وقوع میں آئی، اسلام کی اشاعت عرب و عجم کی تسخیر اسلامی حریت و مساوات کی تعلیم میری کوششوں کی قطعی ممنون نہیں۔ کرشن کنھیا کے بانسری کی آواز میرے کانوں میں نہیں آئی، مہا بھارت کی لڑائی میں میں کسی حیثیت سے بھی شریک نہ تھا، رام چندر جی کے بن میں، سیتا جی [illegible] راون کی دست درازی سے مجھے کوئی تعلق نہیں، آریوں کا تسلط مسلمانوں کی حکومت ہند، اس کا عروج و زوال، انگریزوں کا تاجرانہ داخلہ اور شاہانہ قیام

غرضکہ یہ سب باتیں بغیر میرے صلاح و مشورے، بغیر میری رائے کے بغیر میری موجودگی کے ہوئیں۔ لیکن میں نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ ان تمام اوقات میں نہ میں کھاتا تھا نہ پیتا تھا نہ خوش و خرم تھا لیکن میں نے کبھی شکایت نہیں کی، میں نے اُس وقت کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی دنیا نہیں دیکھی تاہم میں مغموم نہ تھا، دنیا کا سارا کام بغیر میرے اُسی خوبی سے چل رہا تھا جیسا میرا کام بغیر دنیا کے۔ پھر آخر اس دنیا سے جدائی پر یہ رونا پٹینا کاہے کا ہے، یہ نالہ و فریاد کس لیئے؟ اور یہ شور و شیون کیوں؟ جو حالت میری پیدائش سے پہلے تھی، مرنے کے بعد اُس سے بدتر تو ہونے سے رہی، پھر اس خیال میں کیا رکھا ہے، کہ "آہ ایک وقت وہ تھا جب ہم دنیا میں نہ آئے تھے"! اور پھر ہمارا جی اس خیال سے کیوں کڑھے کہ ایک دن ہم دنیا سے چل بسیں گے مرنے کے تو صرف یہی معنی ہیں کہ ہم پھر ویسے ہی ہو جائیں، جیسے پیدا ہونے سے پہلے تھے لیکن پیدا ہونے سے پہلی کی حالت پر نہ تو کسی کو رنج ہوتا ہے نہ افسوس و نفرت، بلکہ اُس حالت کے خیال سے تو ایک بوجھ سا ہلکا ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تعطیل کا زمانہ تھا اور ہم دنیا کے اسٹیج پر حاضر ہونے کے لیئے ہنسنے یا ہنسے جانے کے لیئے، رونے یا رُلانے کے لیئے طلب نہ کئے گئے تھے، وہ ایک طویل رات تھی جسمیں ہم نہایت آرام و اطمینان سے افکار و آلام سے دور، ہزار ہا برس تک سکھ کی ایسی نیند سوتے رہے، جس سے جاگنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی اور خاک عدم کی ایک نہایت ہلکی چادر ہم پر پڑی رہی۔ اب ایک ذرا سی ہستی کے بعد جو صرف ایک جنبش و ایک لرزش تھی اور جسمیں چند موہوم امیدوں اور تھوڑے سے بلا وجہ خوف کے سوا کچھ نہ تھا ہم کو یہ ڈر کیوں ہو کہ ہم پھر اُسی آرام و سکون میں پہونچکر زندگی کے موجودہ خواب پریشاں کو بھول جائینگے؟

اے ملک عدم کے رہنے اور مقبروں میں سونے والو! کیا تمھارا اب بھی جی چاہتا ہے کہ تم اس دنیا میں آؤ اور شریک جنگ و جدال ہو، کیا تم اپنی موجودہ زندگی پر قانع نہیں ہو، کیا تم کو یہ شکایت ہے کہ تمہیں دُکھ نہیں پہونچتا، اور نہ بیماری نہیں ستاتی۔ تمہیں نہ جنگ کرنا پڑتی ہے، نہ کسی کی بیوفائی کا اب تم پر کوئی اثر ہوتا ہے، کیا تم کو اس بات کا گلہ ہے کہ جب تک یہ زمین آفتاب کے گرد چکر کھاتی رہیگی اب کوئی آواز تمھاری دائمی راحت میں خلل انداز نہیں ہو سکتی؟ اے وہ کہ جسکی جانب میرا دل کھنچتا ہے اور جب تک کہ اسمیں احساس باقی ہے ہمیشہ کھنچتا رہیگا! اے وہ کہ جسکی محبت ناکام رہی اور جسکی سب سے پہلی آہ ہی سب سے آخر کراہ ثابت ہوئی۔ کیا تجھے آرام کی نیند سونا پسند نہیں جبکہ میرا مغموم دل اس لیئے مغموم نہ رہا کہ اب وہ غم ہی فنا ہو گیا، جس کے احساس ہی کے لیئے اس دنیا میں تیرا وجود ہوا تھا!!

بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ عالم وجود میں آنے سے پہلے کی کیفیت میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ہمارے

تخئیل میں اتنی تحریک پیدا کر سکے، جتنی عالم وجود سے خارج ہو جانے کے بعد والی کیفیت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے، اسکو یوں سمجھیے کہ ہم کو اس بات کا کبھی افسوس نہیں ہوتا کہ ہم نے اور پہلے سے اپنا سفر کیوں نہیں شروع کیا، جسوقت کہ ہم نے زندگی کی ابتدا کی، اُسکے خلاف ہم کچھ نہیں کہتے، ہم کو اس بات کا افسوس نہیں ہوتا کہ دنیا کو پیدا ہو کر جو ہزارہا برس گزر گئے یہ زمانہ ہمارا ضائع ہو گیا۔ ہم کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ ہم دو چار دن، برس دو برس یا ایک دو صدی قبل کیوں نہ پیدا ہوئے اور ہم نے دنیا کی جلوہ آرائیوں کا اُسوقت کیوں تماشہ نہ کیا لیکن اس خیال سے ہماری روح گھبراتی ہے کہ ان جلوہ آرائیوں کے ختم ہونے سے پہلے ہم کو یہ تماشا گاہ چھوڑ دینا پڑیگی، آخر اس کا کیا سبب ہے؟

ممکن ہے کہ آپ اس فرق کی تاویل و تشریح یوں کریں کہ گزشتہ واقعات کی اطلاع ہم کو کسی نہ کسی طرح ہو سکتی ہے اور واقعات آئندہ کے متعلق ہم بالکل تاریکی میں ہیں، مثلاً آج ہمکو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یونانی دمینس کی پرستش کیوں کرتے تھے، ہم یہ جان سکتے ہیں کہ انطانی نے قلوپطرہ کی آغوشِ محبت میں رومہ کی سلطنت کیونکر کھو دی، سکندر کی فتوحات اور نپولین کی عظمت و جبروت، آج ہمارے پیش نظر ہیں، غرضکہ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا واقعہ صفحات تاریخ پر محفوظ ہے، اور اُن کے ذریعہ سے ہمارے علم میں آسکتا ہے، بخلاف اسکے ہم نہیں جانتے کہ ایران کی حالت کب سنبھلیگی، مصر اپنا طوق غلامی کب توڑیگا، اور ہندوستان کے خواب آزادی کی تعبیر کیا ہوگی روس کے منتشر ذرات کب مجتمع ہونگے، جرمنی اپنی کھوئی ہوئی قوت واپس لے سکیگا یا نہیں، جاپان اور امریکہ کب برسرپیکار ہونگے، یہ تو دور کی باتیں ہیں ہم تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کل کیا ہوگا، بس نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مستقبل کے متعلق ہم جتنی ہی تاریکی میں ہیں اُسی قدر ہماری جستجو بڑھتی جاتی ہے اور زمانہ مستقبل سے ہم کو دلچسپی اور محبت ہوتی چلی جاتی ہے، اور اسی محبت و شغف کی وجہ سے جو ہم کو زمانہ مستقبل کے ساتھ اُسکی تاریکی اور فطری خواہش تلاش کے سبب سے پیدا ہوجاتا ہے، ہم دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو آج عام طور پر ہمارا یہ جی چاہتا کہ ہم قطبین پہونچ جائیں کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہونچکر ہندوستان کو اپنے قدموں کے نیچے دیکھیں، سمندر کی تہ میں پہونچکر دیکھیں کہ کیسے کیسے گوہر آبدار وہاں پڑے رُل رہے ہیں لیکن دراصل مستقبل کے رازہائے سربستہ کے منکشف کرنے کی کوئی حقیقی خواہش ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ تو طوالت حیات کی خواہش کی محض ایک تاویل ہوا کرتی ہے جس طرح ہم کو یہ خیال کبھی نہیں ہوتا کہ افسوس آج سے دو ہزار برس بعد ہم نہ ہونگے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا موجودہ لمحہ

حیات ہمیشہ قائم رہے، ہم ایسا ہی ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں جیسا کہ آج ہیں اور اپنا جی بہلانے کے لیئے دنیا کو بھی ہمیشہ بالکل ایسا ہی رکھنا چاہتے ہیں جیسی کہ وہ آج ہے۔ فراق کی مصیبت، اپنی موجودہ گرفت کا اضمحلال، ایک مضبوط رشتہ کی شکست اور چند مقاصد کی عدم تکمیل۔ یہ باتیں ہیں جنکی وجہ سے دنیا سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محض عالم وجود میں آجانا یا موجود رہنا ہی خواہش انسانی کو پورا نہیں کرسکتا، بلکہ ہم ایک خاص وقت میں ایک خاص زمانہ میں، اور خاص حالات کے ساتھ موجود رہنا چاہتے ہیں، ہم اپنے زمانہ موجودہ کو نا متناہی زمانہ مستقبل سے ہزار درجہ بہتر سمجھیں گے گویا کہ ہم کو اپنے وجود محض سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے بلکہ ہم کو اپنی موجودہ حالت عزیز ہے، جس طرح ایک پہاڑی اپنا پہاڑ، ایک صحرائی، اپنا جنگل، ایک مچھلی اپنا پانی چھوڑنے کے لیئے رضامند نہیں ہوسکتی بالکل اُسی طرح ہم اپنا موجودہ زمانہ چھوڑنے کو طیار نہ ہونگے۔

ممکن ہے کہ بعض روحیں ایسی ملجائیں جو آج سے ایک سو پچاس برس بعد وجود میں آنا محض اسلیئے پسند کرتی ہوں کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ امریکہ نے کس حد تک ترقی کرلی ہے، یا روس کا انتشار و اختلال کس نوبت کو پہونچگیا ہے، لیکن میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں، میں تو صرف اتنا اور زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ اپنی زنجیر غلامی کو پارہ پارہ دیکھ لوں، اور یہ واقعہ جسقدر جلد پیش آجائے اتنا ہی اچھا ہے

کوئی جوان آدمی یہ کبھی نہیں سوچتا کہ وہ مرجائیگا۔ اس بات کا تو اُسکو یقین آسکتا ہے کہ دوسرے لوگ مرجائینگے اور اس اصول پر بھی وہ ایمان لاسکتا ہے کہ "کل نفس ذائقۃ الموت" لیکن اپنے متعلق اس اصول کی حقیقت وہ کبھی ذہن نشین نہیں کرسکتا، بات یہ ہے کہ جوانی اور جوانی کے جوش کو بڑھاپے اور موت سے بڑی دشمنی ہے، بچپن کی بے فکری اور جوانی کی امنگ میں یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ صحت وقوت ضعف و بیماری سے کیونکر بدل جاتی ہے اور حیات کی یہ گرما گرمی کیسی ایک تو وہ سرد ہوکر رہ جاتی ہے اور اگر کبھی بہ حیثیت ایک نظریہ محض کے ہم اس امر پر غور بھی کرتے ہیں کہ زندگی کا اختتام ضروری ہے تو یہ اختتام ہم کو کوسوں بلکہ منزلوں دور نظر آتا ہے اور اُسکی رفتار ہماری زندگی کے خواب کے مقابلہ میں کتنی سست معلوم ہوتی ہے، ہماری نگاہ اُفق کے سب سے آخر کنارہ پر پڑتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کو ختم کرنے کے بعد ایک مسافت بعیدہ ہم کو مڑکر دیکھنے کو ملیگی مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی اور پھر ہمارے قدموں کے قریب جمع ہونے لگتا ہے اور بڑھاپے کا سایہ ہمکو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے ہماری زندگی کے دونوں حصے ایک ہوجاتے ہیں، دونوں سرے قریب ہوتے ہوتے مل جاتے ہیں اور اُن کے

درمیان کوئی افسانہ خیز فاصلہ باقی نہیں رہتا جس پر ہم ناز کیا کرتے ہیں اور جوانی کی بہار رخصت ہو جانے کے بعد موسم خزاں کی شام کا سایہ ہمارے گرد محیط ہو جاتا ہے زندگی کی لذتیں ختم ہو جاتی ہیں یا مرورِ زمانہ کے تند ہو جاتی ہیں یا یوں کہیئے کہ ہم سے منہ موڑ لیتی ہیں مصائب کی تکرار ہم کو چکنا چور کر ڈالتی ہے اُن کے مقابلہ کی تاب ہم میں باقی نہیں رہ جاتی نہ یہ جی چاہتا ہے کہ جوانی پھر سے واپس آ جائے، نہ زندگی دوبارہ کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک ہی بار جینا بس ہے جب درخت گر گیا تو اُسے پڑا رہنے دو اور اب حساب کتاب بند کر دو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص تلاش راہ میں جس سے واپسی کی کوئی اُمید نہیں، چلا جا رہا ہے، اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے راستہ کی تنگی و تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے، آخرکار ایک ایسے مقام پر پہونچتا ہے جہاں دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن میں تو جیسے جیسے اُس تنگ و تاریک مقام کی طرف بڑھتا ہوں مجھے یہ گرفتگی محسوس نہیں ہوتی۔ پہلے البتہ یہ کیفیت محسوس ہوا کرتی تھی اور موت کے خیال ہی سے صرف یہ معلوم ہونے لگتا تھا کہ ہزاروں امیدیں خاک میں مل گئیں میری نبضیں بوجھل ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو طبیعت پر گرانی بھی محسوس نہیں ہوتی صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سہارا تھا جو جاتا رہا اور میں کسی چیز پر تاریکی میں ہاتھ مارتا ہوں مگر وہ ہاتھ نہیں آتی میں اس دنیا سے بالکل ہی علیحدہ ایک دنیا میں ہوں زندگی کا عریاں نقشہ میرے سامنے ہے، اُسکی تنہائی و وحشت میں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ موت میری جانب بڑھتی چلی آ رہی ہے، جوانی میں کثرت مناظر اور تراکم جذبات کی وجہ سے مجھے اُسکی صورت نہیں دکھائی دیتی تھی، اور ہم دونوں کے درمیان میں امید یہ کہتی ہوئی حائل ہو جایا کرتی تھی کہ "موت سے مت ڈرو، موت کی کیا پرواہ ہے" اگر میں نے واقعی اسطرح زندگی کی ہوتی جو زندگی کرنے کا حق ہے تو مجھے مرنے کی فکر نہ ہوتی کیونکہ میں یہ کبھی نہیں چاہتا کہ کوئی عہد مسرت بغیر پورا کئے ہوئے ختم ہو جائے اور شادمانی کامل سے مواصلت نصیب نہ ہو، یا پیمان مسرت میں کوئی تغیر و تبدل واقع ہو مگر افسوس تو یہ ہے کہ میری بہت سی اور بڑی امیدیں سب خاک میں مل گئیں اور اگر کچھ باقی بھی رہ گئی ہیں تو صرف میرا مضحکہ اڑانے کے لیئے۔ کاش وہ از سرنو قائم ہوتیں اور میں سنسار کی بھلائی کی کوئی صورت دیکھ سکتا، اپنے بعد کوئی کارِ نمایاں چھوڑ جاتا، کوئی محبوب ہاتھ مجھے سپرد خاک کر دیتا اور شکر گذار اور قانع" میرا کتبہ مزار ہو جاتا۔

جب اپنی گزشتہ زندگی پر نظر کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمام عمر ایسی نیند میں بسر کی جسمیں یا تو میں ایک خواب سا دیکھتا رہا، یا کسی دامن کوہ میں جہاں میں نے نہ معلوم کتنی کتابیں دیکھ ڈالیں، خیالات سے اپنے دماغ کو بھر لیا، اور لقا دیر دیکھ ڈالیں، اور دور سے آنے والے قدموں کی ایک آواز یا کسی مجمع کا شور سا سنتا

رہا اور جب اس دھندلی اور شفق نما ہستی سے پیدا وار اس گزر جانے والے منظر سے متاثر ہو کر زندگی کی تگ و دو میں شریک ہونے کے لیئے اس تماشا گاہ عالم میں آیا تو معلوم ہوا کہ وقت گزر چکا اور مجھے دیر ہو گئی لہٰذا اب مجھے پھر اپنی کتابوں میں دفن ہو جانا چاہیئے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جوں جوں ہم موت کے قریب ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی اُسکا خیال اور خوف بڑھتا جاتا ہے خون اور جوانی کی امنگوں کی کمی کے ساتھ ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ زندگی گھٹتی چلی جاتی ہے، جب ہم اپنے گردوپیش کی تمام چیزوں کو معرض زوال وخطر میں دیکھتے ہیں، ہماری قوت ہمارا حسن فنا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہماری امیدیں، ہمارے احباب، ہمارے جذبات وتعلقات ہمکو چھوڑتے جاتے ہیں تو ہم بھی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آخر ہم بھی فانی ہیں۔

مینے موت سوا ایک بار کے اور کبھی نہیں دیکھی اور وہ بھی ایک بچہ کی موت تھی اُسکے بشرہ سے سکون ٹپک رہا تھا اور چہرہ پر ایک استقلال نمایاں تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تابوت میں کسی نے موم کا ایک مجسمہ لٹا دیا ہے اور اُسپر معصوم پھول نثار کردیئے ہیں۔ موت کی اُسپر کوئی کیفیت نہیں معلوم ہوتی تھی لبوں کو جنبش تک نہ تھی، نبض میں حرکت کا نام تک نہ تھا نہ آنکھیں دیکھتی تھیں نہ کان سنتے تھے، جب میں نے اُسکی طرف دیکھا تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکو کسی قسم کا دکھ نہیں ہے بلکہ زندگی کے دُکھ پر جو ختم ہو چکا ہے وہ مسکرا رہا تھا اور اسپر حیات ہی کی سی ایک کیفیت طاری تھی۔

ہم کو ہاتھی دانت یا سنگ مرمر کا مجسمہ دیکھکر ایک قسم کی تفریح سی ہوتی ہے، لیکن اس خیال سے ہم کو کبھی تکلیف نہیں ہوتی کہ آخر یہ مجسمہ زندہ کیوں نہیں ہے۔ سانس کیوں نہیں لیتا، بولتا کیوں نہیں؟۔ بات یہ ہے کہ اس سے پہلے وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا، حقیقتاً حیات سے موت کی جانب منتقل ہونے کی وقت اور ہماری قوت متخیلہ میں موت وحیات کا تصادم ہی وہ چیزیں ہیں جو دونوں کے خصوصیات کو ایک دوسرے سے مخلوط کردیتی ہیں اور ہم یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ بچہ جو ابھی ابھی مرا ہے، پھر سانس لینا چاہتا ہے، پھر کھیلنا چاہتا ہے، ادہر ادھر دیکھنا چاہتا ہے لیکن موت کا سرد ہاتھ اسکو باز رکھتا ہے جسنے اُسکی تمام قوتوں کو سلب اور احساس کو مفلوج کردیا ہے اس تغیر حیات وموت پر انسانی دماغ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے جسکو صرف مذہب ہی یہ کہکر مٹا دیتا ہے کہ روح دوسرے عالم کو پرواز کر گئی ہے اور جسم کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ موت کا خیال کرتے وقت ہم بالعموم حیات کا بھی خیال اُس کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے موت ایک خوفناک چیز بن جاتی ہے

ہم یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ موت کا اثر ہم پر کیا ہوگا نہ کہ مردہ پر کیا ہوگا۔

ایک ہیبت ناک جسم بے جان۔ قبر اسکی تنگی، تنہائی اور تاریکی، یہ سب باتیں مل کر قوت متخیلہ کو ایک صدمہ پہونچاتی ہیں۔ لیکن اگر ذرا عقل سے کام لیا جائے تو فوراً یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان تمام چیزوں میں حقیقتاً کوئی چیز ہیبت ناک نہیں ہے ہر شخص اتنا جانتا ہے یا کم از کم بتانے سے سمجھ سکتا ہے کہ اگر لاش کو گرم کپڑے میں لپیٹ کر آگ کے قریب رکھا جائے تو اُسے کوئی گرمی محسوس نہ ہوگی۔ اگر ہزار ہا موم بتیاں جلائی جائیں اور سیکڑوں فانوس روشن کیے جائیں تو اُس کے لیئے کوئی سامان تفریح مہیا نہیں ہوسکتا، اور اگر اُسکو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ آزاد نہ ہوسکے گی، اگر سب لوگ اُن کے گرد جمع رہیں تو اسکا جی نہیں بہل سکتا، اُسکی صورت کا مسخ ہوجانا، چہرہ پر شکن وغیرہ کا پڑجانا کسی دکھ کی وجہ سے نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ ان باتوں کا خیال کرکے بدن پر رعشہ نہ آجائے اسکی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ان واقعات اور حالات کا مقابلہ زندہ کو کرنا پڑتا تو اسکو سخت دکھ ہوتا بس یہی خیال ہمارے دماغ پر طاری ہوجاتا ہے اور دنیا کے رسوم و رواج اس خیال کی وحشت کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں اور موت ایک خوفناک چیز معلوم ہونے لگتی ہے،

موت کے خوف میں ایک اضافہ ہم خود یہ سمجھکر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے مرجانے سے پسماندگان کو بڑا صدمہ پہونچیگا اگر صرف یہ خیال ہی دماغ میں ہوتا تو شاید ہم کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا بجھا کر اس خیال کو محو کردیتے لیکن قبروں کے چند کتبے مثلاً "اے مرے پسماندگان میرے لیئے غم نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ" اس خیال کو ہمارے دماغ میں ایسا مرتسم کردیتے ہیں کہ ہم اُس سے حرفاً حرفاً متاثر ہونے لگتے ہیں اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے مرجانے سے بزم دنیا میں ایسا بڑا خلا ہوجائیگا جو کبھی بھر نہ سکیگا، حقیقتاً یہ صرف اپنی اہمیت کو بڑھانا اور اپنے آپ کو اپنی ہی دردمندی سے تسکین دینا ہے، بزم دنیا تو بڑی چیز ہے، ہمارے خاندان میں یہ خلا اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا ہم سمجھتے ہیں زخم کا اندمال اُس سے کہیں پہلے ہوجایا کرتا ہے جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے، سچ تو یہ ہے کہ بسا اوقات ہماری محبت سے زیادہ ہماری مفارقت خوشگوار ہوتی ہے، ہمارے مرجانے پر بھی لوگ سڑکوں پر اسی طرح چلتے تھے، ہمارے نہ ہونے سے مجمع میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی جب ہم زندہ تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا قیام صرف ہماری ہی مسرت و تفریح کے لیئے ہے اور کائنات کا ہر ذرہ ہمارے ہی وجود سے وابستہ ہے، لیکن ہمارے قلب کی حرکت بند ہوجانے پر بھی دنیا کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا اور دنیا ہمارا خیال اس سے زیادہ نہیں کرتی جتنا ہماری زندگی میں کرتی تھی، لوگ جذبات سے محروم ہیں ہماری مقاربی ذرہ برابر فکر نہیں کرتے

گویا ہم کرۂ قمر کے رہنے والے ہیں مرنے پر زیادہ سے زیادہ کسی ہفتہ وار اخبار یا کسی ماہواری رسالہ میں ہمارا نام ایک بار آجاتا ہے، لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس دنیا کو چھوڑتے ہی ہم کو لوگ اسقدر جلد بھول جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی ہی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کائنات کے ساتھ ہمارا تعلق صرف وہی ہے جو ایک ستانہ کو کسی ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے مگر ہم ایک مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات کے لیئے ہم بھی اُتنا ہی ضروری ہیں جتنا وہ ہمارے لیئے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ایک مُشتِ خاک کو اپنے عناصر گرد و پیش سے جنگ و جدال کرنا یا قدرت سے شکایت کرنا کیا ضرور اس مشتِ خاک کو تو اگر عقل اور زبان حال میسر آجائے تو صرف یہ کہنا چاہیئے کہ "اے عالم فانی، جا، تو اپنی راہ لگ، اور خلا میں اپنے محور پر گردش کیئے جا، ہم اور تو اب کبھی نہ ملینگے۔

عورتوں کی طرح زندگی کا گرویدہ ہوجانا حقیقتاً موجودہ تمدن و تصنع کا نتیجہ ہے، اگلے زمانہ میں لوگ اپنے آپ کو بلا کسی پس و پیش کے خطرات جنگ میں مبتلا کر دیتے تھے، ہلاکت میں ڈالدیتے تھے، جان کی بازی لگا دیتے تھے کسی ایک جذبہ پر سب کچھ قربان کرنے کو طیار ہوجاتے تھے اور اگر اتفاق سے اُن کی بات پوری نہ ہوتی تھی، یا مقصود حاصل نہ ہوتا تھا تو پھر زندگی اُن کو دوبھر ہوجاتی تھی اب ہم ہیں کہ جن کا سب سے بڑا شغل یہ ہے کہ بس بیٹھے بیٹھے غور کرتے رہیں، ناول یا ڈرامے پڑھتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ شاعری کیا کریں۔ قدیم تاریخ اور فسانے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلے لوگ کسی خاص چیز کی تلاش و جستجو میں اسقدر منہمک ہوجاتے تھے کہ اُن کا انہماک جنون کی حد تک پہونچ جاتا تھا، حصول مقصود کے لیئے کوئی ایسی قربانی نہ تھی جسکو وہ بلا تامل نہ کر گزرتے ہوں، تختۂ موت پر وہ اس طرح سوار ہوجاتے تھے گویا تختۂ گلاب پر چل رہے ہیں، اُن کے دماغ پر ایک اور صرف ایک خیال مستولی ہوجاتا تھا اور پھر دنیا کی تمام چیزیں اُن کو ہیچ نظر آتی تھیں، اس قسم کی زندگی میں قوت متخیلہ سے زیادہ کام لیا جاتا تھا کام کرنے کی ایک قوت ہوتی تھی، ایک کیف ہوتا تھا، ایک جوش ہوتا تھا بخلاف اسکے ہماری زندگی کیسی بے کیف زندگی ہے لیکن ہم ہیں کہ جیئے چلے جاتے ہیں۔ کہ یہ مردانگی نہیں ہے کہ تلاش مقصود میں نکل کھڑے ہو اگر کامیاب ہوجاؤ تو فہو المراد، ورنہ نتائج برداشت کرلینا یہ کیا ہے کہ ایک مضمحل، بے رونق و بے کیف زندگی کی تجدید سال بہ سال کراتے رہتے ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ اگلے لوگ موت سے کیوں بے خوف رہتے تھے؟ اس کا سبب مذہب اور صرف مذہب ہوا کرتا تھا یہ مذہب ہی ہے جو موجودہ زندگی کو آیندہ زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ثابت کرتا ہے اور تمھارے سامنے ایک ایسی چیز رکھ دیتا ہے، جس کے سبب سے سپاہی میدان کارزار میں اور عاشق تلاش محبوب میں اپنی جان عزیز دیدیتا ہے اور اُسے مطلق تامل نہیں ہوتا۔

ٹیپو سلطان کے آباؤ اجداد

مغرب کے اہل تحقیق کہتے ہیں کہ غازی اعظم نواب حیدر علی خاں ایک جاہل، بے اصل، غیر خاندانی اور لٹیرا تھا جن دلیلوں سے اُسپر لٹیرے ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے اگر صحیح مان لی جائیں تو مقدونیہ کا سکندر اعظم دنیا کا سب بڑا لٹیرا۔ روما کا جولیس سیزر ایک زبردست قزاق اور فرانس کا نپولین بونا پارٹ ایک عدیم المثل ڈاکو نظر آئیگا۔
رہا جہالت کا سوال تو تمھارے کتنے عالموں نے حیدر علی کی مثال دنیا میں پیش کی اور آکسفورڈ کیمبرج سے کتنے شہزادے حیدر علی کی طرح فاتح و مقنن ہوکر نمودار ہوئے؟ کولار کے مشہور مدرسہ سپہ گری کا یہ بانی اُس مکتبہ عمل اور تجربات و مشاہدات کی اُسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا جہاں سے شیر شاہ اور اکبر اعظم نے درس لیا اور جن کے صحیفہ حیات کا ہر ہر ورق اب تک اس زمین کے بڑے حکمرانوں کے لیئے ایک درس حیات ہے۔
میں میسور کے اس ہیرو کا نسب نامہ بیان کرونگا۔ مگر اسلیئے نہیں کہ نسب انسان کا اصلی شرف ہے اسلیئے نہیں کہ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کا سبق ہم بھول گئے۔ حکمرانی کے لیئے صلاحیت شرط ہے۔ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں اور بھائی بھائی ہوکر رہیں گے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اسلام کا غلام بادشاہت کرتا ہے۔ قطب الدین کا ستارہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیئے باب کا سرنامہ بنکر چمکا اور شمس الدین کا آفتاب کس آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا؟

تا داغ غلامیِ تو داریم ہر جا کہ رویم بادشاہیم

نواب کے خاندان پر وہ قوم منہ نہیں آسکتی جسکے نظام حکومت کی اعلیٰ ترین کرسی پر کفش سازی و گورکنی بھی کوئی دھبہ نہیں لگا سکتی۔ میں اُس قوم سے کلام نہیں کرتا مگر میرا روئے سخن مشرق کی اُس آبادی سے ہے جسکے نزدیک انسان کا حقیقی شرف باپ کی پشت اور ماں کے پیٹ سے آتا ہے اور غالبًا انہیں کے جذبات تنفر کی اشتعال انگیزی اس پروپاغندہ کا مقصد ہے۔
سری رنگ پٹن جاکر اُس مقام کی مٹی اٹھا کر سونگھو جہاں ایشیا کا عظیم الشان جنرل ٹیپو ہزار ہا دشمنوں کے بیچ میں یکہ و تنہا نہایت بہادری سے تلوار چلاتے ہوئے عصر و مغرب کے درمیان شہید ہوا تھا تو تمھیں اُس مٹی سے فاطمی خون کی بو آئیگی۔

نشان حیدری۔ کارنامۂ حیدری اور سب سے اخیر میں حملۂ حیدری نے اُن تمام خفیف حملوں کا جو بہادر نواب

اور سلطانِ شہید کی ارفع و اعلیٰ شخصیتوں پر کئے جاتے ہیں کافی جواب دیا ہے۔ مگر لوگ اب ان کتابوں کو کہاں پڑھتے ہیں۔ قدیم کتب خانوں میں گرد و غبار کی نذر ہو رہی ہیں۔ ہم ذیل میں سلطان مذکور کے گرامی قدر آباؤ اجداد کے مختصر احوال درج کرتے ہیں

یہ سلسلۂ طلائے ناب حضرت حسن بن یحییٰ کے، از اعیان قریش سے مکہ معظمہ جا کر ملتا ہے جو ۲۵ سال کی عمر میں خلیفۃ المسلمین سلطان روم کی طرف سے عہدۂ شرافت پر فائز ہو کر حرمین شریفین کی خدمت سے مشرف ہوئے مقولہ ہے کہ "شرافت کا تخم کبھی برباد نہیں ہوتا" یہ کیونکر ممکن تھا کہ حسن بن یحییٰ کی نسل آسمانی گردشوں کے بعد بھی حیدر علی اور ٹیپو کو نہ پیدا کرتی اور یہ مبارک خاندان گمنام ہو کر فنا ہو جاتا۔ حسن کے دو لڑکے محمد و علی پیدا ہوئے اور اپنی مقررہ زندگی کے ایام گزار کر غمگین باپ کی زندگی ہی میں آخرت کی راہ لی۔ بالآخر خود حسن بن یحییٰ اپنے فرزند محمد کی ایک یادگار احمد بن محمد کو پندرہ برس کا چھوڑ کر سنہ ۸۷۵ھ میں راہیِ ملکِ جاوداں ہوئے، پندرہ سال کی بساط ہی کیا تھی مگر صاحبزادے نے جد کی جانشینی کا حوصلہ کیا یہ حوصلہ پورا نہ ہوا اور حجاز کے ترکی گورنر داؤد پاشا کی سفارش سے سید عبد الملک بن ابو عبد اللہ عہدۂ شرافت پر مامور ہو گئے احمد نے اپنی اس ناکامی پر شکستہ خاطر ہو کر حجاز کو الوداع کہا اور ملک یمن کی راہ لی، وہاں کے حاکم نے انکی عزت افزائی میں کمی نہ کی، عہدۂ جلیلہ پر ممتاز کیا اور کچھ دنوں بعد اپنی لڑکی کو اُن سے بیاہ دیا۔ رفتہ رفتہ ملک میں آپ کا کافی اقتدار ہو گیا چنانچہ جب حکمراں یمن نے انتقال کیا تو اُس کے کمسن فرزند کے ولی مقرر ہوئے۔ تیرہ برس تک آپ نے اسی طرح زمام حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی، جسطرح بیرم خاں نے شہنشاہ اکبر کے ابتدائی دور میں رکھی تھی۔ بالآخر بعض خود غرض حکام نے شہزادہ کے اسطرح کان بھرے کہ سنہ ۹۲۴ھ میں اُس کے حکم سے شیخ سالم نجرانی نے فریب و مکر کے ساتھ احمد کو قتل کر ڈالا، مقتول کا سر شہزادے کے پاس روانہ کیا اور خود احمد کے سیزدہ سالہ فرزند محمد بن احمد کی فکر میں روانہ ہوا، مگر چاہ کن را چاہ در پیش۔ احمد کے غلام قنبر نے راہ میں اسکا خاتمہ کر دیا۔ اور خود بھی قاتلوں کے ہاتھ شہید ہوا۔ ریحان نامی ایک دوسرے غلام نے احمد کے یتیم فرزند کو اس آنے والے خدشے سے آگاہ کیا، اور وہ فوراً خفیہ خفیہ نکل بھاگا، سفر کی مسلسل صعوبتوں کے بعد محمد بن احمد بغداد پہونچے اور یہاں کے ایک دولت مند تاجر طاہر آفندی کے گھر اقامت کی۔ شرافت کا جوہر کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ آفندی نے اپنی نیک سیرت دختر سے ان کا نکاح کر دیا۔ محمد کے تین فرزند ہوئے عبد الغنی، عبد الرزاق، عبد الوہاب، یہ خوشحال گھرانا ایک مدت تک قائم رہا یہاں تک کہ سنہ ۹۶۶ھ میں داعیٔ اجل نے محمد بن احمد کو اٹھا لیا۔ عبد الغنی نے ہوش سنبھالا، شادی بیاہ کیا اور اپنی میراث کو تجارت کا سرمایہ بنایا۔ صلاحیت موجود تھی۔ کاروبار کی سمت مبذول کرنا تھی کہ خدا نے برکت فراواں عطا فرمائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم نے اس پیشہ میں ایسی مہارت پیدا کی کہ بغداد جیسے شہر کے ایک بڑے ممتاز تاجر ہو گئے مگر انکی عمر نے بہت جلد بے وفائی کی۔ سنہ ۱۰۴۷ھ میں حسن نامی ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کو عین حالت طفولیت میں چھوڑ کر

اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ جب تک فرزند ارجمند ہوش سنبھالے تمام خادموں نے خوب خوب گلچھرے اُڑائے اور اپنے آقازادے کی میراث میں نہایت بے دردی سے خورد برد کی۔ جب حسن اس لائق ہوئے کہ دنیاوی معاملات میں قدم رکھیں تو باپ کی میراث سے بجز دو چار ہزار رائج سکوں کے کچھ نہ پایا۔ باپ کی عزت و شہرت اور انکی دولت و ثروت کا حال سنکر اپنی موجودہ پوزیشن پر نظر ڈالی تو بڑی غیرت آئی۔ یہاں تک دل تنگ ہوا کہ اپنی والدہ اور بہنوں کو ساتھ لیے عراق چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا۔ اجمیر آئے۔ حضرت متولی درگاہ نے جب آپ کے احوال سنے تو بے حد احترام و اکرام فرمایا۔ اپنا مہمان کیا اور بعدہ، اپنی دختر سے آپ کا نکاح کر دیا۔ جن سے ایک صاحبزادے ولی محمد پیدا ہوئے۔ کمسنی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نانا نے پرورش کی اور جب سن شعور کو پہونچے تو اپنی پھوپھی زاد بہن سے بیاہے گئے۔ تھوڑے دنوں بعد کچھ خانگی نزاع رونما ہوئی۔ آپ نے اپنی زوجہ و شیرخوار فرزند محمد علی کے ساتھ دیار خواجہ سے رخصت ہو کر دہلی میں توطن اختیار کیا۔ مگر حوادثات زمانہ نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ آپ نے دکن کی راہ لی اور گلبرگہ شریف میں اقامت فرمائی۔ آپ کے فرزند جو شیخ محمد علی کے نام سے مشہور ہوئے بڑے عالم و فاضل ماہر علوم تھے، گلبرگہ کے سجادہ نشین حضرت سید معصوم نے اپنی بیٹی کو آپ کی زوجیت میں عطا کیا۔ محمد علی اپنے والد کے انتقال کے بعد عازم بیجاپور ہوئے۔ وہاں مشائخ پورہ میں اپنی اہلیہ کے بھائیوں کے ساتھ مقیم ہوئے کچھ دنوں بعد آپ نے کرناٹک بالاگھاٹ کا رُخ کیا اور قصبہ کولار میں جہاں اب مشہور و معروف سونے کی کان ہے فروکش ہوئے۔ انہیں کانوں کے آس پاس حیدر علی جیسا گوہر نایاب بھی نمودار ہوا تھا۔ شیخ محمد علی کے چار فرزند ارجمند پیدا ہوئے۔ محمد الیاس سب سے بڑے تھے اور آپ ہی پدر بزرگوار کے انتقال کے بعد اپنے خورد سال بھائیوں کی پرورش کرتے رہے، شیخ محمد کولار میں بیٹھے بیٹھے گھبرا کر آرکوٹ چلے آئے۔ یہاں پیرزادہ برہان الدین تنجوری کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔ شیخ فتح محمد (پدر بزرگوار نواب حیدر علی) نے نواب کرناٹک کی سپاہ میں ایک معزز جگہ حاصل کی۔ اور ایک موقع پر ایسی داد شجاعت دی کہ سارے لوگ عش عش کر گئے۔ نواب نے خوش ہو کر بائیس گانوں کی جاگیر اور اودی کوٹہ کا قلعہ عطا فرمایا۔ اس قلعہ کے آثار بورنگ پیٹ سے چند میل پر اب تک قائم ہیں۔ خداوند عالم نے ملک ہند کی تاریخ میں اس قلعہ کو عجیب سرفرازی عطا کی ہے۔ اس سرزمین پر کتنے قلعے بنے اور ایک مدت تک اپنی شان و شوکت دکھا کر مٹ گئے مگر بعض قلعے ایسے ہیں جن کے تذکروں پر خداوندی و قیوم نے مہر دوام ثبت کر دی ہے، وہ عمارتیں مٹ گئیں وہ در و دیوار اور وہ قصر و ایوان فنا ہو گئے۔ اب نہ سنتریوں کا پہرہ ہے نہ حاجب و دربان۔ نہ مسند ہے نہ قالین مگر تاریخ کے اوراق اور مورخ کی آنکھوں میں وہی شاہانہ

دبدبہ قائم ہے اور رہیگا۔ آج سوا دو سو برس ہو گئے کہ (۱۱۳۰ھ میں) حیدر علی جیسا آفتاب سعادت اودی کوٹہ کے اس قلعہ سے طلوع ہوا تھا مگر اب تک اگر مورخ کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو یہاں کے سنگریزوں کی عظمت کم نہیں ہوئی سے

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنادید عجم را

نواب حیدر علی اور اُسکے بہادر فرزند ٹیپو سلطان کے حالات پر بہتیری ضخیم و مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں، اس جگہ اُن کے کارناموں کا تذکرہ کرنا میرے موضوع سے باہر ہے، البتہ سلطان ٹیپو شہید کے نسب پر مزید روشنی ڈالنے کے لیئے یہ لکھدینا ضرور ہے کہ نواب حیدر علی نے متعدد نکاح کیئے تھے۔ سلطان مذکور کی والدۂ ماجدہ فاطمہ بیگم خاص سادات سے تھیں۔

سلطان مذکور اور آپ کے آباو اجداد علاقۂ میسور و مدراس میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ یاد کیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں شاید کسی بادشاہ کا نام اس ملک کے کسی گوشے میں اس ادب کے ساتھ نہیں لیا جاتا۔ جیسا ان اطراف میں حیدر علی و ٹیپو سلطان کے نام لیئے جاتے ہیں۔ سرزمین ہند پر بہت سے سلاطین درویش صفت۔ عابد و زاہد گزرے ہیں مثلاً شمس الدین التمش۔ ناصر الدین محمود۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمہم اللہ مگر عام طور سے جب ان سلاطین کا نام لیا جاتا ہے تو پہلے انکی حکومت اور بعد میں دینی بزرگی کا خیال آتا ہے مگر باشندگان میسور و مدراس کے سامنے حیدر علی یا ٹیپو (خصوصاً موخر الذکر) کا جب نام لیا جاتا ہے تو سب سے پہلے ان حکمرانوں کی مذہبی عظمت اُن کے ذہن میں آتی ہے، اس علاقہ کا کوئی مسلمان ان بادشاہوں کو "بہادر صاحب" و "سلطان شہید" کے سوا کسی دوسرے نام سے نہیں یاد کرتا۔ اگر ان کے سامنے صرف حیدر علی یا ٹیپو کہا جائے، تو ان کے کانوں کو سخت گراں گذریگا۔

بادشاہوں کا عرس بہت کم سنا گیا۔ مگر بہادر نواب اور سلطان مذکور کا سالانہ عرس تزک و احتشام کے ساتھ ہوتا ہے اطراف و اکناف کے لوگ اور اکثر مشائخ زادے عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ الغرض ایک بادشاہ ایک اسلامی سپہ سالار اور ایک محترم خاندان کے رشید فرزند جس عزت و احترام کے مستحق ہیں وہ آج ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ان اولوالعزم فرمانرواؤں کو حاصل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ انہوں نے اسلام کی حمایت میں ایسے وقت اپنی کمر باندھی جبکہ سارا ملک تباہ ہو رہا تھا، اُسوقت جبکہ ہندوستان ایک کشمکش کی حالت میں پڑا تھا

سلطنت مغلیہ کا چراغ بجھنے کے لیئے ٹمٹا رہا تھا کہیں غیر ملکی خطرہ۔ کہیں ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال دینے کی مخدوش ترین سازشیں۔ سلطنت اسلامیہ کی بے مثل شان و شوکت خاک میں مل چکی تھی۔ شاہان مغلیہ نے جس وسیع حکومت کو بڑے گاڑھے پسینوں سے حاصل کیا تھا آج ٹکڑے ٹکڑے اور پرزے پرزے ہو چکی تھی شوکت اسلام اور مسلمانوں کی رہی سہی عزت و آبرو کو بچانے کے لیئے ان شہروں نے اپنی تلواریں سونتی تھیں۔ انکی شجاعت۔ بیدار مغزی، خدا ترسی، انکی قائم کردہ بندرگاہیں۔ تجارتی منڈیاں، وسیع ترین تعلقات اور دور دراز سفارتخانوں کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ علاء الدین خلجی یا شیر شاہ نے دوبارہ زندگی حاصل کی ہے، کھوئی ہوئی عظمت واپس آنے والی تھی۔ گئی ہوئی عزت لوٹنے والی تھی۔ مگر افسوس اے گردش لیل و نہار تو نے سب کا ناس کیا۔ اور رہی سہی امید بھی ٹیپو شہید کے خون کے ساتھ خاک میں مل گئی۔ سچ ہے۔ اللہ کا نام باقی اور سب فانی۔ انا نحن نرث الارض و من علیہا و الینا یرجعون۔

غلام حسنین ندوی پھلواروی

غزل

اب حال دل نہ پوچھ کہ تاب بیاں کہاں
اب مہرباں نہو کہ ضرورت نہیں رہی

پھر ابتدائے جور کی ساعت قریب ہے
کچھ انتہائے لطف و عنایت نہیں رہی

اک پائمال جور سے امید شکر جور
جا۔ شکر کر۔ کہ تاب شکایت نہیں رہی

میں بدنصیب تیری نگاہوں سے کیا گرا
میری نظر میں بھی مری عزت نہیں رہی

دل اور تیرے خیال سے راحت نہ پا سکے
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

آزاد کیا ارادہ جون و حرا کروں
امر خلاف حکم کی جرأت نہیں رہی

آزاد انصاری

دنیا کا اوّلین بُت ساز

(۱)

زرقا کی خاموش زندگی، جس کی ابتدا خود اُسے بھی معلوم نہ تھی، اور جو **جابلقا** کے سنگستان میں اسطرح گزر رہی تھی، جیسے صرف ایک سایہ متحرک یا ایک غیر محسوس آواز بازگشت، اب اپنے اندر کوئی انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھی، خواہ وہ انقلاب سمندر کی اُسی پرشور موج سے کیوں نہ حاصل ہو۔ جو روز اس کے ساحل اور اسکے غار کے سپید سپید پتھروں سے ٹکرکر کسبِ عریانی کیا کرتی تھی

زرقا، طلوع و غروب کے ارغوانی مناظر میں اب ایک خونیں کیفیت محسوس کرتا تھا، اور چاند اسے ایسا نظر آتا تھا جیسے کوئی عریاں لاش۔ جنگل کی چڑیاں جو اس کے چاروں طرف جھاڑیوں اور درختوں میں چہچہایا کرتی تھیں، اس کے دماغ کے لیئے کوئی نغمہ فراہم نہ کرسکتی تھیں۔ کیونکہ اب وہ شیریں سے شیریں آواز میں اپنے لیئے ایک طعن محسوس کرتا تھا، اور اُلجھنے لگتا تھا۔ سمندر کی خوشگوار لطیف ہوا جو ہر وقت موجوں کی چادر کو تہ کرکے کھول کھول دینے کا عجیب منظر پیش کیا کرتی تھی، زرقا کے لیئے صرف چین پیشانی تھی، اب وہ اس زمین و آسمان، اس آب و ہوا، صبح و شام، رات دن، یہاں تک کہ خود اپنی سانس کی نکیاں آمد و شد سے بیزار ہوگیا تھا، اور غار کے دروازہ پر ہر وقت ملول و غمگین بیٹھا رہتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا، اُسے کس چیز نے رنج پہونچا رکھا تھا، اُسے کسکی تلاش تھی، یہ خود اُسکو بھی معلوم نہ تھا۔

(۲)

زرقا، ایک صبح حسب معمول، عالمِ محویت و استغراق میں (گویا کہ وہ اک بُت ہو) سنگ مرمر کی چٹان پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے پتھر سے صدمات ضرب پہونچا رہا تھا، کہ دفعتہً وہ چونک پڑا، اس نے دیکھا کہ مرمر میں اُسکے اس طرز عمل سے ایک انسانی چہرہ بن گیا ہے، جو بے انتہا حسین و دلکش ہے، اس چہرے میں ایک خاص بات تھی، وہ بات جو اُسنے اپنے چہرہ میں نہیں پائی۔ ایک عجیب دلکشی تھی وہ دلکشی جس سے خود اس کا چہرہ بالکل محروم تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور شب و روز کی محنت سے چند دن میں ایک عورت کا ایسا حسین مجسمہ تیار ہوگیا کہ جب کبھی تھک جانے کے بعد کسی ساعت اسکو نیند آجاتی تو وہ اسے خواب میں چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، اور اپنی ساری روح کو اس کے

نورانی چہرہ سے منور و درخشاں پاتا تھا، وہ چونک پڑتا اور اسی عالم استغراق میں اپنے ہاتھ سے اسکو چھوتا، اپنے لبوں سے مس کرتا، لیکن وہ یہ دیکھ کر کیسا مضمحل ہو جاتا کہ اس کا بدن ٹھنڈا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسکے ہاتھ پانوں بدستور سنگیں۔

اب وہ کسقدر بیتاب تھا کہ اس مجسمہ سے کچھ بات کرے، اور وہ جواب دے، اسکو اپنی آغوش میں لے، اور اس کا بدن لچک جائے، اس سے کچھ کہے، اور وہ ہنسنے لگے، بسا اوقات وہ اس خیال سے اس حد تک متاثر ہو جاتا تھا، کہ واقعی اسے زندہ سمجھنے لگتا تھا، اور اس کے پاس جا کر پوچھنے لگتا تھا کہ:۔

"تیرے لب کیوں نہیں کھلتے، کیا مجھ سے برہم ہے؟"

(۳)

مہینے گزر گئے اور زرقا سے اس سنگین عورت نے ایک بات بھی نہیں کی، اب اس کا یہ شوق جنون کی حد تک پہونچ گیا تھا، اور اپنی اس التجا کو آسمان و زمین کی ہر مرئی چیز کے سامنے پیش کر کے رویا کرتا تھا۔

ایک رات جب چاند اپنے پورے عروج اور شباب یاسمیں رنگ کو لیئے ہوئے نکلا تو زرقا اس سے شکایت کرنے لگا کہ:۔

"اے آسمان کی حسین ملکہ تو ہی انصاف کر کہ یہ مجھ سے کیوں بات نہیں کرتی۔ یہ ساحل کی ایک چٹان میں پڑی سو رہی تھیں، کہ میں نے اسکو جگایا، میں نے اس کا سنگین نقاب دور کیا۔ اگر اسمیں کوئی برہم ہونے کی وجہ ہے تو یہ سارا کوہستان تجھ سے کیوں خفا نہیں ہو جاتا، کہ تو اسکی سیاہ چادر چھین کر اسکو عریاں کر دیتی ہے۔ یہ سارا سمندر تجھ سے کیوں نہیں روٹھ جاتا کہ تو اسکی نقاب شب لیکر برہنہ کر دیتی ہے، میں دیکھتا ہوں کہ تجھے دیکھ کر جنگل کے درخت، سمندر کی موجیں، سب ہی جنبش میں آجاتے ہیں۔ پھر اے دیوی کیا یہ تیری حیات فرمائیاں میرے درد کی دوا نہیں ہو سکتیں، کیا تیری چاندنی میں یونہی ہمیشہ تڑپا کروں، اگر یہی مرضی ہے تو مجھے بھی سمندر کی ایک مچھلی بنا دے، کیا تیری روشنی میں یوں ہی ہمیشہ رویا کروں، اگر تیری یہی خواہش ہے تو مجھے بھی کسی چھوٹی سی موج میں تبدیل کر دے"

زرقا، یونہی دیر تک کہتا اور روتا رہا، یہاں تک کہ اسکی آنکھ لگ گئی، صبح کو جاگا تو اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب اس نے دیکھا کہ مجسمہ کا کچھ رنگ بدل گیا ہے، اور اس کا جسم اسقدر سخت نہیں، بلکہ اسے سنگین سمجھ سکیں جب وہ دباتا تھا تو لچک جاتا تھا، اور اسقدر نرم محسوس کرتا تھا، جیسے کیلے کا درخت

(۴)

شام کو جب آفتاب نے دنیا سے رخصت ہونے کے لیئے اپنے ارغوانی سایہ سے دامن کوہ کو دوشت

میں پھیلا دیا، تو زرقا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ:۔

"اے آسمان و زمین کے بادشاہ، اب میں اپنی التجائیں تیرے پاس لیکر آیا ہوں، رات کی ملکہ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ تجھ سے چھپا ہوا نہیں اور شاید اس سے زیادہ اس کے بس کی بات نہ تھی، لیکن اگر تو چاہے، تو سب کچھ کر سکتا ہے تیرے دامن سے میں صرف تھوڑا سا رنگ چاہتا ہوں اور ذرا سی گرمی، اور اگر تو عنایت کرے تو تجھ وہ چیز بھی جس سے تو جنگلوں میں پھلوں کو پختہ کرتا ہے اور سنہرا۔"

زرقا، یہ کہتا ہی رہا اور آفتاب غائب ہو گیا، لیکن وہ دیوانہ وار اچھل پڑا جب اس نے مجسمہ کے رخسار اور سارے جسم میں اپنے بدن کی طرح خون سا دوڑتے ہوئے محسوس کیا، اور اس کے سینہ میں تازگی کا گداز۔

(۵)

مجسمہ میں ہر تغیر کے ساتھ زرقا کی بیتابیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اور اب وہ اپنی التجائیں ہر ہر ذرہ کے سامنے پیش کر رہا تھا، نسیم صبح سے اس نے درخواست کی، تاروں کے سامنے وہ گڑگڑایا، رات سے اس نے خطاب کیا، دن کے سامنے اس نے ہاتھ جوڑے، الغرض جب ایک صبح وہ اپنی التجاؤں کے ساتھ قریب قریب اپنی ساری روح صرف کر چکا، تو بیہوش ہو گیا، لیکن جب اسکو ہوش آیا تو اس حال میں کہ وہ مجسمہ اپنی جگہ پر نہ تھا، بلکہ سرہانے ایک نہایت حسین عورت بیٹھی ہوئی اس کے منتشر بالوں سے کھیل رہی تھی۔

(۶)

زرقا کو اس عورت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ایک زمانہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ساری مسرتیں اسکے لیئے عادت ہو گئیں، اور اس کا ولولہ و شوق روز کا معمول

یا تو اول اول محبت و پرستاری کا یہ عالم تھا کہ کسی وقت اسکو نگاہوں کے سامنے سے ہٹنے ہی نہیں دیتا تھا، کوئی لمحہ ایسا نہ ہوتا تھا جسکو وہ اپنی محبت کے اظہار سے غیر منقوش گذر جانے دیتا ہو، یا رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ وہ گھنٹوں خاموش رہتا تھا، دن دن بھر اسے پرواہ نہ ہوتی تھی کہ وہ کس حال میں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بے پروائی نفرت سے تبدیل ہونے لگی، اور اب زرقا اس سے برہم ہونے کے لیئے اسباب تلاش کرنے لگا، اگر جنگل سے پھل لانے میں اسے کچھ دیر ہو جاتی تھی تو زرقا اس سے خفا ہو جاتا تھا، اور اگر اس سے خدمت میں ذرا سا بھی تامل ہوتا تو زرقا بہت سختی سے پیش آتا تھا، یقیناً زرقا کو اس کے ساتھ محبت تھی۔

. . . . لیکن اسکی معیت میں چونکہ اب کوئی نئی بات نہ تھی، وہ اسکی ساری لذتوں سے آگاہ ہوگیا تھا، اسلیئے زرقا (جیسا کہ مرد کی عادت ہے) اسکی طرف سے بیزار ہوگیا، ادہر زرقا کے ہر طرز عمل کے ساتھ اسمیں ایک غیر محسوس تغیر ہوتا جاتا تھا، اور اسکی ساری تازگی و شگفتگی مضمحل ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ ایکدن زرقا نے انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اسکو مارا تو دفعتہً اسکی نگاہوں سے اک پردہ سا اُٹھ گیا، کیونکہ اس کا ہاتھ کسی ایسی چیز پر لگا۔ جیسے پتھر کی ہو، اور اس کے سخت چوٹ آئی۔ وہ عورت اب پھر مجسمہ ہوگئی تھی، اور اسکی سنگینی کا وہی عالم تھا، جو ابتدائے زمانہ میں پایا جاتا تھا، لوگ کہتے ہیں کہ زرقا وہیں سر پٹک پٹک کر مر گیا، لیکن مجسمہ میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔

(۷)

"اگر عورت کو خود مرد سنگدل بنا دے تو پھر اسکی تلافی مرد کے جان دینے سے بھی نہیں ہو سکتی" یہ ہے وہ تحریر جو اب تک اس مجسمہ کے نیچے کندہ پائی جاتی ہے۔

غزل

جنوں میں چاکِ دامانی یہ حسرت بھی نکلنے دے　　ہمیں ناکامیِ دل پر کفِ افسوس ملنے دے
دلِ درد آشنا مصروفِ گریہ اگر یہ بے حاصل　　یہ چھینٹا ہے عجب چھینٹا نہ بجھنے دے نہ جلنے دے
اُنہیں، نظرِ ضبطِ فغاں کی آزمائش ہے　　سنبھلنے دے ہمیں اے جوشِ غم اب تو سنبھلنے دے
مصیبت ہے نگاہِ شرمگیں کا واسطہ دل سے　　نہ آہِ سرد بھرنے دے نہ منہ سے اُف نکلنے دے
کہاں پھر ہم کہاں پھر کیفِ چشمِ مست اے ساقی　　یہ دورِ آخری ہی چل سکے جب تک بھی چلنے دے
یہی جانباز پروانوں سے ہی محفل میں دلسوزی　　شہیدانِ وفا کو شمع اپنے ساتھ جلنے دے
عبث ہی پند اے واعظ ارے منہ بند رکھا اپنا　　کوئی پیتا ہے پینے دے کہیں ڈھلتی ہے ڈھلنے دے

کسی کی یاد میں اے دلؔ ہمیں یہ عشق جوش افزا
برنگِ شمع جلنے دے مثالِ اشک ڈھلنے دے

دلؔ شاہجہانپوری

استفسارات

نگار کی بعض تحریرات پر شبہات

(ابوالرضا۔ (مولوی) ضیاء اللہ خاں رام پوری)

آپ کی اس تحریر پر جو دربارۂ معجزات وکرامات مارچ کے رسالہ میں شائع ہوئی تھی، میں نے کچھ تنقید وتحقیق کی ہے جوکہ رسالہ "درویش" میں یکم مئی سے زیر اشاعت ہے اب جبکہ مئی کے اواخر میں رسالہ نگار موصول ہوا تو آپ کے جوابات نے جو عنوانات "معجزات وکرامات سے انکار" اور "صدور محال کا امکان" کے تحت میں درج ہیں، مجھکو عجیب خلجان اور چند شبہات میں ڈالدیا جنکو ترتیب وار عرض کرکے آپ ہی کو روانہ کرتا ہوں تاکہ آپکو پھر اس شکایت کا موقع نہ رہے، جوکہ بوقت ملاقات رام پور آپنے مجھ سے کی تھی کہ میں نے اپنے خیالات سابقہ کی آپ ہی کی وساطت سے اشاعت کیوں نہ کرائی۔ امید کہ اب شبہات کو رفع فرماکر مجھکو اور دیگر اصحاب کو بھی مطمئن فرمادینگے۔ اگر اس بحث کو آپ اپنی طرف سے زائد چھیڑنا نچاہیں جیساکہ آپ ظاہر کرچکے ہیں تو صرف میری اس تحریر ہی کو شائع کردیجیئے ورنہ فوراً واپس کردیجیے۔

(۱) آپکی تحریر مارچ اور مئی کے متعددہ ذیل مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ معجزات وکرامات کے کھلم کھلا منکر ہیں۔ (الف) اس قسم کے واقعات جو اولیاء کرام سے منسوب کیئے جاتے ہیں انکی کوئی حقیقت نہیں (ب) اب کوئی ذی علم انسان ان مزخرفات اور خرافیات پر اعتماد نہیں کرسکتا (ج) اسلام نے اس قسم کی شعبدہ بازی اور نظر بندی کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے (د) معجزات کی عدم صدور پر آیہ سے استدلال (ہ) اور اسی کو جناب رسالتماب صلعم کا مسلک قرار دینا (و) اولیاء رحمۃ سے خوارق منسوب کرنے کو انکی رسوائی سے تعبیر کرنا (ز) ناقلین خوارق کو (جنمیں اولیاء کرام اور اکابر علماء ومحدثین وصلحاء مسلمین بھی داخل ہیں) بے علم۔ جاہل۔ فریبی۔ دنیا طلب وغیرہ خطابات سے نامزد کرنا (ح) خوارق کو دور از عقل پھر خلاف عقل کہیں خلاف قانون فطرت بتانا جنکے سبب سے وہ غیر ممکن الصدور ٹھہرائی جائیں (ط) نگار مطبوعہ مئی میں (بلا حوالہ سند) مطلقاً معجزات پیش کرنے پر جناب رسول اللہ کا انکار ظاہر کرنا۔ (اگر ان آیات سے آپ انکار سمجھتے ہیں جن کا حوالہ آپ نے مارچ کے پرچہ میں دیا ہے تو اسپر ہمارے مضمون مطبوعہ درویش یکم مئی میں بحث ہوچکی ہے کہ ان سے یہ مدعا ثابت نہیں ہوتا) اب آپ خود ہی فرمائیں بھلا کوئی شخص بھی تحریرات مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھکر ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ صاف تحریر خوارق کا قائل ومعتقد ہے، کیا یہ سب آپ کے انکار صریح پر دال نہیں خصوصاً (ب) (ج) (د) (ز) جوکہ حقارت

سے بھی بھرے ہوئے ہیں، پھر آپ کا رسالہ مئی میں بڑے زور سے دعویٰ کرنا کہ آپ معجزات وکرامات کے ویسے ہی قائل ہیں جسطرح کوئی دوسرا اور آپکی طرف ان کا انکار منسوب کرنے کو آپ کا ظلم قرار دینا کہاں تک درست اور بجا ہے اور دونوں متضاد اقوال میں وجہ تطابق کیا ہے، ہم تو موٹی سمجھ کے جاہل انسان ہیں اور آپ (بوجہ ان مزخرفات وخرافات بزعم قائل) یہ یقین نہیں رکھنے کے) ذی علم طبقہ اور ائمہ ادب میں سے شمار ہوتے ہیں مگر اتنا تو بتا دیجئے کہ اگر آپ کی مذکورہ بالا تحریرات سے آپ کا انکار ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اسکے برخلاف آپکے قائل ومعتقد ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو آیا یہ ثبوت عبارتاً ہی یا دلالتاً یا اشارۃً یا اقتضاءً یا کم از کم اُن عبارات کے مفہوم مخالف ہی سے ثابت کر دیجئے (حالانکہ بعض مستند علماء اسکو لائق استدلال نہیں سمجھتے ہیں، البتہ مفہوم مخالف کے معنی اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ کسی حکم سلبی سے آپ ایجاب اور ایجابی سے سلب مراد لے لیں تو بیشک ہم ہارے اور آپ جیتے اور الزام انکار آپ پر قطعاً ظلم ہوا) پھر براہ مہربانی ہم کو یہ بھی بتائیے کہ ان تحریرات کا کونسا لفظ آپ کے قائل ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور وہ دلالت مطابقی ہے، یا تضمنی، یا التزامی اور یہ کہ اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی اور پھر یہ کہ وہ لفظ اپنے معنی میں صریح ہے، یا کنایہ اور سب سے آخر میں وہ معنی ظاہر ہیں یا خفی، نص ہیں کہ مشکل، مفسر ہیں یا مجمل، محکم ہیں یا متشابہ

(۲) جواب مندرجہ عنوان "محال کے صدور کا امکان" مطبوعہ مئی میں آپ نے محال عقلی ومحال عادی میں فرق کرکے ان خوارق کو جو محال عادی ہوں جائز الصدور اور ممکن الوقوع مانا ہی (اور ہم نے بھی اپنے مضمون میں جو رسالہ درویش میں بعنوان "ادلہ عقلیہ سے معجزات وکرامات کا ثبوت" زیر اشاعت ہے یہی فرق ظاہر کیا ہی) پھر کیا وجہ کہ حکایات مندرجہ کو خصوصاً اور دیگر جمیع معجزات وکرامات کو عموماً اس بناء پر کہ وہ دور از عقل ہیں بے اصل، حقائق باطلہ (مزخرف) اور حکایات موضوعہ یا لغو (خرافیات) قرار دیا - حالانکہ استبعاد عقلی (جو ترجمہ ہے دور از عقل کا) اور محال عادی دونوں متساوی ہیں اور دونوں کا مصداق ایک ہی ہے مثلاً آپ نے مرد کا بچہ جننا اور بصفحہ ۳۷ ڈاکٹر کا مردے کو زندہ کرنے میں کامیاب ہوجانا زمانۂ حاضرہ کے واقعات کو بوثوق لکھا ہے (اور کچھ زمانہ ہوا میں نے کسی پرچہ میں خود دیکھا تھا کہ فرانس کا کوئی ڈاکٹر مرد کو عورت اور اسکے برعکس عورت کو مرد بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے -) جو کہ حکایات مندرجہ استفسار کے نظائر ہیں پھر کس بناء پر حکایات مذکورہ واجب الرد والانکار ٹھہریں اور کس وجہ سے واقعات جدیدہ قابل قبول والاعتبار

(۳) دور از عقل یا مستبعد العقل محال عادی ہی جو کہ جائز الصدور اور ممکن الوقوع ہوتا ہے اور خلاف عقل جو کہ عقل سلیم کے نزدیک مسلم یا جائز نہو اور یہی مفہوم ہے محال عقلی کا جو کہ غیر ممکن الوقوع اور غیر جائز الصدور ہے پھر آپ نے

ان دونوں کے مفہوموں میں فرق مسلم رکھتے ہوئے خوارق کو ایک جگہ پرچہ مارچ میں دور از عقل اور دوسری جگہ خلاف عقل ٹھہرایا ہے یہ کیونکر صحیح ہوا۔ حالانکہ دونوں کے مفاہیم اور احکام میں تباین کلی ہے۔

(۴) جبکہ صدور خوارق کے آپ صرف اسیقدر قائل ہیں کہ بہت سے بہت آپ کو مادیئین سے سمجھ لیا جائے جو کہ انتہائی درجہ آپکے اعتراف کا ہے اور پھر اتنے قدر کے بھی آپ اپنی تحریر سے خود معترف نہیں معلوم ہوتے بلکہ دوسرا شخص بمقتضائے حسنِ ظن آپ کو اتنا سمجھے پھر آپ کا یہ لکھنا کہ آپ تو ان کے اسیطرح قائل ہیں جسطرح کوئی دوسرا کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتا ہے اور اگر بالفرض ہم آپ کو مادیئین سے بھی مان لیں تو آپ نے حکایات مندرجہ استفسار کی تاویل کیوں نہ کی اور کیوں بے محابا تردید کرنی شروع کر دی۔ حالانکہ انکی تاویل ہو سکتی تھی (تاویل بھی وہ معتبر ہوتی ہے جو کسی وجہ معتبرہ شرع کی بنا پر ہو ور نہ وہ معنے کی تحریف اور کلام کی تکذیب ہے)

(۵) کیا معجزات اور کرامات کا اقرار کرتے ہوئے انکو شعبدہ بازی اور نظر بندی سے تعبیر کر کے انبیاء اور اولیاء کو شعبدہ باز اور ساحر نہیں ٹھہرایا جیسا کہ اس زمانہ کے بھی کفار کہا کرتے تھے اور بصورت انکار کیا آپ نے حقائق واقعیہ سے انکار اور خود اپنے قول کی مخالفت نہ کی اور کیا ان دونوں صورتوں میں آپ نے انبیاء اور اولیاء پر ظلم نہیں کیا اور اسطرح کہاں ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ الآیہ کی وعید کے مستحق نہ ٹھہرے۔

(۶) کیا آپ نے ناقلین پر صراحتاً اور معتقدین خوارق پر لزوماً جہالت، بے علمی وغیرہ کے نہایت ذلیل اور شرمناک الزام نہ لگائے حالانکہ آغاز اسلام سے لیکر اسوقت تک کافۂ مسلمین بلا استثنار سب انکے قائل ہیں اور جنمیں کہ صحابۂ کبار علماء کبار اولیاء کرام رح صلحاء محدثین، اور عقلاء و حکماء اسلام بھی شامل ہیں اور کیا ایسی مقدس ہستیوں پر یہ ظلم کر کے آپ والذین یؤذون المومنین والمومنات الآیہ کی مذمت و ملامت سے بچ سکتے ہیں۔

(۷) پھر معجزات انبیاء اور کرامات اولیاء کو شعبدہ بازی و نظر بندی سے تعبیر کرنا اور ان برگزیدہ و مقدس ہستیوں کے روحانی تصرفات کے مقابلہ میں آجکل کے مادہ پرست اور ظلماتی دماغوں کے مادی اختراعات کو معجزے کا معجزا اور اسلامی لقب دینا نگار مطبوعہ مئی صفحہ ۳) اسکو شان اسلامی کہاں تک روا رکھتی ہے۔ اور منکرین معجزات کو ذی علم طبقہ انسانی میں بمقابلہ معتقدین کے شمار کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

(۸) آپ کا یہ جواب کہ آپ معجزات و کرامات کو کچھ اہمیت نہیں دیتے بلکہ محض معمولی امر تصور کرتے ہیں جن پر نبی کی نبوت یا ولی کی ولایت موقوف نہیں (یا کہ وہ نبوت یا ولایت نہیں کرتے) کہاں تک سوال سے مطابق ہے کیونکہ سوال صرف دو باتوں سے تھا اولاً معجزات و کرامات کے وقوع سے دوسرے آپ کے اعتقاد سے۔ آپ نے قبل اسکے کہ سوالوں

کے متعلق سائل کی تشفی صاف وصریح عبارت سے ہو یہ بحث جو خارج از سوال ہے چھیڑ دی اور واضح وصریح عبارت میں جو کہ شرعی استفسارات خصوصاً اعتقادیات میں لازم ہے جواب کیوں نہ دیا جس سے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی۔

(۹) پھر جبکہ کلام ربانی نے معجزات کو کہیں آیات کہیں بینات کسی جگہ برہان کسی جگہ فرقان کسی مقام پر سلطان مبین کے معزز اور شاندار القاب سے تعبیر کیا ہو تو اسکے مقابلہ میں آپ کا انکو معمولی اور غیر اہم قرار دینا اور صاحب معجزات کے شرف یا نبوت پر دال نہ سمجھا کیا وقعت رکھتا ہے ہم اس بحث کو چھیڑ کر طول دینا نہیں چاہتے اگر ضرورت ہوئی تو آیندہ اس مضمون پر بھی بحث کرینگے بحول اللہ وقوتہ) اور اگر بقول آپ کے یہ نہایت معمولی امر ہے تو آپ ہی اپنے اس مضمون کی تصدیق کے لیئے کوئی ایسی خلاف عادت شہادت پیش تو کر دیجئے جسطرح رسول اللہ صلعم کی نبوت کی تصدیق سنگریزوں نے کی اور جسکو آپ نہایت معمولی امر قرار دیتے ہیں۔

(۱۰) آپ نے یہ کیونکر معلوم کر لیا کہ معتقدین معجزات وکرامات صرف خوارق ہی کو نبوت یا ولایت کا مدار سمجھتے ہیں اور انکی اخلاقی اور عابدانہ زندگی انکی نظر میں وقیع نہیں البتہ ان سے اُن امور ظہور کا جنکو آپ لوگ خلاف قانون فطرت سمجھے ہوئے ہیں اعتقاد ضرور رکھتے ہیں اور انکو بھی وقعت دیتے ہیں پھر آپ کا یہ الزام اینر ظلم نہیں۔

(۱۱) براہ مہربانی ان اکابر علماء کے نام بحوالہ وسند ہمکو بھی بتا دیجئے جو معجزہ شق القمر سے منکر ہیں ہم نے تو جہاں تک کتب متداولہ میں چھان بین کی تو بہت سے اکابر علماء تو درکنار کسی ایک عالم دین کو بھی اس معجزے سے منکر نہ پایا بلکہ بعض اکابر علماء نے تو اس معجزے کو نص قرآنی سے ثابت مانا ہے اور بعض نے اجماع کا بھی قول کیا ہے بعض نے اخبار مشہورہ سے اور بعض نے احادیث صحاح سے ثابت مانا ہے۔ اور بعض کتب تواریخ سے بھی اسکا وقوع پایا جاتا ہے اگر آپکی مراد اکابر علماء سے آپکے آئمہ فلاسفہ ہیں جنکو آپ ذی علم انسان کا لقب دے چکے ہیں تو ایسے علماء آپکے نزدیک معتبر ہوں مگر دنیاء اسلام ان پر ہرگز وثوق نہیں رکھ سکتی۔ (جن صاحب کو اس معجزے کے متعلق تفصیل دیکھنی ہو تو جناب مولوی حکیم رشید الرحمن رام پوری کا رسالہ موسومہ اعجاز خیر البشر فی معجزۃ شق القمر کا مطالعہ کریں موٴلف نے بہت تحقیق وتفصیل سے اس کا ثبوت دیا ہے اور چند شبہات کا بھی بخوبی ازالہ کیا ہے اور چند علماء مستند کی تقاریظ سے آراستہ ہے)

(۱۲) آپکے اس جملہ سے کہ بہت سے اکابر علماء نے اس (معجزہ شق القمر) سے انکار کیا ہے پتہ چلتا ہے کہ یہی علماء دیگر تمامی معجزات سے منکر نہیں بلکہ قائل ہیں پھر جبکہ آپ خود جناب رسول اللہ صلعم سے مطلقاً معجزات پیش کرنے کا

انکار بوثوق و بلا اختلاف ثابت کر رہے ہیں پس یا تو درحقیقت رسول اللہ سے یہ انکار ثابت نہیں جیسا آپ کا خیال ہے ورنہ اکابر علماء میں سے کوئی معجزات کا قائل نہ ہوتا۔ یا بفرض اگر ایسے انکار ثابت ہے تو وہ علماء اعلاء اکابر و مستند میں داخل نہیں ہو سکتے جیسا کہ آپ نے ان کو ایسا لکھا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ مخالف قول رسول اللہ صلعم کے، صدور معجزات کے منکر نہیں بلکہ قائل ہیں۔

یہ میرے چند شبہات ہیں جنکو میں نے بغرض اطمینان قلب آپ پر ظاہر کر دیا امید کہ تسلی بخش جواب عنایت فرما کر مطمئن فرما دیجئیگا۔"

(نگار) آپ کے اعتراضات یا شبہات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض نتیجہ ہیں صرف غلط فہمی کا اور بعض کا تعلق ہے تعبیر ناقص سے (جسے میں اپنی طرف منسوب کرونگا) لیکن آپ کی ساری تحریر پڑھ لینے کے بعد میں یہ سمجھنے پر بھی مجبور ہوں کہ "معجزہ و کرامت" کے مسئلہ میں میرے خیالات ضرور آپ سے مختلف ہیں اور اس حالت میں کہ آپ کی طرف سے یہ "ایراد" پیش ہوا ہے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے معتقدات اس باب میں نہایت واضح طور پر بیان کر کے، آپ سے "ارشاد و ہدایت" کی تمنا رکھوں کہ میں ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ حق کی جستجو کیا کرتا ہوں اور ایک لمحہ کے لئے بھی میں "حقیقت و صداقت" سے روگردانی کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا، لیکن قبل اس کے کہ میں اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے اعتراضات کے اس حصہ سے فارغ ہو جاؤں جنکا تعلق میرے نزدیک غلط فہمی سے ہے،

سب سے پہلے مارچ کے نگار میں ایک صاحب نے دریافت کیا کہ "حضرت غوث الاعظم سے بعض عجیب و غریب واقعات منسوب کئے جاتے ہیں (مثلاً مردے کو زندہ کرنا، لڑکی کو لڑکا بنا دینا وغیرہ) آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "اس قسم کے واقعات (یعنی ایسے واقعات جن کا صدور عقلاً محال ہے) جو اولیاء کرام سے منسوب کئے جاتے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے"

آپ کی تحریر سے جو "درویش" میں شائع ہوئی، اور نیز تحریر زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی صدور معجزہ و کرامت کو صرف ان واقعات سے متعلق سمجھتے ہیں جو عقلاً محال نہیں ہیں، یعنی وہ باتیں جن کے وقوع عقل محال سمجھتی ہے آپ کے نزدیک بھی احاطۂ معجزہ و کرامت سے باہر ہیں، اسلئے اگر میں نے مارچ کے نگار میں ایسے ہی واقعات کے متعلق یہ جواب دیدیا کہ یہ باتیں سراسر "مزخرفات و خرافیات" سے وابستہ ہیں یا یہ کہ اولیاء کرام سے ایسے واقعات کو منسوب کر کے انہیں ارباب عقول کے طبقہ میں رسوا کرنا ہے تو گیا جرم کیا بلکہ کسی بزرگ کے ساتھ ایسے واقعات کی نسبت دینا جو حقیقتاً وقوع

میں نہیں آسکتے کسی اہل علم کا فعل ہو سکتا ہے اور کیا ایسا کرنے والے جاہل نہیں کہلائے جائیں گے،

آپ کو شاید مجھ سے زیادہ اس بات کا علم ہوگا کہ آجکل پیشہ ور واعظ جنھیں علم دین سے بہت کم آگاہی ہے اور جو حقائق مذہب سے بالکل بیگانہ ہیں اسی قسم کی خلاف عقل باتیں اولیا کرام سے منسوب کرکے طبقۂ عوام کو متاثر کرتے ہیں اور چونکہ انکا مقصود اس اثر ڈالنے سے صرف حصول زر ہوتا ہے، اسلیئے انہیں اسکی کیا پرواہ ہو سکتی ہے کہ وہ دین میں کیسا رخنہ پیدا کر رہے ہیں اور ایسی روایات بیان کرکرکے جو صرف انہیں جیسے دنیادار و زر پرست لوگوں کی وضع کی ہوئی ہیں اور جنپر کوئی ذی علم انسان اعتماد نہیں کر سکتا، وہ مذہب کو کسقدر رسوا کر رہے ہیں، بہرحال مارچ کے نگار میں میرا روئے سخن ایسے ہی لوگوں کی طرف تھا اور اس باب میں شاید آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔

اس کے بعد مئی کے رسالہ میں اتفاق سے دو استفسار اور آگئے (جو "معجزہ وکرامات سے انکار" اور "صدور محال" کے عنوان سے درج کئے گئے ہیں) ان کا جواب اگر آپ غور سے ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ میں نے پھر اسی خیال کو بہ تبدیل الفاظ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا کہ جو باتیں عقلاً محال ہیں ان سے معجزہ وکرامت کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور جو باتیں عادتاً محال ہیں وہ حقیقتاً امکان کے تحت میں آتی ہیں اور اسلیئے ان کے وقوع سے اگر معجزہ وکرامت کو ثابت کیا جا سکتا ہے تو میں بھی اُسے تسلیم کرتا ہوں۔

میں نے اگر کسی جگہ یہ لکھا ہے کہ میں معجزہ وکرامت کا قائل ہوں تو اس خیال کے ماتحت، اور اگر انکار کیا ہے تو اسی اصول کی بنا پر۔ البتہ سلسلۂ تحریر میں ایک جگہ میں نے یہ ضرور ظاہر کیا ہے کہ شق قمر کو بعض اکابر علماء معجزہ تسلیم نہیں کرتے، اور رسول اللہ نے کبھی معجزہ پیش کرنے سے انکار کیا ہے اور یہیں سے میرے آپ کے درمیان اختلاف شروع ہوجاتا ہے، اسلیئے آپ کے شبہات کے جواب میں اب میرا فرض صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جو امور میرے آپ کے درمیان مابہ النزاع ہیں ان کو صاف کروں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع پر آؤں چند ضمنی مباحث سے گزرنا ضروری ہے، اور اگر تفصیل کا موقعہ نہ ہو، تو بالاجمال ان کا ذکر لازم ہے۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ معجزہ کا اصطلاحی مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ شرح مواقف میں معجزہ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ المعجزۃ عندنا ما یقصد بہ تصدیق مدعی الرسالۃ وان لم یکن خارقاً للعادۃ۔ یعنے علامہ سید شریف کے نزدیک معجزہ وہ چیز ہے جس سے مدعی رسالت کی تصدیق مقصود ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ خارق عادت بھی ہو، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر خارق عادت ہونے کی شرط کو ضروری نہ قرار دیا جائے، تو پھر اسمیں اعجاز کی کونسی صورت باقی رہتی ہے اور ایسی بات کا صدور کیونکر تصدیق رسالت کے لیئے مفید ہو سکتا ہے، اسلیئے تمام علماء اسلام

نے معجزہ کو خارق عادت ہونا ضروری قرار دیا ہے، اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خارق عادت ہونے سے کیا مقصود ہے۔

اگر "خارق عادت" سے مراد کسی ایسے فعل کا ظہور رہے جو "قانون قدرت" کے مخالف ہو تو قابل تسلیم نہیں کیونکہ اسکی تردید خود نصوص قطعیہ سے ہوتی ہے کلام اللہ میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو چیز جس اندازہ پر پیدا کی گئی ہے اسمیں تبدیلی نہیں ہو سکتی مثلاً:۔

قل کل یعمل علی شاکلتہ ــــــ فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا ــــــ خلق کل شیئ فقدرہ تقدیرا کل شیئ عندہ بمقدارہ" کی تفسیر میں امام رازی نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز ایک مخصوص اندازہ پر ہے اور اسکی حالت یہ ہے کہ "لا یجاوزہ ولا ینقص عنہ"

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اسی سلسلہ میں ظاہر کیا ہے کہ "جرت عادۃ اللہ تعالے ان لا تنفک لخواص عما جعلت خواص لہا" (یعنی خدا کی عادت ہے کہ وہ اشیاء کے خواص کو نہیں بدلتا)

اسلیئے "خوارق عادت" سے مراد ایسے افعال ہونگے جو عادتاً ظہور میں نہیں آتے، لیکن ان کا حدوث ممکن ہے اور چونکہ ایسے افعال کے حدوث کے لیئے اسباب کا ہونا ضروری ہے، اسلیئے انہیں کوئی کیفیت اعجاز پیدا نہیں ہوتی جب اسباب پیدا ہو جائینگے، ان کا ظہور ہو جائیگا۔ خواہ وہ اسباب کسی نبی کی دعا سے پیدا ہوئے، یا غیر نبی کی کاوش سے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ان اسباب کا ظہور کسی غیر نبی کی کاوش سے نہیں ہو سکتا، ہم اس کے ماننے کے لیئے طیار نہیں، کیونکہ اسی طرح کے نادر الوقوع باتیں یوں بھی بغیر کسی نبی یا ولی کی دعا کے اسباب فراہم ہو جانے پر کبھی کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

اس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر معجزات کو محالات عقلیہ سے متعلق سمجھا جائے، تو خود نص قطعی سے اسکی تردید ہوتی ہے اور اگر محالات عادی سے وابستہ کریں تو معجزہ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور نہ اُسے تصدیق رسالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی تفہیمات الٰہیہ میں یہی لکھے ہیں کہ "انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم یترک الاسباب قط ومن یترک ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"

اس کے بعد یہ امر بحث طلب ہے کہ معجزہ مُثبت نبوت ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اسے مثبت نبوت کہتے ہیں اور بعض کو اس سے انکار ہے۔ معلوم نہیں آپ کا خیال اس باب میں کیا ہے۔ اگر آپ مثبت نبوت نہیں کہتے تو اسکی اہمیت آپ کے نزدیک بھی ضعیف ہے اور اگر مثبت نبوت قرار دیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت اسکو مستلزم ہے یا نہیں، اگر صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی طرح آپ بھی اُسے لازم نہیں

قرار دیتے تو نبوت سے خارج ہونا ظاہر ہے اور اگر ضروری قرار دیتے ہیں تو نصوص قطعیہ اس کے خلاف ہیں اور خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود کفار کے معجزہ طلب کرنے کے آپ نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ میں وہ آیات یہاں نقل کرتا ہوں:-

وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او یکون لنا جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملائکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ قل سبحان ربی ہل کنت الا بشرا رسولا وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون

(سورۂ بنی اسرائیل - آیات ۹۲ - ۹۵)

(کفار نے رسول اللہ سے) کہا کہ ہم تیرے اوپر ایمان نہ لائینگے جب تک تو زمین سے ہمارے لیئے چشمہ نہ جاری کر دے، یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تو اسمیں بہتی ہوئی نہریں نہ نکالے یا یہ کہ تو آسمان کے ٹکڑے کر ڈالے، یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آوے، یا یہ کہ تیرے لیئے کوئی آراستہ مکان ہو یا یہ کہ تو آسمان پر چڑھ جائے، اور ہم تیرے افسوں پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب ہم پر نازل نہ ہو جسے ہم پڑھ لیں (سو، اے رسول) کہدے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں تو کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان بھیجا ہوا (اور خدا نے فرمایا کہ) نہیں بھیجا ہمکو آیات کے روکنے سے مگر یہ کہ جھٹلایا انہیں اگلے لوگوں نے۔

اگر معجزہ کا پیش کرنا داخل نبوت ہوتا یا اگر نبوت مستلزم معجزہ ہوتی تو ایسی صورت میں کہ کفار آپ سے معجزہ طلب کر رہے تھے، یہ جواب ہرگز نہ دیتے کہ "سبحان ربی ہل کنت الا بشرا رسولا"، بلکہ اُن کے مطلوبہ معجزوں میں سے کسی نہ کسی معجزہ کو ضرور پیش کرتے۔

اگر آپ اس مسئلہ میں زیادہ تفصیل کی ضرورت خیال کریں تو قاضی ابو الولید محمد بن رشد کی مشہور تصنیف کتاب الکشف عن مناہج الادلہ فی عقاید الملۃ ملاحظہ کیجیئے، جسمیں نہایت دلائل سے یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ معجزہ مثبت نبوت نہیں ہے۔

مارچ کے نگار میں، میں نے سورۂ عنکبوت کی اس آیت کو:- "وقالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ قل انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین"، اس استدلال میں پیش کیا تھا کہ رسول نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیا اور اب پھر اسی کو پیش کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کفار کا یہ کہنا کہ "ان پر (یعنی رسول اللہ پر) کیوں اللہ کی طرف

سے نشانیاں یا معجزے نہیں اتارے گئے" اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ رسول اللہ نے اس سے قبل بھی کوئی معجزہ پیش نہیں کیا تھا، اور کفار ایسا کیوں کہتے اور کیا رسول اللہ کا اس کے جواب میں یہ فرمانا کہ انما الآیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین (یعنی نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں میں تو صرف تمھیں علانیہ ڈرانے کے لیے آیا ہوں) اس امر کا ثبوت نہیں کہ آپ معجزہ پیش کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

یہ درست ہے کہ اس آیت سے مطلق معجزہ کی نفی نہیں ہوتی اور میں بھی یہ نہیں کہتا کہ معجزہ سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے، لیکن اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے رسول نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا اور یہی میرا اصل مقصود تھا کہ جب ہمارے رسول اللہ کا مسلک یہ تھا تو پھر اولیاء کرام سے ایسی باتوں کو منسوب کرنا جو عقلاً محال ہوں کہاں تک درست ہو سکتا ہے

رسول اللہ کا اگر کوئی معجزہ تھا تو صرف قرآن پاک تھا (اور ہے) جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کے بعد والی آیت سے ثابت ہوتا ہے :-

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلیٰ علیھم ان فی ذالک لرحمۃ وذکریٰ لقوم یومنون

کیا کفار کے لیے یہ کافی (نشانی یا معجزہ) نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے اور جس میں ایمان والوں کے لیے رحمت و نصیحت پائی جاتی ہے۔

اسی ضمن میں لفظ آیت و آیات کی بحث بھی غور طلب ہے لیکن میں یہاں اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اصل موضوع سے اس کا زیادہ تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس لفظ کا استعمال کلام مجید میں مختلف موقعہ و محل پر ہوا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا مفہوم بھی مختلف ہے، لیکن اس سے مراد صرف علامت و نشانی ہے کہیں معجزہ مقصود ہے اور کہیں نصائح و مواعظ۔

مئی کے نگار میں ضمناً میں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ بعض اکابر علماء کو معجزہ شق القمر سے انکار ہے چنانچہ آپ کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ میں کسی ایک ہی عالم دین کے انکار کو ثابت کردوں۔ چنانچہ میں ایک ایسے عالم دین کا حوالہ دیتا ہوں جسکو آپ بھی میری طرح اکابر علماء میں شمار کرتے ہوں گے اور جس نے نہ صرف معجزہ شق القمر سے انکار کیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف ظاہر کردیا ہے کہ کلام پاک میں اس نوع کے کسی ایک معجزہ کا بھی ذکر نہیں ہے۔

اگر مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی تفہیمات الٰہیہ جناب کی نگاہ سے گزری ہوگی تو آپ نے یہ عبارت بھی اسمیں ملاحظہ فرمائی ہوگی کہ :-

فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء

(رقم زدہ جعفری)

ملاحظات

۱۔ سنہ ۲۵ء سے آپ نگار کو کس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں؟

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نگار اپنی طباعت و کتابت، ضخامت و ترتیب، نقوش و تصاویر کے لحاظ سے (بغیر اس کے کہ قیمت میں کوئی اضافہ کیا جائے) موجودہ حالت سے دو چند ترقی کر جائے، تو آپ شروع دسمبر تک ایک ایک خریدار فراہم کر دیجئے، جو آپ کے لئے بے انتہا آسان امر ہے، ابھی دو مہینے کا زمانہ باقی ہے اور آپ کو اس عرصہ میں ایک قطعی فیصلہ کر لینا چاہیئے۔

۲۔ اس مہینہ سے میں نے ایک مسلسل فسانہ "ایک شاعر کی محبت" کی عنوان سے شروع کیا ہے، کوشش کرونگا کہ دسمبر تک ختم ہو جائے۔

۳۔ جناب لطیف کچھ زمانہ سے پریشان خاطر ہیں، اسلیئے دو مہینے نگار کے ان سے خالی گزر گئے، امید ہے کہ موانع جلد دور ہو جائیں گے اور آیندہ اشاعت میں "ادب لطیف" آپ ملاحظہ فرما سکیں گے۔

۴۔ "شہاب کی سرگزشت" اسقدر مقبول ہوئی اور علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیئے اتنے خطوط موصول ہوئے کہ مجبوراً ہم کو اسکی کتابت جداگانہ شروع کرانی ہی پڑی غالباً دسمبر تک کتابت و طباعت کے مراحل طے ہو جائیں گے۔

گہوارۂ تمدن

اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے پہلی تصنیف جسمیں ہر رخانہ کاوش سے کام لیکر ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کا ارتقاء جنس لطیف کا کسقدر ممنون ہے الہ آباد یونیورسٹی اور حکومت نظام میں بسلسلہ کتب انعامی منظور ہو چکی ہے۔

قیمت عہ علاوہ محصول

منیجر نگار بھوپال سے طلب کیجئے

انشاء عالیہ

کا بے نظیر مجموعہ اور ادب لطیف کا بے مثل گلدستہ،

نگارستان اگر آپ نے اب تک ملاحظہ نہیں فرمایا تو ابھی موقعہ ہے کہ آپ عہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر یا بذریعہ وی پی طلب فرما لیں،

اس مجموعہ میں حضرت نیاز فتحپوری کے بہترین ادبی معجزات آپ کو نظر آئینگے، جو دوسری جگہ میسر نہیں آسکتے۔

منیجر نگار بھوپال

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۸۸ اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

نگار

جلد ۶	ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء	شمار ۳

باشندگانِ قافِ کی خودداری و شجاعت

اور

مسلمانوں کی اولین جمہوریت کا قیام

دوران جنگ میں اور جنگ ختم ہونے کے بعد جو پیچیدگیاں مملکت روس میں پیدا ہوئیں اور جو سیاسی اختلافات سلطنت زار میں پیدا ہوئے، ان کی مثال کسی دوسرے ملک میں مشکل سے نظر آسکتی ہے۔ نگار کے گزشتہ نمبروں کے مطالعہ سے واضح ہوگیا ہوگا کہ روس کی موجودہ حکومت کیسے دشوار گزار مراحل طے کرنے کے بعد قائم ہوئی اور بالشویک نظام سلطنت کتنی قربانیوں کے بعد استوار ہو سکا۔

ہم نہیں کہتے کہ بالشویت دنیا میں صرف امن و سکون ہی کا پیام لائی اور نہ کوئی شخص یہ دعوی کر سکتا ہے کہ اس کا کوئی تاریک پہلو نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زاریت کی مستبد و جابر حکومت نے جو صدیوں سے وہاں کی قوموں کو پامال رکھا تھا، اس کا جواب صرف بالشویت ہی ہو سکتی تھی اور اسی کی برکت تھی کہ وہاں کا ایک ایک فرد جذبات آزادی سے سرشار نظر آنے لگا۔

بہت سے لوگ وہاں اصول بالشویت کے مخالفت پر بھی آمادہ ہوگئے، اور بالشویک حکومت نے بھی اُن کی سرکوبی میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اسی کے ساتھ وہاں مختلف خیالات کی مختلف جماعتوں نے عام برہمی بھی پیدا کر دی، لیکن حریت و آزادی کے خیال سے کوئی غافل نہ تھا اور چھوٹی سی چھوٹی ریاست بھی اپنی جگہ خود مختار ہو جانے کے لیئے ہات پانوں مار رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں صوبۂ قاف نے بھی بالشویت کے مظالم و قتل عام کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا اور یہ فخر غالباً مسلمانوں کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے وہاں اپنی جمہوریت قائم کی اور شدید ترین مخالف اسباب کی موجودگی میں انہوں نے اپنی خودداری کا ثبوت دیکر آخرکار آزادی حاصل کرلی۔

جب زار معزول ہوا اور بالشیوک حکومت قائم ہوئی تو اہل قاف نے محسوس کیا کہ انکی آزادی ہنوز مسلوب ہے اور انقلاب روس اُن کے درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ اس احساس میں جارجیا اور آذر بائیجان نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ایک "اقطاعی جمہوریت" اور "قاف" قائم کرکے طفلس میں جلسہ کیا، اسمیں تین ممبر ہر ہر قوم کے شامل ہوئے اور چونکہ اس حصۂ ملک میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اسلیئے ان کے نمایندے کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ قیام جمہوریت کی داستان سنیں، مختصراً یہ معلوم کرنا ضروری ہو کہ اُسوقت اہل قاف اور بالشیوکوں کے باہمی تعلقات کیسے تھے، اس وقت باکو کا صوبہ (جس کا صدر مقام طفلس تھا) نہایت کشمکش میں مبتلا تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی عیسائیوں کی غداری سے جو در پردہ لینن کی حکومت سے مل کر مسلمانوں کو بالکل خارج البلد کر دینا چاہتی تھی، بہت پریشان تھی، دوسری طرف بالشیوک حکومت بھی سخت درپئے آزار تھی اور مسلمانوں کی تمام دولت پر قابض ہوکر انہیں عملاً بیدست و پا کر دیا تھا۔

جب حالت ناقابل برداشت ہوگئی اور جارجیا و آرمینیا میں بھی احساس حریت پیدا ہوا تو ایک قومی فوج مرتب کی گئی۔ مسلمانوں نے، جنہیں عہد زار میں فوجی خدمت نہ دیجاتی تھی بلکہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، فوج کی ترتیب میں معقول حصہ لیا اور باکو و الزبتھ پول کو عسکری مرکز قرار دیا گیا۔

بالشیوکوں نے یہ طیاری دیکھ کر اپنی تدابیر میں زیادہ شدت پیدا کردی اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ جو انکی فوج میں شامل تھے، برا سلوک شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دستے برہم ہوگئے۔ بالشیوکوں نے جہازوں سے شہر پر گولے گرانے شروع کئے اور ۱۸ مارچ ۱۹۱۸ء سے لیکر ۲۲ تک مسلمانوں کا قتل عام کرکے انکی دولت کو لوٹ لیا۔ اس قتل و غارت گری میں بڑا حصہ آرمینیوں نے لیا اور باوجودیکہ آرمینیوں کی قومی کونسل اس سے قبل مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کر چکی تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے بغض و تعصب کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں کے تباہ کرنے میں انہوں نے غیر معمولی سختی سے کام لیا۔

بارہ ہزار اسلامی نفوس شہید ہوئے اور ان کے مکانات، مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے اور کتب خانے مسمار کر دیئے گئے، تمام بڑے بڑے سیاسی رہنما گرفتار کئے گئے اور بعض جان بچا کر نکل گئے۔ اگر اسی زمانہ میں ترکستان

کی روسی رجمنٹ بگڑ کر مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیئے آمادہ نہ ہو جاتی تو معلوم نہیں اس قتل عام کا سلسلہ کہاں تک وسیع ہوتا، بہرحال اسطرح سویٹ اثر تمام صوبۂ باکو میں قائم ہوگیا اور وہاں کے تمام بنکوں، باغوں، زمینوں اور مال و اسباب پر ان کا قبضہ ہوگیا، اسی کے ساتھ کوبا اور شماخا میں آگ لگادی گئی، داغستان پر تسلط قائم ہوا اور عام طور پر مسلمانوں سے بیگار لی جانے لگی۔

پھر چونکہ برسٹ لٹوسک معاہدہ کی رو سے قارس، باطوم اور اردہن روسی حکومت نے ترکوں کو دیدیا تھا اور وہ اپنی فوجیں یہاں قبضہ کرنے کے لیئے بھیج رہے تھے اسلیئے جارجیا نے جرمنی سے گفتگو شروع کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور ۲۸- مارچ ۱۹۱۸ء کو آذربیجان نے بھی اس کا تتبع کیا۔ فتح علی خاں جو مجلس وزراء کا صدر تھا کابینہ متعین کرنے کے لیئے مامور ہوا اور چھ ماہ کی مہلت دیگئی تاکہ اسکے اندر دستوری حکومت کا نظام مقرر کردیا جائے۔

یوں تو ۲۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو الزبتھ پول میں جمہوریت آذربائیجاں کا اعلان ہوگیا اور نئی مشروطی حکومت قائم ہوکر کونسل کے پریسیڈنٹ نے اُن تمام ریاستوں کے متعلق اپنے فرائض انجام دینے شروع کردیئے جو آذربائیجان کی خود مختار جمہوریت کے تحت میں قائم ہوگئی تھیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ اس نئی حکومت کے سامنے بہت سے مشکلات حائل تھے۔ آرمینیا کی بالشیوک جماعت باکو کی اب تک مالک بنی ہوئی تھی اور اپنے اقتدار کو چاروں طرف وسیع کر کے آذربائیجان جارجیا اور آرمینیا کی حکومت کو تباہ کردینا چاہتی تھی تاکہ سارا علاقۂ قاف سویٹ اثر کے ماتحت آجائے، لینن نے اس جماعت کے سردار کا لقب اسی لیئے ہائی کمشنر قاف رکھا تاکہ وہ زیادہ قوت کے ساتھ کام کرسکے۔ دوسری طرف مشہور جنرل اینڈرینک نے جو بظاہر ائتلاف ثلاثہ کا دوست بنا ہوا تھا، ترکوں سے شکست کھا کر اضلاع نارسٹوں اور زنگزور کو تباہ کرنا شروع کردیا اور اپنے آپ کو ہائی کمشنر قاف کا ماتحت ظاہر کیا، اس کے بعد وہ آرمینین بالشیوک افواج کے ساتھ ملنے کے لیئے آگے بڑھا جو انلاچ کی طرف بڑھتی آرہی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شورسک (داغستان) سے لیکر موسولی تک (۲۶۰ کیلو میٹر) ریلوے لائن روسی افواج کے قبضہ میں آگئی اور سیکڑوں گانوں تباہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو تہ تیغ کردیا گیا۔

باکو کے جنوب میں بالشیوک بیڑہ ساحل پر گولہ باری کررہا تھا تاکہ سلیم اور لنکوران پر قبضہ ہوجائے اور اسطرح پچاس سے زائد گانوں اس نواح کے بھی آگ کے نذر ہوگئے، اس سول وار کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان آبادی کو فنا کردیا جائے اور جمہوریت آذربائیجان کو تباہ و برباد۔ چونکہ حکومت آذربائیجان اس فتنہ کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی اسلیئے اسنے ترکوں سے مدد طلب کی جنگی فوجیں سرحد پر پڑی ہوئی تھیں ترکوں نے اسکو منظور کر کے ایک معاہدہ

جسکی رو سے آذربائیجان کی آزادی کو تسلیم کیا گیا اور اپنے لیئے وہاں کچھ اقتصادی رعایتیں مخصوص کرائیں ترکوں کی اس مدد سے ان کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے جارحانہ پہلو اختیار کرکے ۱۵ ستمبر ۱۸ء کو باکو پر قبضہ کرلیا، جب فوج باکو میں داخل ہوئی تو سخت جنگ ہوئی اور آرمینوں نے شدید مخالفت کی، لیکن بہرحال باکو پر قبضہ ہوگیا اور کشت و خون کسی نہ کسی طرح بند کیا گیا،

اسی وقت ایک اور جدید خلش پیدا ہوگئی یعنی جرمنی نے بالشویکوں کی طرفداری شروع کردی اور تفلس و باکو کے درمیان ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سلسلۂ مراسلت جاری ہوگیا جس سے صرف بالشویک سردار واقف تھے، جرمنی اہل آذربائیجان کا سخت مخالف تھا کیونکہ ان لوگوں نے جرمنی کی پیشقدمی کو روک کر اسکی مدد کو نامنظور کیا تھا، اور چونکہ باکو میں پٹرول کے چشمے ہیں اسلیئے جرمنی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کا اثر یہاں قائم ہوجائے۔

جب باکو پر اہل آذربائیجان کا قبضہ ہوگیا تو پھر جرمنی نے ایک سیاسی مشن کے بہانے سے فوجی آدمیوں کی بڑی تعداد وہاں بھیجنی چاہی لیکن سرحد پر انہیں روک دیا گیا اور جن جن لوگوں کی جائدادیں بالشویکوں نے ضبط کرلی تھیں انہیں واپس کردیا گیا۔ اس کے بعد ایک قومی مجلس قائم کی گئی اور اسمیں گیارہ نمایندے روسیوں کے، اکیس آرمینا کے، ایک جارجیا کا، ایک پولینڈ کا، ایک اہل جرمنی کا، ایک یہودیوں کا، اور ۴۸ نمایندے مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں کے مقرر کیئے گئے، کابینہ کے چودہ عہدہ داروں میں ۶ عہدے عیسائیوں کے لیئے مخصوص کئے اور غیر مسلم اقلیت کا پورا لحاظ کیا گیا حالانکہ جارجیا اور آرمینیا نے باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ۴ لاکھ ہے ایک عہدہ بھی اپنے کابینہ میں مسلمانوں کو نہیں دیا۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں پریسیڈنٹ ولسن کے مشہور پیام امن پر آذربائیجان کی حکومت نے تار کے ذریعہ سے درخواست کی کہ اس کی آزاد جمہوریت کو تسلیم کیا جائے۔ چونکہ سرزمین قاف اپنی زرخیزی اور تیل کے چشموں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اسلیئے تمام دول یورپ اسپر اپنا اپنا اثر قائم کرنے کے لیئے بیتاب تھے، بالشویکوں نے تو اس مسئلہ میں اپنی انتہائی کوششوں سے کام لیا اور جرمنی نے بھی اپنی پوری قوت صرف کردی، لیکن برطانیہ ابھی تک موقعہ کا منتظر تھا اور قریب کے ویران علاقہ پر اپنی فوجیں جمع کیئے ہوئے مناسب وقت و محل کا انتظار کررہا تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ اہل آذربیجان کو امداد کی ضرورت ہے تو بالشویکوں کے خلاف ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب اتحادیین اور ترکی کے درمیان التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو اتحادی افواج کے کمانڈر جنرل طامسن نے جو ایران میں مقیم تھا، حکومت آذربائیجان کو اطلاع دی کہ حسب شرائط

اب ترکی کو قاف کا علاقہ چھوڑنا پڑیگا، اور اس صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم عارضی طور پر باکو میں آکر بالشوکوں کو حدود قاف سے نکال دیں۔

چونکہ حکومت آزربیجان حقیقی معنی میں امن و سکون چاہتی تھی اور جنرل طامسن نے اسکو یقین دلادیا تھا کہ جمہوریت کے خارجی معاملات میں وہ بالکل دخل نہ دیگا۔ اسلیئے یہ درخواست منظور کیگئی اور ۱۷ نومبر ۱۸ء کو جنرل طامسن اتحادی افواج کو لیکر باکو میں داخل ہو گیا جہاں اس کا نہایت پرجوش خیر مقدم عمل میں آیا، اسکے بعد اُن لوگوں نے جو جمہوریت آزربیجان کے مخالف تھے سازشیں شروع کیں، لیکن جنرل طامسن اور نمایندگان فرانس و امریکہ نے ان سازشوں کی اصل روح کو سمجھکر جمہوریت آزربیجان کو مستقل حکومت تسلیم کرلیا۔

اس جدید حکومت نے جس رواداری سے کام لیکر روسیوں اور آرمینیوں کی جاں بخشی کی، اور انکی خونریزیوں کو جسکی فیاضی سے نظر انداز کیا۔ اسکی مثال تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے، لیکن انھوں نے اپنی شرارت کسی طرح نہ چھوڑی اور آبادی کے آرمینی عنصر نے اپنی تمام قوت مسلمانوں کے خلاف جاری رکھی

جس زمانہ میں حکومت آزربائیجان باکو کو آزاد کرانے کی فکر میں مبتلا تھی، اینڈرینک شہر جارجایا شاوشا کے محاصرہ میں مصروف تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی اسقدر پریشان ہو گئی تھی کہ پانی تک اُسے میسر نہ آتا تھا، لیکن جب باکو کے مسئلہ سے فرصت ہوئی تو حکومت آزربیجان نے شاوشا کا رخ کیا، اور قبضہ کرنے کے بعد امن و سکون قائم کیا، لیکن اس کے بعد جب فوجیں یہاں سے چلی گئیں تو آرمینیوں کی شرارتیں عود کر آئیں اور غریب مسلمانوں پر پھر ظلم توڑے جانے لگے۔

آخر کار حکومت آزربیجان نے جنرل طامسن کو اس طرف توجہ دلائی۔ جنرل طامسن نے ایک تار کے ذریعہ سے اینڈرینک کو تنبیہ کی کہ اسے اپنی شرارتیں ترک کردینی چاہیئے لیکن وہ باز نہیں آیا اور جب تک اسنے حدود آزربیجان کو چھوڑ نہیں دیا اس کا انسداد نہ ہوسکا۔

چونکہ جمہوریت آزربیجان تمام دول عظمیٰ سے اپنی حکومت کو تسلیم کرانا چاہتی تھی اسلیئے وہاں کی پارلیمنٹ نے جنوری ۱۹ء میں ایک وفد صلح کانفرنس میں شریک ہونے کے لیئے پیرس روانہ کرنا چاہا لیکن قسطنطنیہ پہونچکر پاسپورٹ حاصل کرنے میں اسے بہت دیر لگ گئی اور ۲۲۔ اپریل سے پہلے وہاں نہ پہونچ سکا۔ لیکن اسکی یہ محنت بیکار نہ گئی اور آخر کار ۱۲ جنوری ۱۹۲۰ء کی تمام دول یورپ نے آزربیجان کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔

۲۵۔ اپریل ۱۹۲۰ء کو پھر باکو میں بالشیوکی خطرات نمودار ہوئے اور حکومت کو الزستیہ پول جلا جانا پڑا بہت سے

ارکان حکومت قتل کئے گئے، اُن کے خانہ ان تباہ و برباد کر دیئے گئے، فوج منتشر ہوگئی اور بالشویکوں نے باکو پر قبضہ کرکے پٹرول کے قطعات پر پھر اثر قائم کر لیا۔ اب حکومت آذربیجان سرحد جارجیا اور المرز پھر باکے درمیان قائم ہے اور جہاں جہاں بالشیوک قبضہ قائم ہے وہاں کی مسلم جماعتیں آزاد ہونے کے لیئے وقتاً فوقتاً ہنگامہ و شورش کرتی رہتی ہیں، لیکن حکومت ماسکو کسی طرح باکو کا قبضہ نہیں چھوڑتی اور اپنی ساری قوت مسلمانوں کی پامالی پر صرف کرتی ہے۔ (ماخوذ)

اطلاع

اگست کی کاپیاں چونکہ میری غیبت میں دیکھی گئی تھیں، اس لئے اُن میں بعض نہایت سخت غلطیاں رہگئی ہیں مثلاً :-

صفحہ ۱۲ میں سترھویں سطر پر ایک شعر کا پہلا مصرعہ غلط ہوگیا ہے، اُسے یوں ہونا چاہئے۔

ہیچ کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط۔

صفحہ ۳۳ میں آخری سطر سے پہلے کی سطر میں سیتاپرکے بجائے سیتاہرن لکھ گیا ہے،

صفحہ ۷۰ سطر ۱۶ میں بجائے استحالۂ عقلیہ کے معائلۂ عقلیہ لکھ گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی کے ساتھ بعض بعض جگہ انگریزی کے الفاظ بھی غلط لکھے ہوئے ہیں، امید ہے کہ ناظرین خود اپنی قوت تمیز سے کام لیکر درست فرمالیں گے۔

(اڈیٹر)

تاج جنتری ۱۹۲۵ء زیر طبع ہے۔ یہ ہندوستان میں سب سے زیادہ تعداد میں چھپتی ہے۔ اس میں اشتہار دے کر فایدہ اُٹھائے وقت بہت کم رہگیا ہے۔ اس لئے جلد جوابی کارڈ بھیجکر نرخ دریافت فرمائے

المشتہر

خواجہ شوکت حسین اسسٹنٹ مینجر دفتر آگرہ اخبار۔ آگرہ

ایک شاعر کی محبت

آج کل قاہرہ کی سرزمین جہاں اب بھی سو عورتوں میں ایک عورت ضرور قلوبطرہ نظر آتی ہے اور جہاں حسن و عشق سے بعید ترین تعلق رکھنے والا واقعہ بھی فضا میں گرمی پیدا کر دیتا ہے، جدید اثری انکشاف کے ذریعہ سے معمور ہے اور کوئی مجلس ایسی نہیں جس کا مخصوص موضوع گفتگو ملکہ توت انخ امون کی ذات نہ ہو، اگر موزخوں کی جماعت میں اس کے عہد تاریخ سے بحث ہو رہی ہے، تو شعراء اس کے متعلق اپنی منظومات مرتب کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ اگر روحانیین کے سامنے اپنے بہت سے مسائل مابعد الطبیعت پیش کر دیے ہیں تو صناعوں کی جماعت میں فن حنوط کی بحث کو زندہ کر دیا ہے اور اگر نقاشوں کے حلقہ میں اس لاش کی تصویریں بنانے کے لیے ہیجان پیدا ہے تو بعض عالم خیال میں زندگی بسر کرنے والے اپنی راتیں اسی تصور میں صرف کر دیتے ہیں کہ وہ بھی کیا زمانہ ہوگا جب یہ ملکہ اپنی تمام حشمت جمال اور شوکت شباب کے ساتھ رونما ہوتی ہوگی اور اس کے ہزاروں ایسے پرستار، جن کے جذبات پرستش بھی لفظانہ بن سکے ہوں گے، اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہونگے اس حال میں کہ وہ ان میں سے کسی ایک پر نگاہ غلط انداز بھی نہ صرف کرتی ہوگی۔

شام کا وقت ہے اور قصر الدوبارہ کا وہ مشہور قہوہ خانہ، جہاں کا قیمتی اسباب آرائش اور شائستہ ترین انتظام امراء زادگان مصر کے علاوہ کسی اور کو دعوت ہی نہیں دیتا، نہایت تیزی کے ساتھ بھرتا جا رہا ہے، سڑک سے گزرنے والی ہر شاندار موٹر یہاں پہونچکر ٹھہر جاتی ہے اور قہوہ خانہ کے کم سن حسین خادم نہایت ادب کے ساتھ موٹر کا دروازہ کھول کر آنے والوں کی پذیرائی کرتے ہیں یہ سلسلہ جاری ہے، موٹروں کی آمد و رفت پورے شباب پر ہے اور قہوہ خانہ کی تینوں منزلوں سوائے ایک آدھ کرسی کے بالکل آباد ہو گئی ہیں

بالائی منزل کے برآمدہ میں جو قہوہ خانہ کا بہترین حصہ ہے، خالدہ، قاہرہ کے ملک التجار ابراہیم کی اکلوتی لڑکی نقاب الٹے ہوئے بیٹھی ہے، اور بادام کے باریک کترے ہوئے لچھوں سے شغل کر رہی ہے، ایک اخبار سامنے رکھا ہوا ہے، اور تفریحاً اسے بھی دیکھتی جاتی ہے لیکن اسکی ہر ادا غیر مطمئن ہے اور اس کی ہر نگاہ بیتاب، وہ ہر منٹ کے بعد مضطربانہ کبھی سڑک کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی دروازہ کی جانب، اُسے انتظار تھا اور اسی انتظار میں اس نے ابتک قہوہ وغیرہ طلب نہیں کیا تھا۔ لیکن کس کا؟ اسے قہوہ خانہ کا صرف ایک خادم جانتا تھا جو باہر صرف اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ وہ آنے والے کو دور سے دیکھ کر جلدی سے خالدہ کو خوشخبری سنائے۔

متمدن ممالک میں ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے خادم طبقۂ امراء اور اسمیں بھی جنس لطیف کے نہایت گہرے رازدار ہوا کرتے ہیں اور اُن کی حیاتِ عشق کے متعلق تمام خدمتیں بدرجہ احتیاط و ہوشیاری سے انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ اس قہوہ خانہ میں احمد جو ایک کمسن گر نہایت ذہین خادم تھا، خالدہ کا رازدار تھا، اور اس راز کی حفاظت کا معاوضہ اُسے کافی سے زیادہ ملا کرتا تھا، وقت گزرتا جاتا تھا اور انتظار کی گھڑیاں ختم نہ ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ شام کی روشنی شفق کی سُرخی میں تبدیل ہوئی اور سُرخی رات کی تاریکی میں، قاہرہ کی سڑکیں بجلی کی روشنی سے منور ہوگئیں اور قہوہ خانہ کا گوشہ گوشہ برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا، بازار کی چہل پہل شباب پر تھی، اور برتنوں اور کانٹے چھری کے تصادم سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُس سے قہوہ خانہ میں بھی ایک عجیب لطیف ہنگامہ برپا تھا، خالدہ اب تک تنہا تھی اور اس کا انتظار مایوسی میں بدلنے ہی والا تھا کہ اُس کا حجرہ جو پردوں کے ذریعہ سے علیحدہ مخصوص کر دیا گیا تھا کھلا اور دروازہ سے احمد کی معیت میں ایک مصری نوجوان داخل ہوا۔

خالدہ جس نے انتظار کی شدت سے پریشان ہو کر دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر وہ اب آئے بھی تو میں کچھ دیر تک ان سے نہ بولوں گی، فرطِ مسرت سے بیتاب ہوگئی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے عہد پر قائم نہ رہ کر بول اُٹھی کہ "کاش آپ بھی سکراتِ انتظار سے واقف ہوتے" جاوید جس کے حسن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کے چہرہ کا سوگوار تبسم تھا، اپنی معمولی بے حسی کے ساتھ اس کے جواب میں صرف "معاف فرمائیے" کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا، خادم قہوہ لینے چلا گیا، جاوید کسی فکر میں مستغرق ہتھیلی پر سر رکھ کر رہ گیا، اور خالدہ، جاوید کے اس سرد جواب سے حزین و ملول ہو کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔

جاوید کا تعلق مصر کے اس ذہین طبقہ سے تھا جسے طبقۂ متوسط کہتے ہیں اور جس کے افراد میں تعلیم کے اثرات بعض اوقات وہ غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیتے ہیں جو دفعتہً ایک گمنام ہستی کو سارے ملک کا موضوعِ بحث بنا دیتا ہے، جاوید جامع ازہر کا فاضل، فرانسیسی و ترکی زبان کا ماہر، اور ادبیات کا بیحد دلدادہ تھا، اس کا باپ ہر چند اسکندریہ کا ایک معمولی زمیندار تھا لیکن اس کا شمار موجودہ عہد بیداری کے باخبر اشخاص میں ہوتا تھا، اُسنے جاوید کی ابتدائی تعلیم کا انتظام اسکندریہ میں کیا، اور پھر تکمیل کے لئے جامع ازہر بھیجدیا، چونکہ یہاں کا نصاب اسکی محنت و ذہانت کے لحاظ سے بہت کم تھا اسلیئے وہ اوقات فرصت میں دیگر علوم کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا اور اپنے دماغی نشوونما میں وہ غیر ملکی ادبیات سے بھی کام لیتا تھا، جامع ازہر کے ابتدائی دو سال کے اندر ہی اسکی متعدد نظمیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں، لیکن تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب اس نے "ابتسامات حزیں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ منظومات شائع کیا

تو مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس نے ایک مخصوص عزت حاصل کرلی، اور امراء کی جماعت میں بھی اکثر جگہ اس کا ذکر ہونے لگا،

جاوید اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک خلوت پسند، گوشہ نشین انسان تھا، اور اسکی ہر ادا سے عجیب و غریب شان استغنا پیدا تھی، ملبوس کی طرف سے بے پروا، لذائذ معیشت و معاشرت کی جانب سے بے فکر، عوائد رسمیہ کی پابندی سے آزاد اور طلب جاہ و ثروت کے خیال سے متنفر تھا، وہ ادب کا دلدادہ تھا، صرف ادب کی غرض سے، وہ شاعری کرتا تھا صرف اسلیئے کہ وہ اس کی غذا روحانی تھی، اور اس نشہ کے بغیر اسکی زندگی تلخ ہوجاتی تھی۔ شہر سے باہر ایک مختصر سا مکان اس کا قیام گاہ تھا، جہاں اس کا کتب خانہ اسکی دنیا تھی، اور اس کا عالم تجرد اس کا تنہا امین و ہمدم، اس کا باپ، اسکی اس ذوق سے خوش نہ تھا، کیونکہ وہ اسے ایک سیاسی شخص بنانا چاہتا تھا لیکن اسے سیاسیات سے حد درجہ نفرت تھی اور اسکی نظمیں جنہیں وہ پارہ ہائے دل کہا کرتا تھا، بجز بیہ حسن و عشق کے سوا اور کچھ نہ ہوتیں، چونکہ باپ نے اسکی امداد ترک کردی تھی اسلیئے اس نے نہایت قلیل معاوضہ پر جامع ازہر کی پروفیسری قبول کرلی اور بغیر اس فکر کے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیئے شاعرانہ زندگی کی کیفیات سکر و مخموری کی آغوش میں اپنے آپ کو سونپ دیا، صورت کے لحاظ سے جاوید کوئی غیر معمولی حسن کا انسان نہیں تھا، اور نہ صحت و توانائی کے لحاظ سے قابل رشک کہا جاسکتا تھا، لیکن مجموعی طور پر اسکی صورت حد درجہ دلکش تھی اور اسکی آنکھوں کی غیر معمولی حمایت حقیقتاً ایک ملتہب شعلۂ عشق نظر آتی تھی، اس کا رنگ سانولا تھا، لیکن اسکی فطری سوگواری نے زعفرانی غازہ اس کے چہرہ پر مل کر اسکو زردی مائل کردیا تھا اور ہر دیکھنے والا اولین نگاہ میں یہ یقین کرسکتا تھا کہ جاوید عشق میں مبتلا ہے، پھر چونکہ ایک عورت کے لیئے اس سے زیادہ جاذبیت کسی امر میں نہیں کہ وہ کسی نوجوان کے اندر احساس عشق کی شدت کو محسوس کرے، اسلیئے جاوید کی قابلیت اس کا ذوق ادب، اس کی شہرت شعری، اسکی وارفتہ ادائیں، اسکی ہر وقت کی بیخودی اور بغیر کسی کے ساتھ اس کے تاثرات عشق کا اس کے چہرہ سے اظہار ان سب نے مل کر اسے جنس لطیف کی توجہ کا آماجگاہ بنا رکھا تھا، اور مشکل سے کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا جب دو چار معرفانہ تحریریں طبقۂ نازک کی طرف سے اسے موصول نہ ہوتی ہوں۔ لیکن یہ بھی کسقدر عجیب بات تھی کہ باوجود ان تمام باتوں کے وہ عشق سے ابھی تک بالکل بیگانہ تھا، اسکی شاعری یقیناً سراسر "نوائے عشق اور ولبیک محبت" تھی، اور اسکی ہستی یکسر الفت و پرستاری، مگر ابھی تک یہ تمام باتیں صرف اس کے خیال سے وابستہ تھیں اور اگر وہ عاشق تھا بھی تو ایک ایسی دنیائے تصور کا جسے خود اس نے پیدا کیا تھا جس شوق و خروش کی تصویر کھینچنے میں اسے لطف آتا تھا، عملی دنیا میں مفقود تھا، اور عورت کی ہر ادائے تلطف اسے بے روح نظر آتی تھی، وہ محسوس کرتا تھا، کہ اکثر حصہ عورتوں کا ایسا ہے جو اسکی شہرت سے محبت کرتا ہے اور بعض جو اسکی ذات سے الفت رکھتی ہیں وہ بھی صرف

اس کے شباب سے متعلق ہے، اسلیئے وہ کبھی کسی کی طرف اپنے کو مائل نہ پاتا تھا وہ ایسی عورت سے محبت کرنا چاہتا تھا جو خود اس سے کوئی غرض وابستہ نہ رکھتی ہو، وہ کہا کرتا کہ جذبۂ پندار جذبۂ پرستش کو ضعیف کر دیتا ہے اور اسطرح ایک عاشق کی وہ شان احتیاج، وہ ادائے فتادگی جاتی رہتی ہے جو عشق و محبت کی جان ہے۔ چنانچہ وہ اس بناء پر ایک تصویر سے، ایک مجسمہ سے تو محبت کر سکتا تھا، لیکن ایک عورت کی طرف سے وہ احتراز کرتا کہ اسکی فراوانی شوق کو اس کی لگاوٹوں سے صدمہ پہونچتا تھا اور مشکل سے وہ کوئی نظم اس دن مرتب کر سکتا جبکی صبح کو کسی خاتون کی محبت آمیز تحریر اُسے ملجاتی۔

طبقۂ نازک میں وہ خالدہ کی طرف زیادہ مائل تھا، لیکن یہ میلان اس کے شباب کی مجبوری کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اخلاق کا اکراہ و اجبار تھا۔ اول اول جب خالدہ نے اس کی نظم "آفتاب سے" دیکھی اور اس کا وہ شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا

ہاں، مرے سینے میں آکر میرے ضبط غم کو دیکھ
سیلِ آتش اپنا لا اور دیدۂ پُر نم کو دیکھ

تو بے اختیار ہوکر اسنے جاوید کو خط لکھا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا، اتفاق سے اس کے چند روز بعد جب جاوید بضرورت ملازمت ملک انجار ابراہیم سے ملنے آیا (کیونکہ ابراہیم جامعہ ازہر کا سکرٹری تھا) اور اس کی عنایت سے پروفیسری کی جگہ اسکو مل گئی تو اسے خالدہ سے ملنا ہی پڑا، اور چونکہ اس کے باپ نے اسپر احسان کیا تھا اسلیئے وہ خالدہ کی ہر التجا کو فرمان سمجھ کر سر عجز جھکانے پر مجبور ہوگیا۔ خالدہ کی عمر اسوقت ۱۸ سال کی تھی اور اگر وہ فطرتاً حسین نہ ہوتی تو بھی علم و دولت جدید تہذیب تمدن کا پیدا کیا ہوا حسن اسمیں ایسا معمولی نہ تھا کہ دیکھنے والے کو تھوڑی دیر کے لیئے دیوانہ نہ بنا دیتا خالدہ کا شمار مصر کی نہایت حسین عورتوں میں سے تھا اور اپنی شائستگی و قابلیت کے لحاظ سے بھی وہ ایک ممتاز حیثیت کی مالک تھی علاوہ اُن تمام کمالات کے جو عہد حاضر کی ایک عورت کو حاصل کرنی چاہئیں اسمیں فطری خوبیاں ایسی بھی پائی جاتی تھیں جو ایشیائی اخلاق و آداب کی جان کہلاتی ہیں، اور غالباً یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اسکی زندگی اسوقت تک اُس دیوی کی طرح بسر ہوئی تھی، جس کے سامنے سر نیائش تو جھکایا جا سکتا ہے، لیکن جس کے چھونے کے خیال سے انگلیاں جلنے لگتی ہیں، وہ ایک کشیدہ قامت رکھنے والی، لچکیلے انداز کی حد درجہ نازک لڑکی تھی اور اس کے خد و خال کی موزونی، نقشہ و چہرہ کی ساخت اسقدر متناسب تھی کہ نگاہ جس جگہ پڑتی تھی وہیں آسودہ ہوکر رہ جاتی تھی، اسکی سیاہ آنکھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بجلیاں کوٹ کر بھر دی گئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ جاوید بھی ان نگاہوں کے سامنے اپنی حالت ایسی محسوس کرتا تھا جیسے سیلاب میں کسی کے پاؤں اکھڑ جائیں اُسکی آواز ایک مستقل موسیقی تھی جو ہر وقت فضا کو اپنے افسوں سے معمور رکھتی تھی، عادات و خصائل کے لحاظ سے

وہ اسقدر بلند مرتبہ رکھتی تھی کہ طبقہ امرا کی خواتین میں مشکل سے اسکی نظیر مل سکتی تھی، شعر و ادب کی یہ بھی دلدادہ شائق تھی اور کبھی کبھی خود بھی نظم لکھنے کی کوشش کرتی، لیکن چونکہ وہ اس کے معیار پسندیدگی کے لحاظ سے پست ہوتی تھی اسلیئے وہ ہمیشہ اُسے تلف کر دیتی، جاوید کو جب اس نے اول اول دیکھا تو اس کے دل میں سوائے اسکے کوئی جذبہ موجود نہ تھا کہ ملک کو ایسے ہونہار نوجوان شاعر کی قدر کرنی چاہیئے، لیکن جب رفتہ رفتہ مراسم بڑھے، تو اسنے اپنے اندر ایک خاص قسم کا انجذاب محسوس کیا اور آخر کار وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی، ہر چند زبان سے اس کا اظہار خالدہ نے کبھی نہ کیا تھا، لیکن جاوید اسکو محسوس کرنے لگا تھا، اور جسقدر اسے زیادہ یقین ہوتا جاتا تھا اسی قدر اسکی سرد مہری بڑھتی جاتی تھی، خالدہ سمجھتی تھی کہ جاوید ایک خاص طبیعت کا انسان ہے اور شعر کے اندر جس رنگ میں وہ نظر آتا ہے اس سے اس کا ظاہری رنگ بالکل جدا ہے، لیکن وہ متحیر تھی، کہ محبت سے اُس کا اسقدر بیگانہ نظر آنا کس سبب کی بنا پر ہے، وہ جانتی تھی کہ مصر کا کوئی نوجوان ایسا نہیں ہے جو اُس کا ادنے التفات حاصل کرنے کے لیئے بڑی سے بڑی قربانی کے لیئے آمادہ نہیں لیکن اسے کیسی حیرت ہوتی تھی یہ دیکھ کر کہ جسقدر وہ جاوید کی طرف زیادہ مائل ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اسکی بیگانہ وشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے،

یہ دونوں ہفتہ میں دو بار ضرور ملتے تھے اور ہر ملاقات حجاب و تکلف کی زنجیر کو رفتہ رفتہ کمزور کرتی جاتی تھی لیکن جاوید کا طرز عمل جسمیں خالدہ کی طرف سے بجائے محبت کے زیادہ تر جذبۂ احترام کا اظہار ہوتا تھا، ایک ایسی پیچیدہ منزل تھی، جس سے گزرنا خالدہ کے لیئے صد درجہ دشوار تھا، چونکہ وہ یورپین نہ تھی، اسلیئے باوجود تعلیم کی تمام آزادیوں کے اتنی جرأت اپنے اندر نہ پاتی تھی، کہ کسی دن اپنی باہیں گلے میں ڈال کر اسکو بیتاب بنا دے اور اسطرح ہمیشہ کے لیئے پردۂ حجاب چاک کر دے، تاہم جس حد تک گفتگو کا تعلق ہے، خالدہ نے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا لیکن کبھی بھول کر بھی جاوید نے کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ وہ کسی دوست سے مخاطب ہے، وہ ہمیشہ اسے اپنی مالکہ اور محسنہ سمجھکر خطاب کرتا اور وہ ہر مرتبہ جبیں بہ جبیں ہو کر اس کے طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی، الغرض اسی طرح مہینوں گزر گئے تھے، اور خالدہ بجائے مقصود سے قریب ہونے کے، اپنے آپ کو اس سے اور دور ہوتا ہوا دیکھتی تھی، آج کے لیئے اسنے بہ مشکل جاوید سے قہوہ خانے میں آنے کا وعدہ لیا تھا اور سمجھتی تھی کہ شاید یہاں کی خلوت جاوید کے خیال میں کوئی انقلاب پیدا کر سکے، لیکن جس خشک انداز میں وہ "معاف فرمایئے" کہکر خاموش ہو گیا، اس نے خالدہ کو غیر معمولی صدمہ پہونچایا اور تھوڑی دیر کے لیئے وہ برق زدہ سی ہو کر گئی لیکن چونکہ خالدہ اس نوع کے مناظر سے نا آشنا نہ تھی اور اس سے قبل بارہا جاوید کی طرف سے ایسا طرز عمل دیکھ

چکی تھی، اسلیئے جب خادم قہوہ کا خوان سامنے لایا، تو اس نے اس سکوت کو توڑنے کی کوشش کی اور جاوید سے مخاطب ہوکر بولی کہ "آپ دُ ندرمہ (Ice - Cream) پسند کرینگے؟" جاوید نے جو اس سے قبل اپنے خشک جواب کی ناسوز ونیت کو محسوس کر چکا تھا، زیادہ آمادگی کے ساتھ اس عنایت کی پذیرائی کی اور اسطرح فضا کا رنگ بدل گیا۔

دونوں قہوہ پی رہے تھے، مختلف مباحث پر گفتگو ہو رہی تھی کہ خادم نے تازہ اخبار لاکر میز پر رکھا اور سب سے پہلی خبر جس نے ان دونوں کی توجہ کو بیک وقت طلب کر لیا، مقبرۂ توت انخ امون کے متعلق تھی، اسوقت تک مختلف اخبار ورسائل کے ذریعہ سے اس قبر کے انکشاف کے حالات معلوم ہو چکے تھے، لیکن کسی کو دیکھنے کی اجازت نہ دیگئی تھی، اب حکومت مصر نے خاص خاص لوگوں کو وہاں جاکر دیکھنے کی اجازت دیدی تھی، اور اسی غرض کے لیئے ٹکٹ شائع کیئے تھے جو درخواست دینے پر نظارت ابحاث کے افسر اعلیٰ سے مل سکتے تھے۔

اس خبر نے جاوید پر خاص اثر کیا، اور وہ بالکل خلاف عادت بیتاب ہوکر بول اٹھا کہ "ایک ٹکٹ میرے لیئے بھی فراہم کیجیئے" خالدہ کے لیئے یہ پہلا موقع تھا کہ جاوید نے اس کے سامنے کوئی درخواست یا التجا پیش کی ہو اور خاص کر ایسے لب ولہجہ میں جس سے ایک نوع کا اعتماد ظاہر ہوتا ہو اسلیئے وہ یہ سنکر بہت مسرور ہوئی اور اس نے اس کا جواب اپنی اُس نگاہ سے دیا جسکو جاوید نے فوراً اپنا سر جھکا کر نیم نگاہی میں تبدیل کر دیا، خالدہ مسکرائی اور نہایت ہی محبت کے لہجہ سے مخاطب ہوئی کہ "کیا آپ وہاں کا جواہر نگار اسباب دیکھنا چاہتے ہیں"

"نہیں میں تو اس صورت کو دیکھنا چاہتا ہوں جو آج سے ہزاروں سال قبل یہاں کی حکمران تھی"

"اگر آپ میری معیت میں گئے تو شاید اسمیں کامیاب نہ ہوں، کیونکہ مجھے تو مومیائی شدہ لاشوں کے دیکھنے سے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے"

"آپ اندر نہ جائیے گا، یہ خدمت آپ کی طرف سے میں ادا کرونگا" یہ کہکر اسنے قہوہ کی پیالی خوان میں رکھنے کے لیئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ خالدہ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور بولی کہ "کبھی آپ وہ خدمتیں بھی انجام دیتے ہیں جو خود آپ ہی کی طرف سے آپ پر عائد ہوتی ہیں"

جاوید جو ہات چھڑانے کی ہمت بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا، نگاہیں جھکا کر رہگیا اور اسکے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی خالدہ نے یہ دیکھکر اس کا ہات چھوڑ دیا اور جھنجلا کر بولی کہ "خدا کے لیئے بتایئے کہ میں ایک شاعر کو کیسے بے حس کہہ سکتی ہوں، اور اگر بے حس نہ کہوں تو پھر میں کیا سمجھوں آپ کے اُس سینہ کو جو "یخ خانہ" سے زیادہ سرد و بارد ہے۔"

جاوید، جو اس سے پہلے بھی خالدہ کی طرف سے اس قسم کے اظہار جوش پر ہمیشہ ساکت رہ جایا کرتا تھا، اس مرتبہ بھی خاموش ہی رہا، لیکن اس کے چہرہ پر ایک رنگین تبسم کی لہر ضرور دوڑ گئی، جو خالدہ کے لیے بالکل نیا سامان جسارت تھا اسلیئے وہ اپنے جوش کو ضبط نہ کر سکی اور جاوید کا دامن پکڑ کر بولی کہ "جاوید، خدا کے لیئے بولو، یہ تمھارا سکوت مجھے تباہ کیئے دیتا ہے، تم مجھ پر ظلم ہی کرو، لیکن لبوں کی جنبش سے، مجھے مایوس کر دو، مگر خاموشی سے نہیں، اپنی ملامت سے، جھڑکی سے، بولو، ہاں، کچھ کہو"

جاوید، جو اب خود اپنے سکوت کی مضرتوں کو محسوس کرنے لگا تھا، اور جو خالدہ کی بیتابی سے بہت متاثر ہو رہا تھا، کھڑا ہو گیا، اور بولا کہ "آپ بیٹھ جائیے، میرے لیئے یہ منظر ناقابل برداشت ہے"

خالدہ۔ "میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گی، جب تک مجھے مطمئن نہ کر دو کہ آیندہ تم ایک بے تکلف دوست کی طرح مجھ سے ملو گے اور اگر تم اسطرح نہ مانو گے، تو میں تمھارے قدموں پر گر پڑونگی اور کبھی نہ . . . ."

اسقدر کہنے کے بعد اُسکی آواز گریہ آلود ہو گئی، اور گھٹنے ٹیک کر اسنے جاوید کے پاؤں پکڑ لیئے، اس حال میں کہ اس کا چہرہ نیچے کو جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جذبات محبت جب ضبط کی حد سے گزر جاتے ہیں تو پھر اُن کا جوش ایک سیلاب کا سا جوش ہوتا ہے، اور یہ وہ کیفیت ہے جس کے سامنے شاہ و گدا دونوں مجبور ہو جاتے ہیں، خالدہ کو جاوید کے ساتھ نہایت شدید الفت تھی اور فطرتاً وہ اپنی محبت کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی، لیکن جاوید نے کبھی اسکو اظہار جذبات کا موقع نہیں دیا اور ایک زمانہ اسے ضبط کرتے ہوئے گزر گیا، لیکن آج جو جاوید کی طرف سے اسکو جسارت کا موقعہ ملا، تو وہ بیتاب ہو گئی، عنانِ ضبط ہات سے چھوٹ گئی اور تھوڑی دیر کے لیئے جاوید کے سرد سینہ کو بھی گلخن بنا گئی۔

جاوید، جو خالدہ کا صد درجہ احترام کرتا تھا اور اسکو اپنے محسن کی بیٹی سمجھکر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک خادم کا سا طرز عمل اختیار کرنا چاہتا تھا، اسوقت گھبرا گیا، اور بے اختیار جھک کر اسکی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں لیکر اٹھانا چاہا، لیکن چونکہ خالدہ کے لیئے اتصال جسم کا یہ پہلا موقعہ تھا اسلیئے جاوید کے گرم ہاتوں کی گرفت اسکے لیئے ایسی نشہ آور لذت تھی کہ وہ بالکل بے اختیار ہو گئی اور اسکی آغوش میں گر کر اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جاوید حیران تھا کہ کیا کرے، وہ عملاً بالکل ناواقف تھا کہ ایسی صورتوں میں کیونکر اور کن الفاظ سے تسکین دیجاتی ہے، فطرتاً وہ سب کچھ سمجھتا تھا، لیکن ہمت مفقود تھی اور غیرت و شرم عنان گیر، وہ دیر تک

اسی کشمکش میں مبتلا رہا اور آخرکار بڑی جسارت کرکے اس کے سر کو سہارا دیا، اٹھا کر بٹھایا اور اپنے رومال سے اسکے آنسو جذب کرنے لگا۔

عورت سے

تو کون ہے کیسے کہوں تو کیا ہے میں کیا کیا کہوں؟　　الفاظ میں وسعت نہیں اور مدعا حد سے فزوں
ہیں گفتگو میں اور بھی لیکن کہاں وہ لذتیں　　بس تو ہو، تیرا ذکر ہو، مجھکو تو ہے اسکا جنوں
پر کیا کروں مجبور ہوں ارباب تقویٰ سے کہ وہ　　اس باب میں طرز سخن میرا سمجھتے ہیں زبوں
لیکن کہونگا پھر بھی کچھ اور کیوں نہ میں آخر کہوں　　جب ایک تیری ذات سے گیتی میں پھیلا ہے سکوں

تو اک سراپا لطف ہے اک مستقل لذت ہے تو
دولت ہے تو عزت ہے تو رحمت ہے تو راحت ہے تو

اس گلشنِ عالم میں جب دل کی کلی مرجھا گئی　　تو مسکرا دی اک ذرا اور تازگی برسا گئی
وہ تو ہے جس نے سونپ دی کھوئی ہوئی راحت ہمیں　　اس غم کدہ میں ہم پہ جب اک خستگی سی چھا گئی
جب طالبِ درس تپش اپنا سکون گم ہوا　　تیری نگاہ نازنیں کیسا ہمیں تڑپا گئی
اخلاق جب بگڑے مرے تو نے ادب مجھکو دیا　　جب بھولے آئینِ وفا تو ہی ہمیں بتلا گئی

اجزائے عالم سے اگر تجھکو کوئی کردے جدا
رہ جائے کیا دنیا میں پھر ہے زندگی کا کیا مزا

ہے تیری ساری زندگی حسن صداقت کا بیاں　　ہر لمحہ تیری عمر کا الفت کی پوری داستاں
ہر جذبہ دل میں ہے ترا پاکیزگی کی اک مثال　　شرم و حیا ہمدم تری غیرت ہے تیری پاسباں
نامہرباں ہونے پہ بھی اک لطف بے اندازہ ہے　　نعمت ہے کیسی کیا کہوں ہو جائے گر تو مہرباں
تو دشمنی میں بھی نہیں اخلاق سے ہٹتی کبھی　　ہم کر چکے ہیں بارہا تیری وفا کا امتحاں

کم ہے جو ہم دیدیں تجھے اپنا سکوں بھی چین بھی
جب ایک عصمت کی تری قیمت نہیں کونین بھی

ہندی شاعری کی تاریخ

(بسلسلۂ ماہ گزشتہ)

ملوک داس یہ عہد اورنگ زیب میں تھا اور اس نے رامانندی طبقہ سے ملتا جلتا ایک اور گروہ اپنا پیدا کیا۔ اس گروہ نے نہ صرف رام کو خدا کا اوتار سمجھا بلکہ مورتی پوجن کو بھی اختیار کیا، رامانندیوں اور ملوک داسیوں میں یہ فرق تھا کہ وہ سنیاسی تھے اور یہ تارک دنیا نہ تھے، ملوک داس کڑہ ضلع آباد میں پیدا ہوا، عمر بھر تجارت کی اور جگناتھ میں مرگیا۔

ملوک داس اور اس کے معتقدین کے مندر کڑہ اور دیگر مقامات میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے خاص خاص تصانیف دس رتن اور بھگت بتسل ہیں۔ اس کے دوہے اور بھی مختلف طور سے بہت مشہور ہیں۔

رام پرستی کے متعلق لٹریچر تلسی داس کا ایک شاگرد بینی مادھو داس تھا (سنہ ۱۶۰۰ء) اسنے تلسی داس کے حالات یکجا کرکے اس کا نام گوسائیں چرتر رکھا۔ اسکی دوسری تصنیف تک سکھ بھی مشہور ہے۔ ایک اور شخص مان داس برج کا رہنے والا تھا۔ اس نے والمیکی کی رامائن اور ہنومان ناٹک کی مدد سے ایک ہندی نظم رام چرتر تصنیف کی۔

الشیری پرشاد نے سنہ ۱۶۷۳ء میں والمیکی کی نظم کا ترجمہ کیا اور اس کا نام رام بلاس رامائن رکھا۔

ایک شخص بالی الی نے سنہ ۱۶۹۲ء میں رام اور سیتا کی تعریف میں نیہہ پرکاش اور سیتارام دھیان منجری دو کتابیں تصنیف کیں۔

جانک رسکی سرن (سنہ ۱۷۰۳ء) نے رام کی تعریف میں اودھ ساگر مرتب کی اور بھگونت رائے، اسوتھر (ضلع فتحپور) کے راجہ نے ایک رامائن خود تصنیف کی۔

سنہ ۱۷۵۰ء میں سمبھوناتھ نے رام بلاس تصنیف کی، اسی زمانہ میں ایک شخص تلسی صاحب (سنہ ۱۷۶۳-۱۵۴۳ء) نے جو راجہ پونا کا بڑا بیٹا تھا لیکن تخت سے دست بردار ہوچکا تھا، گھٹ رامائن تصنیف کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ پہلے جنم میں تلسی داس تھا۔

مادھوسودن داس (سنہ ۱۷۸۲ء) بھی اس عہد کا مشہور شاعر تھا اور اس کا رنگ کلام بہت کچھ تلسی داس سے

ملتا ہے۔

منیار سنگھ (۱۸۰۵ء) جسے یار بھی کہتے ہیں ایک اور مشہور شاعر تھا، یہ بنارس کا باشندہ اور رام کے پرستاروں میں سے تھا۔ اس کی سندر یہ لہری، سندر کانڈ اور ہنومان چھبیسی مشہور کتابیں ہیں جن میں رام اور ہنومان کا حال بیان کیا گیا ہے۔

گنیش (۱۸۰۰ء) راجہ بنارس کے دربار کا شاعر تھا، اسنے بھی بہت سی تصانیف کیں اور والمیکی کی رامائن کا بھی ترجمہ کیا۔

جانشینان کبیر

کبیر پنتھی تعلیمات کبیر کی وسعت اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد بہت سے طبقے ہندوستان میں ایسے رونما ہوئے جو مسلک کبیر ہی کے متبع تھے، کبیر پنتھ جس کا تعلق براہ راست کبیر سے ہے دو حصوں میں منقسم ہے ایک کا مرکز کبیر چورا (بنارس میں) ہے اور دوسرے کا چھتیس گڑھ (صوبہ متوسط میں) ہے بنارس میں جو اس طبقہ کے مہنت رہتے ہیں ان کا مورث اعلیٰ سورت گوپال تھا، اور چھتیس گڑھ کے مہنتوں کا دھرم داس، کہا جاتا ہے کہ سورت گوپال اور دھرم داس کبیر کے دیکھنے والے اور اس کے شاگرد تھے، لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً کبیر کے بعد یہ پیدا ہوئے اور پھر کبیر کا مسلک اختیار کیا۔ اگرچہ کبیر پنتھ اصولاً بت پرستی کا مخالف ہے لیکن بعد کو بت پرست ہندوں کے اثر سے اس میں بہت سے حشو و زوائد پیدا ہوگئے ہیں۔ کبیر خدا کے حلول کرنے کا مخالف تھا اور اس کا عقیدہ یہ نہ تھا کہ کوئی انسان خدا کا اوتار ہو سکتا ہے، لیکن اب کبیر پنتھ کے بعض لوگ خود کبیر کو خدا کا اوتار سمجھنے لگے ہیں، تسبیح و مالا بھی کبیر کا شعار نہ تھا لیکن اب اس کا بھی رواج ہوگیا ہے سوائے اس کلام کے جس کا مصنف خود کبیر تھا، اور لٹریچر جس کا تعلق اسکے متبعین سے ہے کوئی اور شخص نہیں دیکھ سکتا۔

بیجک جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کبیر کے تقریباً ۵۰ سال بعد مرتب ہوئی۔ علاوہ بیجک کے دو کتابیں اور اس طبقہ کی ہیں۔ ایک کا نام سکھ ندھان ہے جو غالباً اٹھارویں صدی کے وسط میں مرتب ہوئی اور دوسری امر مول ہے، جو ۱۸۰۰ء کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ایک اور شخص پلٹو صاحب بھی اس طبقہ کا ۱۸۰۰ء میں ہوا ہے جس نے بعض موثر نظمیں کنڈلیہ بحر میں تصنیف کی ہیں

سکھ یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ سکھ مذہب کا بانی نانک تعلیمات کبیر سے بہت متاثر ہوا تھا، نانک کے بعد

سکھ مذہب میں نو گرو اور ہوئے ہیں جو سب کے سب شاعر تھے، سکھوں کی مذہبی کتاب کو گرنتھ صاحب کہتے ہیں اسکو چھٹے گرو ارجن نے (جن کا زمانہ ۱۵۶۳ء سے ۱۶۰۶ء تک ہوا ہے) ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا۔ اسمیں گرو نانک گرو امرداس، گرو رام داس، گرو ارجن اور گرو نانک (نواں گرو) کا کلام پایا جاتا ہے، دسویں گرو گوبند سنگھ کا بھی ایک آدھ دوہا اسمیں موجود ہے، گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ کے کلام کا اسمیں بعد کو اضافہ کیا گیا ہے گرنتھ میں اسکے کلام کے علاوہ اور کلام بھی گروؤں کی تعریف میں دوسرے لوگوں کے شامل ہیں اور بعض بھگتوں (کبیر، نام دیو اور دوسرے بھگت لوگوں کی بھی اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں۔ مصنفین کے لحاظ سے نہیں بلکہ راگوں اور راگنیوں کے لحاظ سے کلام کی ترتیب کی گئی ہے سوائے آخری گرو کے تمام گروؤں نے اپنا لقب نانک رکھا ہے۔ اس گرنتھ میں سب سے پہلے گرو نانک کی جپجی ہے اور پھر سودرہ، سو پرکھو، سوہلا، دعائیہ نظمیں ہیں۔ راگوں کے بعد کتاب کے آخر میں بھوگ ہے جسمیں اشلوک ہیں۔ اس کی زبان قدیم ہندی ہے اور کہیں کہیں پنجابی بھی شامل ہے۔ سکھ ہندوستان کی محارب قوم ہے اور یہ روح اُن میں دسویں گرو گوبند سنگھ کے زمانہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا عہد مابین ۱۶۷۵ء اور ۱۷۰۸ء ہوا ہے، اسی نے اپنی قوم میں ایک فوجی نظام پیدا کرکے اس کا نام خالصہ رکھا، اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے طیار کیا۔ اس کے عہد میں بہت سے ہندو خیالات سکھ مذہب میں رائج ہو گئے۔

گرو گوبند سنگھ نے متعدد نظمیں لکھیں جنمیں سے اکثر برج بھاشا میں ہیں اور کمتر فارسی و پنجابی میں ۱۷۳۴ء میں اس کے کلام کا مجموعہ ایک شخص بھائی منی سنگھ نے مرتب کیا جسے "دسویں گرو گرنتھ" کہتے ہیں اس سے صرف جذبات شجاعت پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے اور آدی گرنتھ سے اس کا درجہ کمتر ہے، اس گرنتھ میں علاوہ جپجی اور حمد کی بھجنوں کے وچتر ناٹک بھی شامل ہے جسمیں گوبند سنگھ کی سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں۔

دادو پنتھ

اس طبقہ کا مورث اعلیٰ ایک شخص دادو تھا (۱۵۴۴ء - ۱۶۰۳ء) یہ احمد آباد میں پیدا ہوا اور اپنے اپنی عمر کا زیادہ حصہ راجپوتانہ میں صرف کیا، عام طور سے یہی مشہور ہے کہ وہ قوم کا نداف تھا لیکن اس کے مقلدین کا بیان ہے کہ برہمن تھا، وہ اسقدر فیاض اور رحیم الطبع تھا کہ لوگ اسے دادو دیال کہنے لگے، اسکی تعلیمات کبیر سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اسلامی خیالات اسقدر نہیں ہیں۔ دادو تعلیم ویدانت، بت پرستی، اور تفریق قومی کے خلاف تھا، لیکن اب اس کے متبعین میں ویدانت کا رواج ہے اور خود پنتھ کے بانی کی پرستش کرتے ہیں۔ اسکی تعلیمات کو اسکے چیلوں نے بہت پھیلایا جنکی تعداد ۱۵۲ تھی، اس کے معتقدات بانی میں درج ہیں جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ۳۷ باب ہیں اور ہر باب میں ایک جداگانہ بحث ہے، نفس، سچائی، دعا، ایمان،

نیکی، فراق وغیرہ مختلف عنوانات پر ہر باب میں دوہے درج کئے گئے ہیں

دادو کا کلام بہت دلکش ہے اور اسمیں اک خاص قسم کی موسیقی پائی جاتی ہے، اسکے دو بیٹے بھی شاعر تھے اور اس کے چیلے بھی قریب قریب سب خوشگو اور خوش فکر لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دادو پنتھ کا لٹریچر ہندی میں کثیر اور اچھا ہے، اس کے شاگردوں میں بہترین شاعر سندر داس تھا جسے بوسر بھی کہتے ہیں۔ اس کا زمانہ ترقی مابین سنہ ۱۶۲۰ء و سنہ ۱۶۵۰ء ہوا ہے، دادو پنتھی لوگ اسکو بہترین شاعر ہندی لٹریچر کا خیال کرتے ہیں۔ یہ بڑا پرگو تھا، اسکی بہترین تصانیف سندر بلاس اور گیان سمندر ہیں۔ اس طبقہ میں جس نے سب سے پہلے ویدانتی خیالات پیدا کئے، وہ اس جماعت کا ایک شاعر نچل داس تھا۔

لال داسی ایک شخص لال داس نے (جس کا انتقال سنہ ۱۶۴۸ء میں ہوا) لال داسی طبقہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ الور کا رہنے والا اور میو قوم کا تھا، دوسرے مذہبی معلمین کی طرح جن کے اصول تعلیم، معتقدات کبیر کے زیر اثر قائم ہوئے، لال داس نے بھی رام کا نام لینے پر زیادہ زور دیا۔ اسکی تعلیمات اور بھجن ایک کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں جسے بانی کہتے ہیں۔

سادھ بیربھان نے اس طبقہ کی بنیاد سنہ ۱۶۵۸ء میں قائم کی۔ مخصوصیت کے ساتھ یہ دوآبہ کے بالائی حصہ میں زیادہ مقبول ہوا۔ بیربھان مدعی تھا کہ ایک غیر انسانی قوت ستید اور ساکھی کی صورت میں اس کے اصول الہام کرتی ہے۔ اس کا مجموعہ آدی اپدیسا کہلاتا ہے

دھرنی داسی دھرنی داس بمقام مانجھی ضلع چھپرہ سنہ ۱۶۵۶ء میں پیدا ہوا۔ یہ قوم کا کایستھ تھا، اس نے بھی ایک مسلک قائم کیا جو اب تک موجود ہے، اسکی دو کتابیں ہندی میں ستیا پرکاش اور پریم پرکاش بہت مشہور ہیں

بعض صوفی شعرار ہندوؤں کے علاوہ بعض مسلمان بھی ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے ہندی میں تصوفانہ شاعری کی ہے مثلاً یاری صاحب (۱۶۶۸-۱۷۲۳ء) یہ ایک صوفی منش شخص تھا اور دہلی میں رہا کرتا تھا۔ اس کے بعض شاگرد بھی ہندی میں شعر کہتے تھے، جن میں کیسو داس اور بلّا داس خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان کا زمانۂ شہرت سنہ ۱۷۳۰ء تھا، بلا صاحب کا ایک شاگرد گلال صاحب تھا اور اس کا بھیکا صاحب۔ گلال اور بھیکا نے اٹھارویں صدی کے آخر میں کافی شہرت حاصل کی اور ان کا ہندی کلام خوب ہے۔ ان کے علاوہ دو شاعر اور بھی اسی خیال کے مقلد تھے دونوں کا نام دریا صاحب تھا لیکن ایک بہار کا

رہنے والا تھا اور دوسرا مارواڑ کا- یہ بھی دونوں مسلمان تھے، ان کا زمانہ ترقی بھی آخر اٹھارویں صدی سمجھنا چاہیئے ابتدائی اٹھارویں صدی میں بھی ایک اور مسلمان صوفی عقائد کا پکے صاحب تھا، اس کا ہندی کلام بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔

چرن داسی

چرن داس (۱۷۰۳-۱۷۸۲ء) قوم کا بنیا تھا اسنے ۱۷۳۰ء میں دہلی کے اندر اپنا ایک طبقہ الگ قائم کیا جو اب بھی پایا جاتا ہے اسکے بہت سے شاگرد تھے جو اسکی تعلیمات کی اشاعت کرتے تھے اس نے عورتوں کو بھی اپنا چیلا بنایا- اسکی تعلیمات بہت کچھ کبیر کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں- اس نے بھی بھگتی اور خدا کا نام جپنے کی تاکید کی ہے- اسنے بھی بت پرستی کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن بعد کو اس کے طبقہ میں بھی وہ عود کر آئی، اس طبقہ کے لوگ اپنے گرو کی نہایت عزت کرتے ہیں-

دوسرے طبقوں کی طرح اس کا لٹریچر بھی ہندی میں بہت ہے- بھگوت پران اور بھگوت گیتا کا ترجمہ ہندی میں اس جماعت کے پاس موجود ہے جس کا ایک حصہ غالباً خود چرن داس کا کیا ہوا ہے-

چرن داس کا ہندی کلام اسکے طبقہ میں بہت مقبول ہے، اسکے مریدوں میں دو عورتیں شاعرہ بھی تھیں ان کا نام ساہوجی بائی اور دیا بائی تھا، یہ چرن داس کی ہم قوم تھیں- ان عورتوں کا کلام بے انتہا موثر ہے دیا بائی کے کلام کا مجموعہ ۱۷۵۱ء میں مرتب ہوا تھا جس کا نام دیا بودھ ہے-

شیونرائن

شیو نرائن قوم کا راجپوت اور غازی پور کے قریب کسی گانوں کا رہنے والا تھا ۱۷۳۴ء میں اس نے اپنا مسلک الگ قائم کیا جو بالکل موحدانہ انداز کا تھا، بت پرستی کی اسنے بھی سخت مخالفت کی- اس کے مقلدین خیال کرتے ہیں کہ شیو نرائن اپنے زمانہ کا اوتار تھا غیر ہندو لوگ بھی اس جماعت کے ممبر ہو سکتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) اس جماعت کا ممبر تھا، شیو نرائن بڑا لکھنے والا تھا، اسنے سولہ کتابیں ہندی نظم میں لکھیں-

غریب داسی

کہا جاتا ہے کہ غریب داس (۱۷۱۷-۱۷۸۲ء) کا گرو کبیر داس تھا ہر چند یہ غلط ہے کیونکہ دونوں کے زمانہ میں بہت فرق تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ کبیر پنتھ کی ایک شاخ تھا، اسکے مقلدین اب بھی پائے جاتے ہیں اور قریب قریب سب سادھو ہیں- غریب داس کا مجموعۂ نظم گرو گرنتھ صاحب کے نام سے مشہور ہے اور اسمیں ۰۰۰ ۲۴ ساکھیاں اور چوپائیاں ہیں- ان میں سے ۰۰۰ ۷ ساکھیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کبیر کی ہیں- غریب داس موضع چھوڑانی (ضلع رہتک) کا رہنے والا تھا-

رام سینہی اس کا سورث اعلیٰ رام چرن تھا، یہ ۱۷۱۸ء میں پیدا ہوا اور راجپوتانہ میں زندگی بسر کر دی، یہ پہلے بت پرست تھا لیکن بعد کو بت پرستی ترک کر کے رام سینہی (یعنے عاشقان رام) گروہ کی بنیاد قائم کی۔ اس جماعت کی یادگار اب صرف سادھوں کا ایک طبقہ رہ گیا ہے رام چرن کا مجموعۂ نظم (بانی) بھی مرتب ہے، اس طبقہ کا مشہور ارہنما دولھارام تھا جو ۱۷۶۶ء میں رام سینہی ہوا۔ اس نے دس ہزار شبد اور چار ہزار ساکھیاں تصنیف کیں۔ ۱۸۲۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ست نامی طبقہ اور جگ جیون داس ست نامی طبقہ کی بنیاد سترہویں صدی کے وسط ہی میں قائم ہو گئی تھی لیکن اس کے حالات نامعلوم ہیں ۱۷۵۰ء میں پھر جگ جیون داس نے اس طبقہ کو زندہ کیا، یہ شخص لکھنؤ اور اجودھیا کے درمیان ایک موضع کوٹوا کا رہنے والا تھا یہ طبقہ اپنے معتقدات کے لحاظ سے تو بالکل موحد ہے لیکن اوتاروں کا بھی قائل ہے۔ یہ قوم کا چھتری تھا، اسکی تصانیف میں پرتھم گرنتھ، مہا پرلے اور گیان پرکاش بہت مشہور ہیں یہ سب ہندی نظم میں ہیں۔

اس کا ایک شاگرد دولن داس ضلع رائے بریلی کا رہنے والا اور اچھا شاعر تھا، جگ جیون کے جانشینوں میں دو شخص جلال داس اور دیوی داس اور بھی ہوئے ہیں جو اچھے شاعر تھے۔

۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان صوبۂ متوسط میں ایک شخص غازی داس پیدا ہوا اور اسنے اس جوار میں ست نامی جماعت کو چھتیس گڑھ میں پھر ترقی دی۔

پران ناتھی پران ناتھ اٹھارویں صدی کی ابتدا میں مقام پنا (بندیلکھنڈ) پیدا ہوا، راجہ چھتر سال اس کا سرپرست تھا اس نے بھی ایک مسلک قائم کیا جسمیں ہندو عقائد کے علاوہ اسلامی اور عیسوی عقائد سے بھی بعض باتیں مستعار لی گئیں۔ پران ناتھ چھتری تھا، اور ہندو، مسلمان دونوں کے معتقدات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کوشش کی کہ یہ دونوں مذہب ملکر ایک ہو جائیں۔ اس طبقہ کا دوسرا نام دھامی بھی ہے، (دھام خدا کا ایک نام ہے) پران ناتھ کی ۱۴ تصانیف ہیں جو سب کی سب نظم میں ہیں۔ ہر چند قواعد کے لحاظ سے وہ سب ہندی زبان کی شمار کی جاتی ہیں لیکن عربی اور فارسی الفاظ اسمیں کثرت سے پائے جاتے ہیں

عام تبصرہ اس باب میں جن جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب شانت رس کے لکھنے والے تھے انکی نظمیں صاف سلجھی ہوئی ہیں اور فن شاعری کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اسقدر زائد نہیں اس عہد کی تمام تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود صرف مذہبی معتقدات کی اشاعت تھی نہ کہ

لٹریچر میں کوئی ترقی پیدا کرنا، اور یہی وجہ ہے کہ کبیر کے بعد جو شعرا ہوئے ہیں اگر ان کا کلام کبیر کے کلام سے زیادہ صاف ہے تو اس اعتبار سے جوش و اثر، دلکشی و جاذبیت مفقود ہے، ان سب میں صرف ایک ہی قسم کی تعلیم نظر آتی ہے، یعنے گرو کی ضرورت و عظمت، خدا کا نام بار بار لینے کی اہمیت، بھگتی کا مرتبہ، مایا کا دھوکا، سچائی و دیانت کی عظمت وغیرہ وغیرہ۔ اور اسمیں کلام نہیں کہ بعض بعض کتابوں میں کہیں کہیں نہایت حسن و اہتمام کے ساتھ ان امور کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس زمانہ کا اقتضا یہی تھا کیونکہ شمالی ہندوستان ایک سخت سیاسی انقلاب سے گزر رہا تھا، اورنگ زیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کا سارا زمانہ منتشر قوتوں کے یکجا کرنے میں صرف ہوگیا اور اس کے بعد سیاسی بدنظمی بہت زیادہ پھیل گئی۔ پھر نادر شاہ کے حملہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ کی تاخت (۱۷۵۶ء) نے عام تباہیاں پھیلا دیں۔ علاوہ اس کے مرہٹہ جماعتیں مغل سلطنت پر حملہ کر رہی تھیں اور ہر طرف سے بے اطمینانی، امن شکنی، اور اضطراب پیدا تھا۔ چنانچہ امن و سکون کی تلاش کے لیے بہت سے مسالک و مذاہب پیدا ہوئے اور لوگوں کے بیقرار دلوں میں اپنی تعلیمات سے اطمینان پیدا کرنا چاہا۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور پھر بیان کرتے ہیں کہ کبیر کے بعد جتنے اور پنتھ یا مسلک پیدا ہوئے اُن سب کا ماخذ کبیر کی تعلیم تھی اور اصول کے لحاظ سے کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو اپنے تئیں کبیر کی اصولی تعلیم سے بالکل علیحدہ ثابت کر سکے۔

کرشن پرست جماعتیں

(۱۵۵۰-۱۸۰۰ء)

اشٹ چھاپ بلبھ چاریہ اور اس کا بیٹا بٹل ناتھ بلبھ چاری طبقہ کے مورث اعلیٰ تھے جن کا اجمالی ذکر پہلے آچکا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے چار چار چیلے تھے اور یہ آٹھوں شاعر تھے، انہیں کو اشٹ چھاپ (آٹھ مہریں) کہتے ہیں کیونکہ اُن کی نظمیں مغربی ہندی زبان کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہیں گویا انہوں نے زبان پر مہر لگا دی اور اسطرح ٹکسالی ہندی اُن سے بہتر کسی نے نہیں لکھی۔

انھوں نے برج بھاشا زبان میں شاعری کی ہے یعنے وہ زبان جو متھرا، بندرابن اور قرب و جوار کے مقامات میں اسوقت رائج تھی،

اسی وقت سے تقریباً تمام وہ ہندی شاعری جس کا تعلق کرشن پرستی سے ہے برج بھاشا زبان میں

میں کیجا رہی ہے، اور ہندی شاعری کی زبان ہی برج بھاشا قرار دیدی گئی ہے، اگرچہ تلسی داس اور اکثر رام پرست جماعتوں نے صرف مشرقی ہندی کو اختیار کیا،

بلبھ چاریہ کے چار چیلوں کے نام یہ ہیں:- سور داس، کرشن داس، پرمانند داس، کیہان داس اور سٹھل ناتھ کے چیلے یہ تھے:- چتر بھج داس، چھیت سوامی، نند داس، گو بند داس، یہی آٹھوں رشٹ چھاپ کہلاتے ہیں اور ان کا زمانہ سولھویں صدی کا وسط اور اس کا آخری حصہ سمجھنا چاہیئے۔

کرشن داس، سور داس کا رقیب تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سور داس کی شاعری سے اسے کوئی نسبت نہ تھی۔ کرشن داس کی بہترین تصنیف پریم ستونی روپ ہے۔ اسکے کئی شاگرد اچھے تھے، ان میں سے ایک بہت مشہور اگر داس (۱۵۷۵ء) تھا جو نابھا داس مصنف بھگت مالا کا استاد تھا۔

رشٹ چھاپ میں، سور داس کے بعد نند داس کا درجہ ہے، یہ برہمن تھا اور بعض کا خیال ہے کہ مشہور تلسی داس جی کا بھائی تھا۔ اسکے متعلق ایک مثل مشہور ہے کہ "اور سب گھڑیا، نند داس جڑیا" یعنے اور سارے شاعر تو صرف گھڑنے والے ہیں لیکن نند داس الفاظ کو نگ کی طرح جڑ دیتا ہے۔

اس کا متفرق کلام بہت ہے اور تصانیف بھی متعدد ہیں جنمیں بیچا دھیائی (جو گیتا گوبند کے نمونہ پر لکھی گئی ہیں) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

سور داس رشٹ چھاپ میں سب سے زیادہ مشہور سور داس تھا، اسکے حالات زندگی بہت کم ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ برہمن تھا، اس کا باپ بابا رام داس دربار اکبری کا مغنی تھا، سور داس کی عمر ۵۶ سال کی تھی کہ وہ متھرا گیا اور وہیں کسی سادھو کا چیلا ہو گیا، اس کے بعد وہ گو گھاٹ (ما بین آگرہ و متھرا) گیا اور یہاں بلبھ چاریہ کا مرید ہو گیا۔

اپنے بعض مشکل دوہوں کی تشریح کرتے ہوئے خود سور داس کا بیان ہے کہ وہ مشہور چند بروائی کے خاندان سے تھا۔ اس کے باپ کا نام رام چند را اور دادا کا ہری چند تھا جو آگرہ کے رہنے والے تھے، لیکن بعض کا خیال ہے کہ وہ برہمن ہی تھا، اور اپنے نسب کے متعلق اسنے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہے اس کا باپ گوپ چل میں رہا کرتا تھا اور اس کا سات بیٹے تھے جن میں سے چھ مسلمانوں کے مقابلہ میں مارے گئے، اور سور داس جو نابینا تھا بچ رہا، اس کے نابینا ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ حقیقتاً نابینا تھا، اور بعض کا خیال ہے کہ اسکو صرف استعارتاً نابینا کہتے ہیں، کیونکہ ایک بار کرشن جی کا درشن اسے خواب میں حاصل ہوا تھا، اور پھر اسنے ساری دنیا کی طرف سے

اپنی آنکھیں بند کرلیں، اسکے بعد یہ برج میں رہنے چلا گیا اور وہیں بلبھ چاریہ کا چیلا بن گیا۔ ۱۴۸۳ء اس کا سنہ ولادت اور ۱۵۶۳ء سنہ وفات ہے (لیکن یقینی نہیں)

سورداس کا مرتبۂ شاعری بہت بلند ہے، اور اس کا کلام اک خاص کیفیت کا حامل ہی، اس نے بھگوت پران کے بہت سے افسانے اور ٹکڑے نہایت خوبی کے ساتھ ہندی میں نظم کئے ہیں، اور کرشن و رادھا کی حیاتِ معاشقہ کو نئے نئے اسلوب سے اپنے بیان کیا ہے، اس عاشقانہ کلام کا مجموعہ ایک سورساگر ہے، اور دوسرا سوراولی۔ اسکا دقیق و پیچیدہ کلام ساہتیا لہری میں پایا جاتا ہی جسکی شرح خود اُسی نے لکھی ہی۔ اس نے نلدمن کا افسانہ بھی ہندی میں لکھا ہے۔

اس کا تمام کلام ۷۵۰۰ دوہوں پر مشتمل ہے، سورداس، اندازِ بیان، سوز و گداز، تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہی اور ہر چند بعض لوگ تلسی داس کو سورداس پر ترجیح دیتے ہیں لیکن غالبًا حقیقت یہ نہیں ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ سورداس آفتاب ہی اور تلسی داس ماہتاب اور کیشوداس ستاروں کا مجموعہ دربار اکبری کے کسی شاعر نے لکھا ہی کہ "گنگ عاشقانہ شاعری کا مالک ہی اور بیربل کبت کا اور کیشو بلاغت کا لیکن سورداس ان سب کا بادشاہ ہی"

سورداس ایک جگہ گوپال کے فراق میں لکھتا ہے کہ:-

"گوپال نہیں ہے تو یہ کنج کیسے سنسان نظر آتے ہیں۔ جب وہ یہاں تھا تو درختوں کی بیلیں کیسی خنک نظر آتی تھیں لیکن اب آگ کا شعلہ معلوم ہوتی ہیں کوئی پوچھے کہ اب جمنا کیوں بہ رہی ہے، چڑیاں کیوں چہچہا رہی ہیں، نیلوفر کیوں پھول رہے ہیں۔ بھنورے کس کے لیئے بھنبھنا رہے ہیں"

سورداس کہتا ہے کہ وہ مالک کے انتظار میں میری آنکھیں گھونگچی کی طرح سرخ ہوگئی ہیں۔

چوراسی ورتا اس عہد کی ایک خاص تصنیف چوراسی ورت بھی ہی (یعنے چوراسی افسانے) مشہور ہے کہ اس کا مصنف گوکل ناتھ، بٹھل ناتھ کا بیٹا تھا جس کا زمانۂ ترقی ۱۵۶۸ء ہے۔

یہ تصنیف بھگت مالا سے پہلے کی ہے اور اسمیں مقلدین بلبھ چاریہ کے بہت سے افسانے پائے جاتے ہیں، لٹریری نقطۂ نظر سے یہ کتاب اسلیئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، کہ ہندی نثر کی اگر سب سے نہیں تو کم از کم بہت قدیم کتاب ہے۔

اسکی زبان نہایت صاف و سہل ہے اور ہر چند اب سے ۳۵۰ برس قبل لکھی گئی تھی لیکن موجودہ زبان

سے زیادہ فرق نہیں ہے۔

دوسرے بلبھ چاری شعرا بھگوان ہت (۱۵۷۴ء) کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بٹھل ناتھ کا شاگرد تھا، اس نے کرشن کی عاشقانہ زندگی کا حال خوب لکھا ہے۔ ایک مسلمان رس خان بھی قابل ذکر ہے اس کا زمانہ ترقی ۱۶۱۴ء تھا اس کا نام پہلے سید ابراہیم تھا، لیکن بعد کو یہ کرشن پرست ہو گیا، اور اسنے نہایت موثر انداز میں کرشن کی مدح و ثنا بیان کی، رس خان کا ایک شاگرد قادر بخش بھی تھا اس نے بھی ہندی میں اچھی شاعری کی ہے۔

رادھا بلبھی ۱۵۸۵ء میں ایک اور نئی جماعت بندرابن میں پیدا ہوئی، جسے رادھا بلبھی کہتے ہیں۔ یہ طبقہ کرشن جی سے زیادہ رادھا کا پرستار ہے، اس کا بانی ہری ونس تھا جسے ہت ہری بنس اور ہت جی بھی کہتے ہیں۔ اس کے باپ کا نام ویاسا تھا جو قوم کا گور برہمن تھا، اور دربار شاہی کا ملازم تھا ہری بنس نے ایک کتاب سنسکرت میں رادھا سدھا ندھی ۱۷۰ اشعار کی لکھی ہے اور ہندی میں خاص کتاب چوراسی پد پریم لتا ہے"

بہ حیثیت شاعری (اظہار جذبات کے ہری بنس کا درجہ بہت بلند ہے، اس جماعت میں اور بھی متعدد شاعر ہوئے ہیں جنمیں سے ناگری داس (جو سولھویں صدی کے آخر میں مشہور ہوا) دھرو داس (جس کا زمانہ ترقی ۱۶۳۰ء ہے) اور برندابن داس جی (جس کا زمانہ ترقی ۱۷۴۳ء ہے) خاص دور سے قابل ذکر ہیں

ہری داس بندرابن میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی جسے ہری داسی کہتے تھے، اس کا بانی سوامی ہرداس تھا، یہ آخر سولہویں صدی میں پیدا ہوا اور شروع سترہویں صدی میں مرگیا۔ ہری داس کے ہندی کلام میں سدھارن سدھانت اور رس کے بدخوب کتابیں ہیں، ہندی شعرا کی صف میں ہری داس بھی بہت ممتاز نظر آتا ہے،

ہری داس کے بعد اس جماعت کا سردار بٹھل بپل ہوا اور پھر بہارنی داس، یہ دونوں شاعر تھے موخرالذکر کا کلام بہت ہے، اس کے بعد ۱۷۲۳ء میں ستیل اس جماعت کا سردار ہوا، یہ بھی اچھا شاعر تھا، ایک اور شاعر سہچری سرن (۱۷۶۳ء) بھی اس جماعت سے متعلق تھا، اسکی تصانیف میں للت پرکاش بہت مشہور ہے جسمیں ہری داس بانی اول کے مقولے درج ہیں۔

اور شعرا ناگر داس (تقریباً ۱۷۵۵ء)(؟) گدادھر بھٹ (۱۶۶۵ء) بھی کرشن پرست شاعر تھا اور چیتنیا جماعت سے متعلق تھا، اس نے

بھی کرشن کی تعریف میں اچھے اچھے دوہے لکھے ہیں،

بہاری لال چوبے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ بھی پرستارانِ کرشن میں سے تھا، علاوہ ان کے اور شعراء بھی اس اعتقاد کے ہوئے ہیں جنمیں سے خاص یہ ہیں۔

تاج جس کا زمانہ سترہویں صدی کے آغاز میں ہوا ہے، ایک مسلمان عورت تھی، جو بعد کو کرشن کے پرستاروں میں داخل ہوگئی، اس کا کلام سوز و گداز کا بہترین نمونہ ہے۔

کھیشم (۱۶۵۰ء) اس نے بھگوت پران کے دسویں باب کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا اور اس کا نام بالمکند لیلا رکھا۔

بخشی ہنس راج، (۱۷۳۲ء) یہ بنا کا کایستھ تھا اور اچھا شعر کہتا تھا، اس نے رادھا اور کرشن کے حالات زندگی لکھے ہیں، سینہ ساگر اسکی مشہور کتاب ہے،

مان، میواڑہ کا برہمن تھا، اس نے ۱۷۶۱ء میں کرشن کھانڈ اکا ترجمہ ہندی میں کیا، اور اس کا نام کرشن کلول رکھا۔

رزمیہ شاعری

(۱۵۵۰-۱۸۰۰ء)

میواڑ نہ صرف راجپوتانہ بلکہ ہندوستان کے تمام حصص میں رزم گو شعراء کا وجود بہت حال کے زمانہ تک پایا جاتا تھا، اور میواڑ خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کا سرپرست تھا، رانا جگت سنگھ فرمانروائے میواڑ کے حالات جس نے ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۴ء تک حکومت کی کسی رزم گو شاعر ہی نے جمع کئے تھے اور اس کا نام جگت بلاس رکھا گیا تھا، جگت سنگھ کے بعد رانا راج سنگھ فرمانروا ہوا اس کا زمانہ ۱۶۵۴ء سے ۱۶۸۱ء تک ہوا، یہ اورنگ زیب کا مشہور دشمن اور اس نوع کے شعراء کا بڑا سرپرست تھا، اس کے زمانہ کے حالات بھی کسی غیر معلوم بھاٹ ہی نے مرتب کئے تھے جس کا نام راج پرکاش ہے، رانا راج سنگھ کے دربار میں ایک بھاٹ ملک الشعراء کی خدمت پر مامور تھا جس کا نام مان تھا، اس نے راج سنگھ اور اورنگ زیب کے باہمی جنگ کے حالات، راج دیو بلاس میں یکجا کر دیئے تھے، اس کے دربار میں ایک اور شاعر سداسیو (۱۶۶۰ء) بھی تھا جسنے راج سنگھ کی سوانح زندگی راج رتناکر کے نام سے مرتب کیئے۔

راج سنگھ کے بعد اس کا بیٹا جے سنگھ فرمانروا ہوا (۱۶۸۱ء-۱۷۰۰ء) یہ بھی شعراء کا سرپرست تھا، اس نے اپنے دربار کے شعراء سے ایک کتاب جے دیو بلاس تصنیف کرائی جسمیں تمام اُن بادشاہوں کا حال ہے جن سے جے سنگھ نے مقابلہ کیا تھا،

میواڑ کا ایک اور مشہور بھاٹ، رن چھور تھا، جسنے وقائع میواڑ کو یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام راج پٹنا رکھا،

مارواڑ مارواڑ راج بھی بھاٹوں کا بڑا سرپرست تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراج سور سنگھ نے ایک بار چھ لاکھ روپیہ چھ شاعروں کو ایک دن میں تقسیم کر دیئے۔ اس کا بیٹا گج سنگھ اور پوتا امر سنگھ تھا یہ بھی شعراء کی سرپرستی میں سور سنگھ کے نقش قدم پر چلے۔

یہ امر سنگھ وہی ہے جو اپنے باپ سے لڑ کر شاہجہاں کے دربار میں چلا گیا تھا اور وہاں کسی بات پر ناخوش ہو کر خود شاہ جہاں کے قتل کرنے کی فکر میں تھا، چنانچہ بعد کو یہ بادشاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

امر سنگھ نے جن شعراء کی سرپرستی کی ان میں ایک بنواری لال بھی تھا جس نے اپنے آقا کی تعریف میں بہت سی نظمیں لکھیں اور دوسرا رگھوناتھ رائے تھا،

برج باسی داس، یہ بھی کرشن پرست طبقہ اور ولبھ چاری جماعت کا مشہور شاعر تھا، ۱۷۶۰ء میں اس نے ایک کتاب برج بلاس لکھی جسمیں کرشن جی کے حالات دوران قیام بندرابن کے درج ہیں۔

سندری کنوری بائی (۱۷۶۰ء-۱۷۹۸ء) یہ راج سنگھ مہاراج روپ نگر و کرشن گڑھ کی بیٹی تھی، اسکی شادی بلبھدر سنگھ مہاراجہ راگھوگڑھ سے ہوئی تھی، اس کے خاندان میں بہت سے لوگ شاعر ہوئے ہیں۔ تعریف کرشن میں اسنے بہت سی نظمیں لکھی۔

منچت دوج (۱۷۷۹ء) یہ بندیلکھنڈ کا باشندہ تھا، اس نے اپنی کتاب سر بھی دان لیلا میں کرشن جی کے حالات ایام طفولیت کے اور کرشنا میں بھی شباب اور آخر عمر کی نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیئے ہیں۔

بی بی رتن کنور، بنارس کی رہنے والی تھی اور ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئی تھی، یہ راجہ شیو پرشاد کی دادی تھی اور انیسویں صدی میں ہندی لٹریچر کی ترقی بہت کچھ اسکی مساعی سے ہوئے اسکی ایک کتاب پریم رتن ہے جسمیں پرستاران کرشن کے حالات درج ہیں علاوہ اس کے اور کتابیں بھی اسنے تصنیف کیں۔

عام تبصرہ کرشن جی کے متعلق جسقدر بھی شاعری پائی جاتی ہے اسمیں زیادہ تر اس محبت سے بحث کی گئی ہے جو کرشن جی کو برج کی گوپیوں اور خصوصیت کے ساتھ رادھا سے تھی۔

تحریک بھگتی کے بڑے بڑے معلمین نے کرشن جی کے ان افسانوں کی بہت سی عارفانہ اور صوفیانہ تاویلیں کی ہیں انہوں نے کرشن کو خدا سمجھکر رادہا اور گوپیوں کو ارواح انسانی سے تعبیر کیا ہے،

اس طبقہ کے جسقدر شعرا گزرے ہیں وہ تقریبًا سب نہایت اچھا کہنے والے تھے، اور فن شاعری کے لحاظ سے بھی وہ قابل تعریف ہیں، چونکہ متھرا مغلوں کے دار الحکومت آگرہ سے بہت قریب تھا اور آگرہ علوم و فنون کی ترقی کا مرکز بنا ہوا تھا اسلیئے متھرا کے شعرا پر اس کا اثر ہونا چاہیئے تھا اور یہی وجہ ہے کہ کرشن پرست طبقہ کے شعرا نے فن کے لحاظ سے بھی کافی ترقی کی جس کا امتیاز مسلمانوں کی رواداری کو حاصل ہے۔ (باقی)

کیا ہو جاؤں میں؟

چاہتا ہوں چھوڑ کر سب کو ترا ہو جاؤں میں — یعنی بس لذت کش لطف فنا ہو جاؤں میں
پہلے پہلے مدعا اپنا بناؤں میں تجھے — رفتہ رفتہ پھر حریف مدعا ہو جاؤں میں

بلبلوں کو مست کر دوں نالۂ دل سوز سے — اسقدر رنگیں بیاں، رنگیں نوا ہو جاؤں میں
نغمۂ دلکش سے میرے گونج اٹھے کائنات — ذرہ ذرہ میں اثر بنکر فنا ہو جاؤں میں

شام غربت میں نظر آئے سواد صبح عیش — غازۂ روئے بہار جانفزا ہو جاؤں میں
کچھ نہ ہو احساس اپنی کس مپرسی کا مجھے — بے نیاز التفات و مرحبا ہو جاؤں میں

یہ تو امکانات عالم ہیں مگر ان کے سوا — چاہتا ہوں میں کہ اس سے بھی سوا ہو جاؤں میں
تیرے صدقے تو ہی بتلا دے خدارا کچھ مجھے — کیا نہ ہونا چاہیئے تھا، اور کیا ہو جاؤں میں؟

عرفان محمد خاں ناطق

زبانِ اُردو

(سلسلۂ گزشتہ)

تقلید!! حضرات! اردو کے متعلق جو اعتراضات ہیں وہ کم و بیش آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے، میری فہم و استعداد اور آپ کے صبر و تحمل نے جہاں تک مساعدت کی، ان کے جوابات بھی عرض کر دیئے گئے، مجھے ایک امر کے متعلق اور عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اُردو پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق ہے وہ اُردو کی مختلف اقسام کی تحریر پر کیوں نہیں نظر ڈالتے، وہ لوگ جو عربی فارسی جز ثقیل اور خطابت کے دلدادہ ہیں، مولینا ابوالکلام آزاد صاحب کی تحریریں پڑھیں اور لطف اندوز ہوں جو لوگ سنجیدہ، متین اور علمی طرز تحریر کے دلدادہ ہیں وہ مولانا عبدالماجد صاحب بی اے اور ارباب دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے طرز انشا سے سبق حاصل کریں، جو لوگ سُستہ، سلیس اور آسان اُردو پر سر دھنتے ہیں انکو مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جو لوگ رنگینی، لطافت لوچ اور انشاء جمیل کے طلبگار ہیں انکو مولانا نیاز فتحپوری کا اتباع کرنا چاہیئے کچھ لوگ حزن اور حسرت و غم کی مصوری پسند کرتے ہیں ان کو مولانا راشد الخیری (مصور غم) کی پیروی کرنی چاہیئے، مضحکات اور طنزیات کا رنگ مطلوب ہو، تو ڈاکٹر نذیر احمد، سجاد حسین اور سید محفوظ علی صاحب کا رنگ اختیار کیجیئے، اگر کوریت پسند خاطر ہو تو شباب اردو کی صفحہ گردانی کیجیئے۔ چٹکیاں اور گدگدیاں منظور ہوں تو خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کیجیئے۔ بہرحال کوئی رنگ اور کوئی درجہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شخص کے لیئے موزوں نہ ہو، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، ارباب وطن اُردو کو کیوں اس درجہ قابل عتاب تصور فرماتے ہیں۔ یہاں غالباً میرا یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اُردو کو مشکل بتاتے ہیں اس واقعہ سے بے خبر نہ ہونگے کہ کعبۂ ہندوستان بنارس سے خود ایک ہندی کا روزانہ اخبار شائع ہوتا ہے جس کی عبارت خاص طور پر مشکل رکھی جاتی ہے، اور اسی باعث سے اسکی اشاعت بھی کچھ بہت زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ مالک اخبار نے اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا گیا اور اس نے متعدد بار یہی جواب دیا کہ مالی مشکلات کی طرف سے کارکنان مطبع کو بے فکر رہنا چاہیئے، وہ بہر نوع اس کا کفیل رہےگا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام مشکل ہندی سمجھنے اور لکھنے کے عادی بنائے جائیں!

حضرات! بایں ہمہ ابھی اُردو میں اصلاحات کی گنجائش ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے، میں اس سلسلہ میں فی الحال دو امور خاص طور پر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اول تو یہ کہ اُردو کی تعلیم کیونکر دینی چاہیئے دوسرے یہ کہ اُردو لکھنے میں کن کن پابندیوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے اور اپنی اس ہزیمت پر ندامت ہے کہ جس چیز کو میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابل پرہیز سمجھتا تھا، وہ آج لامحالہ کرنی پڑتی ہے، یعنے کسی موضوع بحث کا تجزیہ اور اسکی تقسیم اور ترتیب (بالفاظ دیگر classification) تقسیم اور ترتیب فی نفسہ معقول چیز ہے، اور ناظرین یا سامعین کو مرعوب کرنے کا اس سے بہتر اور موثر کوئی طریقہ نہیں ہے لیکن ذوق شعری اور لطف ادب کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنا جو ایک ماہر علم افعال الحیات یا علم نباتات کسی نقیب بر شگال یا حسین شگوفہ کے ساتھ جائز رکھتا ہے، کہاں تک ہماری سخن فہمی اور ادب نوازی کی دلیل ہے، ایک سوال ہے جس کا جواب لطیب خاطر نہیں تو کم سے کم بنظر تالیف قلوب آپ میرے موافق ہی دینگے،

تعلیم اُردو

حضرات! اس تقسیم اور ترتیب سے پہلے میں یہ عرض کرونگا کہ تعلیم اردو کے لیئے ہر معلم کو سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ زبان کی تعلیم دیگر علوم اور فنون کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے، زبان کے علاوہ بیشتر علوم ایسے ہیں جن کو آپ ایک حد تک متشکل کر کے ہر طالب علم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم آپ مختلف اقسام کی تصاویر، نقشوں اور خود مخصوص مناظر فطرت یا مقامات متعلقہ کو پیش نظر کر کے دے سکتے ہیں اور وہ بھی اس طور پر کہ وہ تمام عمر فراموش نہیں کیئے جا سکتے، سائنس کی تعلیم آپ اس طور پر دے سکتے ہیں گو یا ہر طالب علم کے سامنے نوامیس فطرت خود بے نقاب ہو رہے ہیں۔ صنعت اور دستکاریوں کے نمونے آپ خود پیش کر سکتے ہیں اور ہر طالب علم ان کو دیکھکر اور چھو کر بسا اوقات جلد سے جلد ایک دستکار اور صنعت گر بن سکتا ہے، لیکن علم ادب کے میدان میں اعضاو جوارح کام نہیں دیتے یہاں ذہن و دماغ کی کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ذہن و دماغ ایسی چیزیں نہیں ہیں جنکو مارشل لا یا ماسٹر صاحب کا خوف ہو، ان پر دسترس حاصل کرنے کے لیئے ذہن و دماغ ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد شاعر بنایا جا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ شاعر پیدا ہی ہوتا ہے، لیکن کوئی شخص جلد سے جلد ادیب نہیں بنایا جا سکتا، ہر وہ چیز جو فطری ہے سہل ہے لیکن جہاں تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یا تحصیل و اکتساب کا سوال آتا ہے وہاں ایسی دقتیں پیش آتی ہیں جن پر آپ سہولت کے ساتھ عبور نہیں حاصل کر سکتے اسلیئے میں یہ آپ سے درخواست کرونگا کہ آپ تعلیم زبان کے مسئلہ کو بالکل ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں سب سے

پہلے جس امر کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ متعلم نہیں بلکہ معلم سے متعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب تک خود معلم صاحب ذوق، ہمدرد اور ذہین نہ ہوگا وہ طلبا کو اپنے موضوع تعلیم کا شائق نہیں بنا سکتا، آپ اس کلیہ کو ایک ادنیٰ حقیقت پر محمول کرینگے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ادبیات کی تعلیم کے لیے صفات کی موجودگی لازمی ہے۔ بہرحال اب میں ان صفات کے متعلق کچھ عرض کروں گا، جو ایک اردو معلم کے لیئے میرے نزدیک ضروری ہیں۔

معلم کی صفات

(۱) معلم کو زبان فارسی پر کامل دستگاہ اور عربی پر وقوف حاصل ہونا چاہیئے، اس سلسلہ میں بھاشا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اُردو کے مشہور مصنفین کی تصانیف اور ان کا طرز انشا اسکی نظر میں ہو،

(۳) مروجہ اُردو کے ہر پہلو سے آشنا ہونا چاہیئے۔

(۴) وہ خود صاحب ذوق ہو اور طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہو۔

حضرات! میں نے تعلیم اردو کے لیئے فارسی کو لازمی قرار دیا ہے، اس کے خاص وجوہ ہیں۔ اُردو کے عناصر ترکیبی کچھ ہی کیوں نہیں ہوں اس حقیقت سے مشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اُردو زبان سے فارسی آب ورنگ حذف کر دیا جائے، تو پھر گلستان کے بجائے صرف ایک ذبیب رنگ و بورہ جاتا ہے، میرے بہت سے کرم فرما اُردو اور فارسی کو میرے ایک ہی سانس میں ادا کرنے سے شاید پہلو بدلنے لگیں۔

لیکن میں انکو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فارسی آب ورنگ اور فارسیت میں فرق ہے، بیشک ایسی اُردو جس پر بے ربط فارسی کا اطلاق ہو یا جو غیر مانوس عربی الفاظ سے مرکب ہو، قابل پذیرائی نہیں ہے، اُردو کی تعمیر میں عربی فارسی کو جیسا کچھ دخل رہا ہے اسے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو کو موجودہ حالت میں لانے کے لیئے جس حد تک یہ دونوں زبانیں ذمہ دار ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ اسمیں عربی اور فارسی کی آمیزش اب بھی اسی نسبت سے ہونی چاہیئے، کیونکہ اردو اپنے ابتدائی مراحل طے کر چکی ہو اب ان اسباب اور ذرائع پر ضرورت سے زیادہ زور دینا روا نہیں ہے جنپر کاربند ہونا ابتدا میں ضروری اور لازمی تھا، میرا مقصد صرف ایک کلیہ پیش کرنے کا ہے، یعنے اُردو کے مصحف حسن میں فارسی خدوخال لازمی ہے یہاں خدوخال، محض حسن کی اضافی حیثیات نہیں ہیں اور اس کلیہ کو محض شاعرانہ حسن بیان پر محمول نہیں کرنا چاہیئے، پاکیزہ اُردو جسے میں بلا خوف تردید ہندوستان میں وہی حیثیت دینا چاہتا ہوں جو فرنچ

کو مغرب اور فارسی کو مشرق میں حاصل ہے، فارسی کے بغیر ایک جسد بے روح ہے۔ نظر برآں اگر معلم فارسی سے بالکل بے بہرہ ہے یا زبان سے آشنا ہے لیکن اسکی لطافتوں سے بیگانہ ہے یا اسے یہ ملکہ حاصل نہیں ہے کہ وہ کس طور پر فارسی کو اُردو کے مطابق بنا سکتا ہے، وہ طلبا کو یا تو صحیح راستہ پر نہیں ڈال سکتا یا ان کے ادبی ذوق کا معین نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص اسوقت تک اُردو کا اچھا معلم نہیں بن سکتا جب تک نہ صرف اسے فارسی پر عبور ہو، بلکہ اُردو پر بھی کامل دسترس رکھتا ہو، ہندوستان میں بہت سے لوگ ملیں گے جن کی فارسی قابلیت مسلم ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی اُردو بھی لکھ سکتے ہوں . . . .

. . . . بلکہ بعض مثالیں تو ایسی ملیں گی جہاں فارسی کا عالم متبحر اُردو کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک فارسی عالم اچھا اُردو نویس نہیں ہو سکتا، میرا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ جب تک کوئی اردو نویس اس حقیقت کو فراموش نہ کردے کہ اسے فارسی یا اُردو کے جر ثقیل پر پورا عبور ہے اسوقت تک وہ سلیس اور پاکیزہ اُردو لکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا، ایک تہمتن وقت سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے قوت اور صلابت کو برسرکار لاکر راستہ میں بڑی بڑی سنگلاخ چٹانیں یا تناور درختوں کو لاکر ڈال دے، اسکا کام یہ ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اسکے دشواریوں کو ایسا دور کرتا جائے کہ دوسروں کو چلنے میں آسانی ہو یا اس راستہ کو اختیار کرنے کی لوگوں میں جرأت پیدا ہو، اسلیئے ہر معلم کا فرض ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اسے اتنا سہل گزار بنادے کہ اسکے پیرووں کو چلنے میں سہولت اور آسانی ہو، اچھے اُردو نویس کم ایسے دیکھے گئے ہیں جنکو فارسی پر کم و بیش عبور نہ ہو، اردو داں حضرات کو ابھی نہیں معلوم ہے کہ ادبیات کی کتنی شاہراہیں ہیں اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، علمائے فارسی ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ کس سفر اور کس راستہ میں کس قسم کی زاد راہ یا اسباب کی ضرورت پیش آئیگی، اسمیں شک نہیں بہت سے علوم ایسے ہیں جہاں اُردو کی رسائی فی الحال ناممکن ہے لیکن اگر آپ اُردو کے استعداد جذب اور قوت الکتساب پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ یہ دشواری ایسی نہیں ہے جہاں صبر و شکر کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے، اسی سلسلہ میں عربی کے متعلق بھی اظہار خیال ضروری ہے۔ عربی مشتقات اور مصادر اگر کام میں نہ لائے جائیں تو پھر اُردو ایک بے مایہ زبان رہ جاتی ہے عربی ترکیبیں بعض اوقات اُردو کی بہت سی مشکلات دور کردیتی ہیں۔ بالخصوص تراجم میں عربی کی کارفرمائی

ناگزیر ہوتی جاتی ہے، اُردو میں جدید اصطلاحیں وضع کرنے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنکو اس فریضہ سے آج کل عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اسمیں شک نہیں بعض اوقات ہندی الفاظ بھی نہایت سہولت کے ساتھ کھپ جاتے ہیں لیکن ان میں خرابی یہ آن پڑتی ہے کہ تصریفی سہولتیں تقریبًا ناممکن ہوجاتی ہیں۔ عربی میں اسکی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے اسمار اور کبھی کبھی افعال جب اُردو میں منتقل ہوتے ہیں اسوقت ہم کو اکثر عربی سے مدد لینی پڑتی ہے، اس طور پر ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا دامن اُن تمام چیزوں کے لیئے وسیع اور موزوں ہے جنپر عربی اور فارسی کا عمل ہوچکا ہو، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معمولی معمولی الفاظ بھی عربی اور فارسی کی زد میں ثقیل اور گران بنا دیئے جائیں گے اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ مختلف آوازوں کو ایک ہی ساز سے ہوکر گزرنا چاہیے تاکہ موسیقی مکمل اور مرتب ہو اور سامع کو لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے، رہی بھاشا اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اسمیں علمی زبان ہونے کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے البتہ انشائے لطیف میں اس کا تصرف بعض اوقات نہایت سحر کارانہ ہوجاتا ہے، لیکن ایسی حالت میں جب صنعت کارانہ انداز بیان کی ضرورت ہوگی وہ آپ بزظاہر ہے

حضرات! دوسری صفت جو میں نے معلم کے لیئے لازمی قرار دی ہے، اس کا اردو مطالعہ ہے، یعنی اُردو کے مشہور مصنفین اور انشا پردازوں کی تصانیف اس کے مطالعہ سے گزری ہوں، میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں کہ اگر معلم پر صرف فارسیت غالب ہے تو وہ طلبائے اُردو کے لیئے ایک بہتر معلم نہیں بن سکتا ایک اُمدو معلم کے لیئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ اُردو کے مدوجزر، اس کے سموم وصبا، اسکی زیروبم سے بھی واقف ہو، اُسے یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اُردو فارسی کا محض ایک ضمنی حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل علیحدہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ فارسی نغمے اُردو ساز سے کس طور پر نکالے جاسکتے ہیں اُردو اور فارسی میں جو تناسب اور تعلق ہونا چاہیئے اسے میں شاعر کی زبان میں یوں ادا کرونگا۔

با من آویزشِ او الفتِ موج ست وکنار
دمبدم با من وہر لحظہ گریزاں از من

حضرات! تیسری صفت میں نے یہ پیش کی تھی کہ مروجہ اُردو کے ہر پہلو پر اس کی نظر ہونی چاہیئے اس شرط پر میں اسلیئے زور دیتا ہوں کہ اسوقت وسائل آمدورفت میں ترقی ہورہی ہے، مختلف خیالات متصادم ہورہے ہیں، مختلف زبانیں مخلوط ہورہی ہیں، اس کسروانکسار سے اُردو بے نیاز نہیں ہوسکتی اُسے اس کا لحاظ رکھنا

علم الحیات کے غرائب

(۱)

وجہ حیات

علم النفس کا مسئلہ ہے کہ جب کوئی چیز ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتی ہے تو اسکی تمام ندرتیں مٹ جاتی ہیں اور فطرت انسانی اسکی غائر مطالعہ نہیں کرتی،

ہر شخص زندگی کے مفہوم سے واقف ہے اور ہر اس چیز کو جو چلتی پھرتی نظر آتی ہے "زندہ" کہتا ہے، مگر اس حقیقت پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ یہ جاندار چیزیں کسطرح اس شکل تک پہونچیں۔

وجہ حیات سے میرا مدعا وہ میکانکی عمل ہے جو ایک ہستی کو زندگی دینے کے لیئے ظاہر ہوتا ہے، اور اسی کے اصول و خصوصیات کو موضوع سخن قرار دیتا ہوں،

لیکن قبل اسکے کہ میں اصل مضمون کو شروع کروں، یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن چیزوں کو پہلے واضح کردوں جو زندہ کہلاتی ہیں اور یہ کہ انکی بڑی تقسیم کیا ہے، سب سے پہلے عالم حیوانات کو لیجیئے جس کے متعلق کسی کو شک نہیں۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اُن میں زندگی ہے یعنی ایک پنجرہ (Skeleton) کے علاوہ کوئی چیز اور بھی ہے جو اسے نقل و حرکت کا حکم دیتی ہے، دوسری قسم عالم نباتات ہے جسکو موجودہ تحقیق نے زندہ ثابت کردیا ہے، گو عالم حیوانات اور عالم نباتات کی زندگی میں فرق ضرور ہے۔ جسطرح حیوانات کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے (جو زندہ رہنے کے لیئے ایک شرط ہے) اسی طرح نباتات کو بھی ہے، مگر ان دونوں کی خوراک کیمیائی اجزا پر منقسم ہوتی ہے اور بال کی طرح باریک جڑوں اور پتیوں کی نچلی سطح پر جو سیکڑوں موہنہ ہوتے ہیں اُن کی راہ سے بدن میں داخل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جسطرح حیوانات میں خاص ہیجیات (Stimulations) کے اثر سے خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اسیطرح نباتات کا حال ہے، یعنے جسطرح حیوانات میں نظام عصبی ہوتا ہے اسیطرح نباتات میں بھی ہے۔ مثلاً ایک چھوٹا پودا موسا ہے جو ہاتھ لگانے سے اپنے چھوٹے چھوٹے پتے جو ایک ٹہنی کے دونوں طرف ایک قطار میں ہوتے ہیں سمیٹ لیتا ہے گویا کہ اسکو چھونا ایک آنے والے خطرہ سے

آگاہ کرتا ہے، ایسے پودھے بھی ہیں جو مکھیوں اور پانی کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو اپنے بدن میں قید کر لیتے ہیں اور ایک سیال مادہ ملا کر جانور کو اسمیں غرق کر کے جذب کر لیتے ہیں۔ بعض سائنس داں یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ عالم جمادات بھی زندہ ہے اور اُن کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ مختلف اقسام کے پتھر حرارت اور دباؤ کے اثر سے مختلف اقسام کے بلورات (Crystals) بناتے ہیں یہ بلورات کیمیائی عمل سے بنتے ہیں جسطرح کیمیائی عمل سے انسان کے معدہ میں خوراک ہضم ہوتی ہے، اسی طرح ایک قسم کا پتھر ہمیشہ ایک ہی قسم کے بلورات بنائیگا خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے،

عام اصول کی بناء پر ایک چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک سب حیوانات میں اپنی جنس کا ایک نیا فرد پیدا کرنے کے لیئے ایک ہی طریق عمل نظر آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ نر ایک حرکت کرنے والی چیز جسے مادۂ منویہ (sperm) پیدا کرتا ہے اور مادہ ایک ساکت چیز جسے بیضہ کہتے ہیں (ovum) پیدا کرتی ہے اسکی ماہیت بالکل ایک مرغی کے انڈے کی سی ہے یعنے ایک حصہ زردی (yoke) کا ہے اسکے اوپر غلاف سفیدی (albumen) کا ہے اور زردی سے لگا ہوا ایک طرف مادۂ حیات ہے، جب مادۂ منویہ کا کوئی حصہ (ovum) کو ٹکرا کر اسمیں داخل ہوتا ہے تو (ovum) ——— میں جو پہلے بے حس دیوار سے لگا ہوتا ہے ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہوجاتی ہے، اور اسمیں اب جدید عمل شروع ہوجاتا ہے،

یہ تو ہیں عام اصول۔ اب چند خصوصیات کو بیان کرتا ہوں جن میں سے بعض کا علم تو ہوگیا ہے اور بعض غیر معلوم ہیں۔ سب سے پہلے آدم کا خود پیدا ہونا۔ موجودہ سائنس اس وجہ زندگی کی مکانکیت (mechanism) بیان کرنے سے قاصر ہے۔

دوم حوّا کی پیدائش۔ یہ بھی نہایت غیر معمولی مثال ہے جس کا حل ناممکن ہے۔

سوم۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش، یعنی کہ صرف مادہ سے ایک ہستی کا پیدا ہونا۔ اس کا جواب سائنس کے پاس ہے اور اب بھی یہ وجہ پیدائش عمل میں آتی ہے اسکی مثال میں ایک درخت پیش کیا جا سکتا ہے جس کا نام پیپایا یا پپیتا ہے اور علمی اصطلاح میں اسے (Carica Papaya) کہتے ہیں۔ یہ بنگال۔ آسام اور جزیرہ لنکا میں بہت اُگتا ہے۔ اس درخت کی دو قسمیں ہوتی ہیں یعنی نر اور مادہ۔ نر درخت پر محض پھول لگتے ہیں اور مادہ درخت پر بغیر نر درخت کے مس کے پھل پیدا ہوتا ہے، اور پھل میں بیج۔ یعنے پھل اور بیج پیدا ہونے

کے لیئے نر مادہ کے اتصال کی بالکل ضرورت نہیں۔

چہارم۔ ایک ہی ہستی میں نر اور مادہ دونوں کے اجزا پیدا ہونا اور پھر ان دونوں اجزا کا ملحق ہو کر انڈا پیدا کرنا جسکی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے، مثلاً ایک کیڑا ہے جس کا نام ٹینیا Taenia ہے، اس کیڑے کا بدن ایک لمبے فیتے کی مانند ہوتا ہے یہ فیتہ چھلے دار ہوتا ہے یعنے سارا لمبا بدن بہت سے چھلوں یا حصوں پر منقسم ہوتا ہے، ہر ایک حصہ بجائے خود مکمل (mature) ہوتا ہے اور ہر حصہ میں نر (Sperm) اور مادہ (ovum) پیدا کرنے کے اعضا ہوتے ہیں۔ (Sperm) اور (ovum) کے الحاق سے انڈا بنتا ہے اور پھر اسکے اوپر چھلکے کا غلاف بنتا ہے، جیسے مرغی کے انڈے کا۔ ایسے جانور یا درخت کو (Hermaphrodite) کہتے ہیں۔

پنجم۔ ایک ہستی پرورش پاکر بڑہتے بڑہتے اسقدر ہو جاتی ہے کہ پھر اسے اپنے سارے بدن تک خوراک پہونچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے وجود اور وجود کے ہر ایک مادہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے، ان میں سے ہر ایک حصہ اب بجائے خود ایک بچہ ہوتا ہے اور پرورش پاکر بڑھتا ہے، اسکی مثال ایک نہایت چھوٹا جانور ہے، جو صرف ایک طاقتور خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے، جس کا نام پیرامیسیم (Paramecium) ہے اس جانور کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ دیکھنے میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مندرجہ بالا تفریق (Fission) کے بعد ہر فرد علیحدہ ہو جاتا ہے تو وہ کسی قدر کمزور ہوتا ہے، اسلیئے چند نسلوں کی تفریق کے بعد دو جانور (یاد رہے کہ ان میں نر مادہ کی تقسیم نہیں اور سب جانور بالکل یکساں ہیں) آپسمیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور دونوں بدنوں کی دیواریں تحلیل ہو کر دونوں جانور مستقل ہو کر ایک ہو جاتے ہیں اس اتصال سے جو جانور بنتا ہے وہ نہایت قوی ہوتا ہے اس تقویت کے بعد پھر اسی ایک کے دو حصے ہوتے ہیں اور دو علیحدہ فرد بنجاتے ہیں،

ششم۔ چند جانور اپنے جسم سے ایک چھوٹا حصہ (Bud) ابھار کر اسے علیحدہ کر دیتے ہیں جو پھر خود پرورش پاکر بڑھتا ہے، اسکی مثال معمولی سپنج (Sponge) کی ہے جس سے اسکول کی چھوٹی جماعتوں کے لڑکے بہت واقف ہیں۔

ہفتم۔ بعض جانور جب پوری پرورش پاکر زیادہ بڑھنے کی قوت نہیں رکھتے تو ان پر ایک آرام کی

سی حالت طاری ہوجاتی ہے، اسی حالت میں وہ ایک گیند کی سی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور اپنے اوپر ایک غلاف سا بنا لیتے ہیں مگر اس غلاف کے اندر انکے جسم میں تقسیم شروع ہوتی ہے، اسی تقسیم کا عمل پورا ہونے کے بعد غلاف پھٹ جاتا ہے اور اسکے اندر سے ۸ - ۱۶ - ۲۰ یا زیادہ افراد نکلتے ہیں ان میں سے ہر ایک (Spore) کہلاتا ہے اور اسی طریق ازدیاد کو (Spore - formation) کہتے ہیں۔ اسی قسم کی وجہ حیات اس جانور میں پائی جاتی ہے جو انسان کے خون کے (Haemoglobin) میں پرورش پاکر وہ بیماری پیدا کرتا ہے، جس کا نام ملیریا ہے، واضح ہو کہ یہ ہمیشہ انسان کے بدن میں نشو و نما نہیں پا سکتا جب تک کہ اسکی زندگی کا ایک حصہ مچھر کے پیٹ میں نہ گذرے۔ اسلیئے جس علاقہ میں ملیریا بخار ہو وہاں مچھروں کو اپنے بدن پر بیٹھنے نہیں دینا چاہیئے۔

ہشتم۔ وجہ حیات کا وہ طریق ہے جسمیں دو درجے پائے گئے ہیں ایک درجہ میں تو (Sexual reproduction) یعنے نر اور مادہ اجزا کا الحاق پایا جاتا ہے، اور دوسرے درجہ میں (asexual reproduction) ہوتا ہے یعنی صرف ایک ہی مادہ سے نیا فرد پیدا ہوتا ہے اس وجہ حیات کو خاص اصطلاح میں (alternation of generation) کہتے ہیں یعنی نسل کا یکے بعد دیگرے دو طریق سے پیدا ہونا، اسکی مثال ایک پودہ سے دیجاتی ہے جسکے عام نام (Fern) ہے اگرچہ یہ طریق ازدیاد نسل حیوانات میں بھی پایا گیا ہے، آپ نے کبھی (Fern) کے خوبصورت پتوں کے نچلی سطح پر کچھ دانہ دار آبلے سے دیکھے ہونگے، ان آبلوں میں سے تک کر دانے (Spore) نکلتے ہیں، ان کے لیئے لازمی ہے کہ مرطوب زمین پر گریں جہاں ہر دانہ سے ایک چھوٹا سبزی مائل پتے کی مانند (Pro- Thallus) بنتا ہے جب یہ (Prothallus) پورا اُگجاتا ہے تو اسکی ایک طرف کی سطح سے دو مختلف قسم کے اجزا یعنی نر اور مادہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا آپسمیں الحاق ہوتا ہے اور پھر اس الحاق سے ایک نیا پودا (Fern) پیدا ہوتا ہے۔

(ملک) عبدالرشید (بی۔ایس۔سی)

فنونِ لطیفہ

یار از مہر گیرد آئینۂ خود آرائی را
تا سراسیمہ کند چشم تماشائی را

مناظر قدرت، اور صحیفۂ فطرت میں، اسقدر دلچسپیاں اور دل آویزیاں پائی جاتی ہیں، کہ اگر دنیا کے سارے شاعر، جنہیں شاعری کا گراں قدر ورثہ فطرت کی طرف سے ملا ہو، رات دن، اور عمر بھر منہمک رہکر، انہیں بیان کرنا چاہیں تو ممکن نہیں ہے، ہر منظر قدرت، اور صحیفۂ قدرت کی ہر ہر سطر بجائے خود ایک دفتر ہے، اور ہر دفتر میں فنون متعارفہ، اور فنون لطیفہ کے اسقدر اشکال و ہیات پائی جاتی ہیں کہ انسان اُن پر غور کرتے کرتے حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔

گلگونِ اشک گرم عنانی مرا بس است
شوق بہ کوئے دوست رسانی مرا بس است

جب ہم ذرا غور سے صحیفۂ قدرت کا مطالعہ کرتے ہیں، تو رفتہ رفتہ، یہ بات ذہن نشین ہوتی جاتی ہے، کہ ہم اپنی آرائش اور اپنے حسن زندگی کا سامان سب کچھ اسی خزانہ سے پاتے اور قدرت ہمیں اپنی فیاضی سے بہت کچھ مفت دے رہی ہے۔ علاوہ اسکے کائنات کا ہر ہر منظر ہمارے لیئے علوم متعارفہ اور فنون لطیفہ کا سامان بھی کثرت سے مہیا کرتا ہے۔

فنونِ متعارفہ فنون متعارفہ سے وہ فنون مراد ہیں، جو معاشرت کے عام سلسلوں سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جاسکتا، کہ فنونِ متعارفہ علمی دائروں سے باہر ہوتے ہیں یا دل و دماغ سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا، ہوتا ہے، مگر عامیانہ رنگ میں، یا یوں کہیئے کہ فنون متعارفہ وہ ہیں جو فنون لطیفہ کے مبادیات میں داخل ہیں، جب کبھی صنعت و حرفت کا نام لیا جاتا ہے، تو اُس سے مراد عموماً فنون متعارفہ ہوتے ہیں نہ کہ فنون لطیفہ۔ کیونکہ ان میں بمقابلہ فنون لطیفہ کے خصوصیت اور اہمیت زیادہ نہیں پائی جاتی۔

فنونِ لطیفہ کی قسمیں فنون لطیفہ کی پانچ قسمیں ہیں
(۱) فن شاعری (۲) فن موسیقی (۳) فن مصوری (۴) فن سنگ تراشی، (۵)

(۵) فن تعمیر

اگرچہ پانچوں فنون ایک دوسرے سے جدا جدا معلوم ہوتے ہیں، اور جب ان میں سے کسی ایک کا ذکر آئے، تو دوسرے کا ساتھ ہی دہیان نہیں آتا، اور کوئی شخص شاعری کے ذکر سے، موسیقی، اور مصوری کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ شاعر کو موسیقی داں، اور مصور کہا جا سکتا ہے، لیکن اس پر بھی جب ہم مزید غور سے کام لیتے ہیں، تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان میں باہم نسبت مشارکت ضرور پائی جاتی ہے، اور ان فنون کا تخیل و تصور ایک ہی اصول کے ماتحت ہوتا ہے، ایک ہی خیال سے ان کی بنیاد پڑی ہے، اور ایک ہی قسم کی دل آویزی ان سب میں پائی جاتی ہے، جس طرح چار عنصروں میں ایک ہی نسبت ہوتی ہے، یعنی جس طرح باوجود اختلاف کے بھی، پانی ہوا ہوجاتا ہے، ہوا پانی بنجاتی ہے، اسی طرح ہر فن لطیفہ دوسرے فن لطیفہ سے ایک نسبت رکھتا ہے، شاعری، اور مصوری یا مصوری اور فن تعمیر میں بظاہر کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ کچھ مغائرت نظر آتی ہے، مگر باوجود اس کے بھی، ان میں ایک نسبت ضرور ہے۔ شاعر اپنے رنگ میں معمار بھی ہے اور مصور بھی، اگر معمار مختلف اینٹیں چن کر اُن کی موزونیت کا ذمہ دار ہوتا ہے، اگر مصور تصویر کے نقوش کی صحت کا کفیل ہے، تو ایک شاعر بھی حروف، الفاظ، فقرات، اور جملوں کی نشست و موزونیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

فنون متعارفہ میں بھی اگرچہ یہ التزام ہوتا ہے، مگر فنون لطیفہ میں یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے فنون متعارفہ میں سے مثلاً، کاشتکاری، فلاحت، نجاری اور آہنگری وغیرہ فنون تو ہیں، مگر انہیں نفس فنون کے اعتبار سے وہ اہمیت اور عظمت حاصل نہیں جو فنون لطیفہ کو حاصل ہے

فنون لطیفہ اگر غور سے کام لیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ فنون لطیفہ، فنون متعارفہ ہی کی ترقی یافتہ شاخیں ہیں، یہ فنون انہیں میں سے نکلے، اور انہیں کی مختلف صورتیں ہیں فرق یہ ہے کہ فنون متعارفہ چند منزلیں طے کر کے رہ گئے، اور یہ آگے بڑھ گئے۔ وہ عوام کے ہاتھوں میں موٹی موٹی ضروریات زندگی کے تحت جا پڑے اور ان کو آغوش مشاہیر و حکماء میں جگہ ملی، فنون متعارفہ کے خواہاں عام لوگ رہے، اور فنون لطیفہ کی مشتاق وہ ہستیاں ٹھہریں جن کی فطرت ہی اُن کے لیئے موزوں تھی۔

فطرت حسنہ کا جذبۂ انتخابی بعض ایسی ہستیوں کو جو قدرت کی طرف سے اسی لیئے پیدا کی گئی تھیں اس اعلیٰ اور ممتاز مقام پر لے گیا، جو اُن کی فطرت کے مناسب اور موزوں تھا، فنون لطیفہ میں انہیں لوگوں نے

نام پایا، اور ترقی کی، جو فطرتاً ان کے لیے وضع ہوئے، کوئی شخص محض محنت و کاوش سے صحیح معنی میں شاعر نہیں بن سکتا ہاں، ناظم یا متشاعر ہو سکتا ہے۔

فنون لطیفہ کیا ہیں، لطیف فلسفہ کی شاخیں، فلسفہ کے خوش مزہ ثمرات جس طرح حلاوت، بعض ثمرات کی ذات میں طبعاً ودیعت ہوتی ہے، اسی طرح بعض لطیف طبائع کو فنون لطیفہ سے وابستگی اور لگاؤ ہوتا ہے،

پیدائشی شاعر، اور پیدائشی مصور اپنی طبیعت اور دل و دماغ ہی سے مضامین کی تلاش کرتا اور بدقت انہیں قابو میں لاتا، اور ترتیب دیتا ہے۔

فنون لطیفہ کی وسعت فنون لطیفہ کا مواد فطرتاً ہر طبیعت میں رکھا گیا ہے، ہر شخص کسی نہ کسی پہلو سے ان کا مشتاق رہتا ہے، ہر طبیعت میں ان سب فنون کا ذوق و شوق ہوتا ہے غبی سا غبی بھی ان کا شیدا ہے، اور دانا سے دانا بھی انہیں چاہتا ہے، اگر کوئی شخص ان میں کچھ بھی ملکہ نہ رکھے تو بھی ان کے ذکر سے خوش ہوتا اور مزے لیتا ہے، بچے کے سامنے کوئی گیت گاؤ، کوئی تصویر رکھدو کوئی پھول پیش کردو تو وہ بڑے شوق سے اور پوری توجہ سے دیکھے اور سنے گا،

بچوں کے یہ حرکات اس بات کا زندہ ثبوت ہیں، کہ قدرت نے انسان کے طبائع میں بھی ایسے جذبات رکھ چھوڑے ہیں۔

نیست یک دل کہ خراشیدۂ مژگانِ تو نیست
ہر کس از ناوکِ نازِ تو نشانے دارد

فن شاعری گو فن شاعری، ادبیات ہی کا ایک شعبہ ہے، مگر پھر بھی ایسے فنون لطیفہ میں ہی رکھا گیا ہے اور اگر سچ پوچھو تو خود ادبیات بھی ایک طرح سے فنون لطیفہ ہی کی شاخ ہے، ہر طبیعت اپنے اپنے رنگ میں مشتاقِ شاعری ہے، کیونکہ فنون لطیفہ کی تعریف یہ بھی ہے، کہ ہر شخص اسکا مشتاق و گرویدہ ہو۔ کسی نہ کسی رنگ میں ہر شخص شعر یا شعر گوئی کا مشتاق ہوتا ہے، خواہ اسکا نام تک بندی ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح ہر شخص کسی نہ کسی رنگ میں گا بھی سکتا ہے۔

شاعروں میں سے صحیح معنے میں، پچیس فیصدی شاعر نکلیں گے، اور گانے والوں میں سے دس بھی نہیں۔ مگر ان کے شائقین کی فہرست ہر رنگ میں بھری ہوگی اور ہر شخص کی طبیعت اور دماغ میں یہ ولولہ پایا جائیگا۔

مصوری مصوری کیا ہے، ایک نظم نقوش اگر ایک شاعر ترجمان مناظر قدرت اور مفسر صحیفۂ فطرت ہے، تو ایک مصور بھی اپنے رنگ میں وہی فرائض لطیفہ ایک موزونیت اور خوبصورتی سے ادا کرتا ہے، جو کچھ ہم کائنات میں دیکھتے ہیں، یہ سب تصویریں ہی ہیں، سب سے ممتاز اور اعلیٰ مصور قدرت ہے، قدرت نے اپنے قدرتی البم میں ہمارے دیکھنے کے لیئے جسقدر تصویریں، فوٹو، اور اشکال و مناظر پیش کیے ہیں اُن کا احصار مشکل ہے، اگرچہ یہ سب جنس اور نوع کے لحاظ سے قریباً ایک ہی ہیں، پھر بھی ان کے خط و خال میں گونہ فرق ہے، ہر تصویر اور ہر منظر میں ایک جداگانہ نمونہ ملتا ہے جو ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔

تصویر کے دو رُخ تصویر، یا مصوری، دو پہلو یا دو رُخ رکھتی ہے۔ (۱) ظاہری (۲) باطنی قدرت کی ہر تصویر حکمت اور خوبی کا اظہار کر رہی ہے، انسان بھی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے، جس کی شان میں قدرت کہتی ہے۔ ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

گو دوسری زندہ اور غیر زندہ تصویریں موبنہ سے انسان کی طرح بزبان حال بولتی نہیں ہیں، مگر زبانِ حال سے سب کچھ کہتی ہیں۔ ممکن ہے کہ دوسری زندہ ہستیوں کے دل و دماغ میں بھی تموج خیالات کا ہوتا ہو، اور ہماری رائے میں ضرور ہوتا ہوگا، مگر اُن کا تموج اپنی زندگی میں انسانی خیالات اور تموجات کی طرح سرسبز اور ناطق نہیں ہوتا۔

مصوری بھی طبعی احساس ہے جسطرح بعض اور خیالات طبعی اور قدرتی ہوتے ہیں، اسی طرح مصوری بھی ایک طبعی جذبہ اور طبعی احساس ہو۔ پہلے انسان قدرتی تصویریں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے، اور پھر کسی تصویر کی جانب مائل ہوجاتا ہے، انسان نے تصویر بنانا فوٹو اتارنا کس سے سیکھا؟ نیچر سے، اور خود اپنے آپ سے۔ سامان اور مواد سامنے موجود تھا، اپنی تصویر اپنے سامنے ہی تھی اردگرد کے مختلف محرکات سے انسان رفتہ رفتہ مصور بن گیا۔ پہلے پہل دماغ کے کیمرے میں تصویریں لیتا رہا، پھر ہاتھ سے تصویریں بنانے لگا، دماغ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کوئی مجسمہ نہیں ہوتا، تخیل ہی تخیل ہوتا ہو، پہلے پہل موجودات کی تصویریں، پھر خیالی تصویریں کھینچنے لگا، دماغی نقشے کی ترتیب اور تکمیل میں انسان نے جو کچھ محنت کی اور ذہانت دکھائی، اس کا زندہ ثبوت، دلکش تصویریں، دستی نقشے اور اسکے ساتھ ہی فوٹو گرافی کا فن ہے آنکھوں کے ذریعہ سے دماغ کی پلیٹ پر جو کچھ نقش ہوتا ہے وہ قوت حافظہ کی مدد سے بڑی حد تک وضاحت کے ساتھ نمایاں ہوسکتا ہے، یہ ہوئیں دماغی تصویریں علیحدہ رنگ میں۔

سماعی تصویریں تصویر نہ صرف آنکھوں کے ذریعہ سے لیجاتی ہے، بلکہ کانوں کے ذریعہ سے بھی جاتی ہے، انسان جو کچھ سنتا ہے، دماغ میں ایک سہولت کے ساتھ اس کا خاکہ کھنچ جاتا ہے۔ مسموعہ الفاظ کے ذریعہ سے دماغ میں سب واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے، فرضی تصویر کشی سے پہلے مصور کے دل و دماغ میں الفاظ، خط و خال، جمع ہوتے ہیں، پھر ان سے وہ ایک خاکہ اتارتا اور تصویر بناتا ہے نازک دست مصوروں نے سماعت کے زور پر اس قسم کی دلآویز تصویریں بہت اتاری ہیں جن سے انکی ذہانت کا ثبوت کافی ملتا ہے،

آواز کی تصویر آواز بھی ایک مجسمہ رکھتی ہے، گو وہ مجسمہ مرئی نہیں ہوتا، جیسے ہوا مرئی نہیں ہے، کیونکہ آواز بھی ہوا ہی ہے، ہر آواز تین چیزوں سے مرکب ہوتی ہے۔

(ا) ہوا سے

(ب) دائروں سے

(ج) الفاظ سے

معانی اور مفہوم آواز کے ان تینوں غلافوں میں ملفوف ہوتے ہیں، ہر آواز ایک شکل قبول کر لیتی ہے اور گراموفون میں یہی شکل منتقل ہوتی ہے۔ جسقدر آوازیں خارج ہوتی ہیں یہ سب ہوا میں اپنے اپنے دائرہ کے مطابق منقوش ہو جاتی ہیں، یہ نقش مدت تک محفوظ رہتا ہے شاید کبھی ایسا وقت بھی آجائے کہ ہوا میں جسقدر اشکال پیدا ہوتی ہیں، اُن کا بھی عکس لیا جا سکے۔

مصور کے فرائض جس طرح شاعروں کے فرائض ہیں، اسی طرح مصوروں کے بھی چند فرائض ہیں۔ اگر شعر کی قیمت ایک حرف اور ایک لفظ کی کمی بیشی سے گر جاتی ہے، تو تصویر کی قیمت بھی ایک خط اور ایک نقطے کے ادھر ادھر ہونے سے کم ہو جاتی ہے۔ جب مصور کوئی نقل اتارتا ہو تو اُسکے سر ذمہ داری ہے کہ سر مو فرق نہ کرے۔ تصویر کے اصولی اقسام حسب ذیل ہو سکتے ہیں

(۱) نیچر کی تصویر

(۲) نیچرل تصویر کی نقل در نقل

(۳) خیالی تصویر

(۴) تصویر باعتبار صحیح و اصلی واقعات (۵) تصویر باعتبار خیالات

فن موسیقی جہاں تک میں خیال کرسکتا ہوں موسیقی کا فن بھی طبعی جذبات کے ماتحت نشوونما پاتا ہے، ہر انسان اس کا گرویدہ ہے، چاہے اسمیں دخل رکھے یا نہ رکھے جسطرح حسن تقریر اور حسن شعر جادو کی طرح اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے، اسی طرح موسیقی بھی جذاب واقع ہوئی ہے، موسیقی میں کیا کیا داخل ہے:-

(۱) شاعری (۲) گانا، (۳) بجانا (۴) ناچنا

حکیم ارسطو کہتا ہے کہ گانے ہی سے یہ سب شاخیں نکلی ہیں۔ گویا گانا اور راگ ان سب عناصر کی اصل ہے اور باقی اس کی شاخیں ہیں بعض نے اسمیں اختلاف بھی کیا ہے، کہ موسیقی میں شاعری بھی داخل ہے یا نہیں، اگر یہ کہا جائے کہ موسیقی داں بھی بعض پریشاں خیالات کا خاکہ اتارتا اور ایک موثر پیرایہ میں اس کا اظہار کرتا ہے تو یہ فن بھی شاعری کے تحت میں آجاتا ہے۔

اور یوں دیکھو تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن جن کوائف اور دقتوں سے شاعر کو گزرنا پڑتا ہے ان ہی سے قریبًا ایک موسیقی داں بھی گزرتا ہے، اگر شاعر ضروریات تقطیع اور قیود ردیف و قوافی سے دوچار ہوتا ہے، تو موسیقی داں کو بھی اسی قسم کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں،

آواز اور موسیقی اگر شاعری کی وابستگی حروف، الفاظ، ردیف، اور قوافی وغیرہ سے ہے تو موسیقی کا رابطہ زیادہ تر اُن آوازوں سے ہے، جن کے ساتھ وقت بھی دیکھنا پڑتا ہے، یا یہ کہ وقت کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے آوازوں میں تین اجزا کا زیادہ تر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ (۱) سُر تال کا (۲) لَے کا (۳) لوچ کا اگر ہر قسم کی آوازوں کو باعتبار سُر تال اور لے کے وزن کیا جائے تو پتہ لگ سکیگا کہ مختلف آوازوں کا سر تال اور لوچ جدا جدا ہوتا ہے، یہی بات اس کی دلیل ہے کہ موسیقی بھی ایک طبعی جذبہ یا فطری خاصہ ہے۔

ایک میز کے کنارے ہاتھ مارو اور غور سے سنو کہ اس آواز میں جو میز میں سے نکلی ہے کتنی اور کیسی کیفیات

(الف) سُر تال (ب) لَے (ج) لوچ

کوئی آواز ان تین کیفیات سے خالی نہ ہوگی، اب اس کے مقابلہ میں انسان کی آواز سنو گے تو اسمیں بھی یہی تین عناصر ہوں گے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ موسیقی بھی ایک طبعی فن ہے، تو اُسکا منشا یہ ہوتا ہے کہ ہر آواز میں موسیقی کے مبادیات پائے جاتے ہیں، اور ہر انسان سُر، تال، لے، لوچ اور خوش آوازی کا طبعًا مشتاق ہے۔

موسیقی کا موضوع آواز ہے، اور آواز ہر خطہ ہر دائرہ میں کیف انگیز ہے آوازوں کے تصادم و تضارب سے موسیقی کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، موسیقی سُریانی زبان کا لفظ ہے، اور راگ ہندی لفظ ہے، یونانی زبان

میں موسیقی خوش آوازی کا نام ہے، بعض لغات عرب میں لکھا ہو کہ موسیقار ایک ساز کا نام ہو جسمیں مرلیوں کو مثلث کے طریق پر ہلایا جاتا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ موسیقار ایک پرندہ ہے، جسکی چونچ میں بہت سے سوراخ ہیں۔ اگر انسان منھ سے نہ بولے تو نہیں کہا جائیگا کہ کوئی گاتا ہو، اس سے یہی ثابت ہوا کہ راگ اور موسیقی آواز ہی کا نام ہے، لیکن انسان جو کچھ بولتا ہے اُسے راگ نہیں کہا جاسکتا، گویا وہ آواز راگ ہے جو ایک ضابطہ کے تحت سرزد ہو جیسے وہ فقرہ شعر ہے جو ضابطہ شعری کے تحت ترتیب دیا جاتا ہو۔

سنگ تراشی اور فن تعمیر

چونکہ انسان کی ابتدائی تاریخ اب تک تاریکی میں ہے مورخوں اور ماہرین نے حتے الامکان اسپر بہت کچھ روشنی بھی ڈالی ہے، مگر پھر بھی بعض واقعات کو صحت اور یقین کے ساتھ نہیں بیان کیا جاسکتا، مگر باایں ہمہ اسمیں شک بھی نہیں کہ ضرورت کے پیش آنے پر فن تعمیر کی رفتہ رفتہ بنیاد پڑتی گئی اور اسطرح فن تعمیر فنون لطیفہ کے ذیل میں آتا گیا۔ تعمیر ہی میں سے سنگ تراشی بھی نکلی، اور زیادہ تر لطافت کی وجہ سے یہ فن جداگانہ فن قرار پاگیا

سنگ تراشی کے متعلق یہ سوالات اب تک زیر بحث چلے آتے ہیں کہ (۱) یہ شروع کب ہوا (۲) کس قوم نے یہ کام شروع کیا (۳) کیوں کیا۔

ہماری رائے میں دو ضرورتوں کی وجہ سے سنگتراشی شروع ہوئی (۱) بہ ضروریات یادگار (۲) بوجہ بت پرستی۔ دونوں صورتیں ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں، اگر یادگار قائم کرنے کے واسطے اسکی ضرورت ہوئی تو اور اگر بت پرستی کی غرض سے یہ فن عالم وجود میں آیا تو دونوں صورتوں میں اس کا تعلق "یاد" سے ہے۔ رومیوں، ہندیوں اور مصریوں میں چونکہ اصنام پرستی کا زیادہ زور رہا، اس واسطے شروع شروع میں اس فن نے انہیں کے آغوش ذہانت میں پرورش پائی۔

سنگتراشی نیچر کی نقل نہیں ہے، بلکہ خالص انسانی دل و دماغ کا اجتہاد ہے، سامان نیچر میں کوئی نمونہ سنگتراشی کا نہیں پایا جاتا۔

فنون لطیفہ کا اثر

فنون متعارفہ کا اثر کاروباری زندگی اور آسائشی مراحل ہی تک قائم رہتا ہے، لیکن فنون لطیفہ کا اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ اس سے دل متاثر ہوتا، اور دماغ میں موجب ادراک اور ہیجان تعقل ہوتا ہے، ان کی ترقی سے نہ صرف شخصیتیں متاثر ہوتی ہیں بلکہ اجتماعی رنگ میں قومیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ حقوق متعارفہ سے بے شک قوموں کے کاروباری اور آسائشی وسائل زیادہ تر سہل

ہوجاتے ہیں، لیکن دماغی اور ضمیری ترقی بہت کم ہوتی ہے، برخلاف اسکے فنون لطیفہ کی ترقی انفرادی اور اجتماعی پہلو سے قوموں کی دماغی ترقی اور ضمیری نشو ونما کی ضامن ہوتی ہے، دیکھو شاعری جو فنون لطیفہ میں سے ہے، ادبی پہلو سے طبائع پر کیسا صاف اور فوری اثر کرتی ہے۔ ایک ہی شعر سے دماغوں میں تموج حسنہ اور ضمائر میں جوش پیدا ہوکر حیات نفسیہ میں خاص طور پر اضافہ ہوتا ہے، جو قوم فنون لطیفہ نہیں رکھتی وہ دنیا کے پررونق اور ترقی یافتہ میدان میں عزت و احترام نہیں پا سکتی۔

ایک غلطی بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ شاعری، مصوری، اور موسیقی میں کمال حاصل کرنا قومی ترقی کے واسطے بیکار ہے، لیکن یہاں ضرورت اور عدم ضرورت کا سوال نہیں ہے، بحث یہ ہے کہ کیا ہمیں اُن چیزوں کی ضرورت نہیں ہے، جن سے دماغ اور ضمیر ترقی پذیر ہوتے ہیں اور خود بھی نشو ونما کا ذریعہ ہیں، اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ فنون لطیفہ سے طبائع و اذہان، دماغ و ضمیر کا تزکیہ ہوتا ہے، اور چونکہ ان فنوں کی خواہاں خود فطرت اور طبیعت بھی ہے اس واسطے ان کا حاصل کرنا ادبیات کی طرح لازم ہے۔

سلطان احمد

غزل

دھڑکن تھی دل میں تارِ نفس کو تھا اضطراب
پھر کیوں نہ ہوتا نغمۂ غم میرا کامیاب

پامال در ہوکے بھی دل کی کھلی نہ آنکھ
اب تک وہی ہوس ہے وہی آرزو کا خواب

اُنکی نگاہِ قہر میں پہلو ہے لطف کا
کس شکل سے ہے ذوقِ ستم میرا کامیاب

کچھ دھجیاں سی اشکِ ندامت سے وہ بھی تر
وسعت کہاں سے لائیگا دامانِ اضطراب

دل کی تسلیوں میں تھا شاید فریب شوق
ہے پھر وہی خیال وہی جوشِ اضطراب

پہلو کو میرے چیر کے دیکھو تو ایک دن
دل ہے کہ داستانِ محبت کی اک کتاب

وسعت نہ ہو زبان میں۔ ظالم ادھر تو دیکھ
میرا سکوت یاس ہی ہر بات کا جواب

ہادی ہوئی تھی جس سے محبت کی ابتدا
اب تک اُسی خیال کا میں دیکھتا ہوں خواب

ہادی مچھلی شہری

چاند کی طرف پہلا قدم

(آئندہ گرما میں)

ہر وہ چیز جو علم انسانی سے باہر ہے، اس کے معلوم کرنے کے لیئے انسان فطرتاً بیتاب پیدا ہوا ہے اور غالباً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اُسے تمام مخلوقات عالم پر حکمران بنا رکھا ہے، لیکن اسی کے ساتھ جب ہم اپنے ذرائع علم پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اپنے عجز کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ باوجود ترقی کے انتہائے مدارج حاصل کرنے کے بھی کتنے حجابات کا دور کرنا ہماری قدرت سے باہر رہیگا اور کائنات و نظام کائنات کے کتنے تاریک منظر ایسے باقی رہجائیں گے، جہاں تک ہمارے علم کی روشنی پہونچنے سے قاصر نظر آئیگی

اگر ایک طرف علم ہیئت کی ترقی نے بہت سے اجرام سماوی کے حالات کو منکشف کر کے اُن کے بُعد کو متعین کر دیا ہے، تو دوسری طرف طبیعیات و کیمیا آہستہ آہستہ اس تدبیر میں منہمک نظر آتے ہیں کہ اس مسافت کو کیونکر طے کیا جائے اور ہم کس طرح پہونچکر اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات اور وہاں کی آبادی کا مشاہدہ کریں۔

سب سے پہلا وہ کرہ جس کے حالات معلوم کرنے کا قدرتاً ہمیں زیادہ شوق ہونا چاہیئے، کرۂ قمر ہے، کیونکہ وہ ہم سے بہت قریب واقع ہوا ہے، اور ہماری ہی زمین کا ایک حصہ ہے جس نے جدا ہو کر ایک مستقل کرہ کی سی شکل اختیار کر لی ہے لیکن یہ مسئلہ ایک زمانہ سے علماء مغرب کو بیچین بنائے ہوئے ہے، اور اس وقت تک کوئی عملی صورت ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ وہاں تک پہونچنے کا امکان ہم کو یقینی صورت میں نظر آئے۔

نگار کے گزشتہ نمبر میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مغرب کے ایک عالم نے ہوائی کے ذریعہ سے چاند تک پہونچنا ممکن ثابت کر دیا ہے اور آئندہ گرما میں یہ ہوائی سر کی جائیگی، اس کے اندر متعدد ہوائیاں ہونگی اور یکے بعد دیگرے نئی قوت سے بلند ہوتی جائینگی لیکن قبل اس کے کہ ہم پروفیسر گاڈرڈ کے اس دعوے کی تفصیل بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مہندسانہ نقطۂ نظر سے جو جرح و تعدیل اس مسئلہ پر ہو چکی ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجائے۔

کرۂ قمر زمین سے ۔۔۔۔ ۲۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اگر ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ریل گاڑی یا ۱۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائی جہاز اس طرف کو چلایا جائے تو علی الترتیب تقریباً ۶ یا ۳ مہینے میں ہم وہاں پہونچ

سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسافت اتنی زیادہ بعید نہیں ہے اور بحر اٹلانٹک کا ایک تیز رفتار جہاز تین سال میں ایک مرتبہ اور انجن ڈرائیور اس سے کم مدت میں ہمیشہ اتنا فاصلہ طے کر لیا کرتا ہے، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ جو سماء میں اتنی دور کا سفر کس ذریعہ سے طے کیا جا سکتا ہے جب کہ کواکب و نجوم کی درمیانی فضا میں سوائے ایتھر کے اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی، ریل اسلیئے چلتی ہے کہ اس کے پہیے پٹری سے رگڑ کھاتے ہیں، غبارہ اسلیئے بلند ہوتا ہے کہ ہوا کے ساتھ اس کا تفاعل ہوتا ہے (اور اسوقت تک ۳۵۴۲۰ فٹ سے زیادہ بلند کوئی غبارہ نہیں اُڑ سکا) پھر کرۂ ہوا ختم ہو جانے کے بعد جو سو میل سے زائد نہیں ہے، فضاء فارغ میں کیونکر جا سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ہوائی جہاز، غبارہ سے زیادہ بلند نہیں جا سکتا اور غبارہ بھی محدودہ بلندی سے زیادہ نہیں اٹھ سکتا، اسلیئے تاوقتیکہ کوئی مکانکی ذریعہ اختیار کر کے آلات واقعہ نہ بنائے جائیں مقصود حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کی طرح تمام مکانکی آلات بھی زمین کی قید میں ہیں اور اس کے احاطۂ کشش سے باہر نکلنا محال ہے۔

جو دل ورن نے اپنے افسانہ "آسمان سے زمین تک" میں قواعد علمیہ کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ توپ کے ذریعہ سے ایک انسان کا چاند تک پہونچنا ممکن ہے اور اسی ذریعہ سے اس نے اپنے ہیرو کو ... ۲۴۰ میل کی مسافت طے کرا کے چاند تک پہونچایا ہے، لیکن کیا حقیقتاً ایسی توپ کا بننا ممکن ہے اور کیا اس توپ سے ایک انسان گولہ کی طرح جدا ہو کر اتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے؟

غالباً اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ زمین کی کشش کا اثر ہر شے پر ہے اور کوئی چیز خواہ کتنی ہی قوت سے کیوں نہ پھینکی جائے پھر لوٹ کر زمین پر آجائیگی۔ البتہ اگر حدِ کشش سے وہ چیز باہر چلی جائے تو بیشک زمین پر نہ گریگی۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کس مقدار سرعت سے چلنے کے بعد ایک چیز زمین کی حدِ کشش سے باہر ہو سکتی ہے اور حدِ کشش سے باہر ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلی جائیگی، اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر ۲۶۰۰۰ فٹ ثانیہ کے حساب سے کوئی چیز زمین سے جدا ہو کر فضا میں سفر کرے تو حدِ کشش سے باہر ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی وہ چیز زمین کے گرد چاند کی طرح گردش کرنے لگے گی۔ اسلیئے ضرورت ہے کہ قوت واقعہ اس سے بھی زیادہ قوی ہو اور کم از کم ۷ میل فی ثانیہ کی رفتار سے دفع کرے تاکہ زمین کی قوت جاذبہ سے وہ چیز بالکل علیحدہ ہو جائے، اس کے بعد یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ کونسا آلہ ہے جو اس قدر قوت کے ساتھ کسی چیز کو دفع کر سکتا ہے، ظاہر ہے کہ توپ سے زیادہ قوی آلہ اس کام کے لیئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اور سب سے زیادہ قوی توپ جو اسوقت تک طیار ہوئی ہے اسکی قوت واقعہ بھی ۵۵۰۰ فٹ فی ثانیہ سے زیادہ نہیں ہے، یعنی چاند تک پہونچنے کے لیئے جتنی سرعت کی

ضرورت ہے، اسکی صرف لے حاصل ہو سکتی ہے۔

فرانس کے ایک فوجی افسر نے رسالہ (Revue des ciel) کرۂ زمین اور چاند کے درمیان ایک خیال لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر توپ کے اندر ۲۰۳۰ فٹ فی ثانیہ کے حساب سے کوئی ایسی چیز رکھ کر سر کی جائے جو خود بلند ہو کر اپنے اندر سے دوسری چیز سر کرے اور اسی طرح برابر بارہ چیزیں سر ہوتی چلی جائیں تو آخری گولہ چاند تک پہونچ جائیگا، لیکن اسکے لیئے صرف ۱۶ پونڈ کی چیز پہونچانے کے لیئے کم از کم ۰۰ ٹن (۲۲۰۰۰۰) بارود کی ضرورت ہوگی، یعنی اگر ایسا ممکن ہو تو بھی کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، اور انسان کا وہاں تک پہونچنا بالکل محال ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمین کی حدود کشش سے باہر ہونے کے بعد ہم چاند کی حدود کشش میں آجائیں گے اور اسطرح پھر ہم اپنے وزن کو محسوس کرنے لگیں گے، تو ہم اسے تسلیم کر لیں گے، لیکن اس سے قبل جو چند لمحات ایسے گزر جائیں گے جنمیں کشش زمین کا اثر ہمارے اوپر مطلق نہ ہونے کے ہوگا، وہ کیسے گزرینگے اور ان میں ہمارے زندگی کی ضمانت کون شخص کر سکتا ہے۔

اب ڈاکٹر گاڈرڈ نے جو کلارک یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعیات کا اعلیٰ پروفیسر ہے، پھر ہوائی کے ذریعہ سے چاند تک پہونچنے کے مسئلہ کو زندہ کرنا چاہا ہے اور اس نے ایک ہوائی ایسی طیار کی ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ چاند تک پہونچ سکیگی، اس ہوائی میں اسنے اتنی طاقت پیدا کی ہے، کہ ۶۰۲۹ میل فی سکنڈ کی رفتار سے صعود کرےگی، اور اسکے اندر اور متعدد ہوائیاں ہونگی، جو یکے بعد دیگرے سر ہوتی چلی جائینگی، حتیٰ کہ آخری ہوائی زمین کے حدود کی کشش سے باہر ہو جائیگی اور چاند کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ لی جائیگی۔

پہلے پروفیسر مذکور نے ہوائی کے اندر غیر دخانی مادۂ منفجرہ (Smokeless explosive) رکھا تھا، لیکن اب اس نے ایک ایسے مشتعل مادہ سے کام لیا ہے جو بہت زیادہ قوی ہے اور برابر اہل زمین کو قوی دوربینوں کے ذریعہ سے چاند تک آتا رہیگا۔

اسی سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہوتا ہے کہ چاند میں حیات کا وجود ہے یا نہیں۔ ایک جماعت علماء ہیئت کی کہتی ہے کہ چاند میں ہوا کا وجود نہیں ہے اسلیئے وہاں حیات بھی نہیں پائی جا سکتی۔ دوسری جماعت کا (جسمیں امریکہ کا مشہور ہیئت داں پکرنگ بھی شامل ہے) خیال ہے کہ چاند کی سطح پر کوہ آتش فشاں کے پھوٹنے کے علامات پائے جاتے ہیں، ہلکی ہلکی برف ابھی گرتی ہے، اور ہوا کی بھی نہایت تنک فضا نظر آتی ہے اسلیئے ظاہر ہے کہ وہاں کی زمین میں ضرور نم پایا جاتا ہوگا، اور چاند اراشیا رکا وجود بھی ہوگا، چاند کے درجۂ حرارت کے متعلق اول جماعت

کا خیال ہے کہ فضا، ہوا کے نہ ہونے سے وہاں آفتاب کی شعاعیں براہ راست نہایت قوت کے ساتھ پڑتی ہونگی اور چاند کے اس حصہ میں جو آفتاب کے سامنے رہتا ہے حرارت درجۂ غلیان تک ہوگی اور دوسرے حصہ میں برودت نقطۂ جماد تک ہوگی، پروفیسر پکرنگ کا بیان ہو کہ چاند میں حیات کا وجود نباتات کی شکل میں ہے اور وہ بھی ایسے غاروں میں جہاں کی ہوا کم لطیف ہے، چونکہ چاند میں کشش ثقل بہ نسبت زمین کے بہت کم ہو اسلیئے وہاں کی زندگی بھی دنیا کی زندگی سے بہت مختلف ہوگی، یعنی اگر وہاں کوئی آبادی انسانوں کی طرح ہے تو اس کا وزن بہت کم ہوگا اور گزوں تک جست کر سکتی ہوگی، اسی طرح ان کے پھیپھڑے بھی لطیف ہوا میں سانس لینے کے لیئے بہت بڑے ہونگے، اور کان بھی غیر معمولی طور پر بڑے بڑے اور ان کی حس نہایت قوی ہوگی، تاکہ لطیف ہوا کے اندر آواز کے اہتزازات و تموجات میں امتیاز پیدا کر سکے،

بہرحال ابھی تک چاند کا سفر خیال و وہم سے آگے نہیں بڑھا، لیکن اگر پروفیسر گاڈرڈ کے ہوائی وہاں پہونچ گئے تو بیشک علمی نقطۂ نظر سے زیادہ غور طلب ہو جائیگا، اور ممکن ہے کہ کسی وقت کرۂ ارض کا باشندہ چاند تک پہونچکر وہاں کے حالات کا عینی مطالعہ کر سکے۔

فرانس کے کسی مہندس طیران نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ہوائی کے ذریعہ سے یہ مقصود حاصل ہو سکتا ہو، یعنی اگر بڑی ہوائی طیار کی جائے تو اسکی قوت ۲۵ منٹ تک باقی رہتی ہو اور اس عرصہ میں وہ ۳۶۰۰ میل کا سفر کر سکتی ہو، اسکے بعد اسکی قوت ذاتی ۴۸ گھنٹے تک اس سے سفر کرا سکتی ہو اور اسطرح سو گھنٹے کے اندر چاند تک پہونچ کر واپس بھی ہو سکتے ہیں۔

اس سفر کے لیئے ۱۴۱ ہزار گھوڑوں کی قوت ایک ٹن وزن لیجانے کے لیئے درکار ہوگی اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قوت پیدا کرنا، ڈائنامیٹ، یا نیٹرو گلیسرین کے بس کی بات نہیں ہو۔ البتہ اگر ریڈیم کی قوت پر قابو حاصل ہو جائے یعنی جس طرح ہم بخار و کہربا سے حسب ضرورت کام لے سکتے ہیں، اسی طرح ریڈیم سے بھی لے سکیں، تو ممکن ہو، مگر افسوس ہے کہ اسوقت تک ریڈیم کی قوت پر انسان کو پورا اقتدار حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہم ہوائی کے ذریعہ سے وہاں پہونچ سکتے ہیں تو بھی بڑا اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انسان وہاں زندہ کیونکر پہونچ سکتا ہے، چونکہ ہمیں زندگی کے لیئے تنفس ہوا کی ضرورت ہو اور زمین سے ۱۰۰ میل چلنے کے بعد فضا ہوا سے خالی نظر آئیگی۔ اسلیئے زندگی کیونکر ہوگی، اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دباؤ پاکر آکسیجن کی بہت سی مقدار اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں، اب رہجاتا ہے مسئلہ حرارت و برودت کا، کیونکہ فضا ء کا درجۂ برودت

یقیناً صفر سے سیکڑوں درجے نیچے ہوگا، اور اسی طرح آفتاب کی شعاعیں حرارت محرقہ پیدا کرینگی، یعنی اگر کبھی آفتاب کا سامنا ہوگیا تو بھن کر رہ جائیں گے، اور جب اس کے سامنے سے ہٹے تو جم کر برف ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کا علاج فرانسیسی مہندس نے یہ سوچا تھا کہ ایک طرف سیاہ رنگ کا ایسا غلاف یا پردہ رکھا جائیگا جو آفتاب کی حرارت کو جذب کر لیگا، اور دوسری طرف حجاب عاکس (آئینہ وغیرہ کی طرح) رکھا جائیگا، جو آفتاب کی شعاعوں کو ڈال کر سردی کو دور کر سکیگا۔ مگر بحث کا ایک پہلو اور باقی رہتا ہے،

انسان جن اسباب کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا عادی ہو اگر وہ علیحدہ کر لیئے جائیں تو اس کا جینا دشوار ہوجائیگا پھر دیکھو کہ جس طرح ہمیں اپنی زندگی میں ہوا کے عادی ہوگئے ہیں، اسی طرح کشش زمین کی بھی ہمیں عادت ہوگئی ہے، اسوقت ہمارا چلنا پھرنا، لکھنا پڑھنا، اپنے اعضاء کو جنبش دینا صرف کشش زمین کی وجہ سے ہے کیونکہ ہمارے تمام مشاغل حیات ہمارے اعضاء کے ثقل کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں اور ہمارا ثقل یا وزن کچھ نہیں ہے مگر کشش زمین۔ یعنی ہم زمین سے جسقدر دور ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ہمارا وزن کم ہوجائیگا، حتی کہ حدود کشش سے باہر ہونے کے بعد ہم میں کوئی وزن نہ رہیگا، اور ہمارا قلب و پھیپھڑہ دونوں اپنا عمل ترک کردینگے،

غزل

خرد از قصہ ہائے عاشقاں مستانہ می رقصد
رہ تمکین زند ہم ہوش و بے باکانہ می رقصد

چہ شیریں نغمہ ہا باشد نہاں در پردۂ ہستی
کہ دشت و وادی و معمورہ و ویرانہ می رقصد

نباشد خویشی و بیگانگی در محفل رنداں
بحرف آشنا ہم خویش و ہم بیگانہ می رقصد

نگہ در حسبت و جوئے "دیدۂ" بیناست سرگرداں
بینم پرتو حسن تو بے تابانہ مے رقصد

گل نظارہ چیدم از گلستانِ رخش روزے
نگہ در چشم تا امروز مشتاقانہ می رقصد

اگر خواہی کہ بنویسی حدیثِ اشتیاق حسن
قلم بینی کہ بر ہر حرف آں افسانہ می رقصد

سحر گاہاں بخواب آں شاعر شیراز را دیدم
کہ شعر میر را مے گوید و رندانہ می رقصد

میر ولی اللہ

شفقِ شام

چرخ پہ دوڑ گئی بجلی سی حسن کی رونق عام ہوئی
کس کے لب رنگیں کی سرخی جلوہ فروزِ بام ہوئی

نغمہ فضائے یاد کا سنکر زرد شعاعیں ہوگئیں گم
گرد و غبار کی تہ میں پیدا خوابگہ آرام ہوئی

تو ہے رنگِ حنائے گردوں، تو ہے غازۂ عارضِ مشرق
(تیرے حسن کی لالہ کاری دھر میں طشت از بام ہوئی)

خونِ تمنا جوش میں آیا تیرے دید کے وعدوں سے
گورے گورے رخساروں کی زینت کیوں بدنام ہوئی

یوں آئی مغرب کی سیاہی ہوش اڑائے وادی کے
چھپتے ہوئے تاروں کے آگے شمع مہر تمام ہوئی

رہ گئے حوصلے جانبازوں کے، میدان سے پلٹیں فوجیں
ختم ہوا یوں تیغ کا دم خم، دم میں زیب نیام ہوئی

دل کانپے شیروں کی گرج سے، جھاڑی میں پھر شور ہوا
تیرے نظارے سے بنائے جور خوں آشام ہوئی

تیرے غضب آلودہ رخ نے ڈھائی آفت سورج پر
تیرے تبسم کی اک جنبش شب افزا پیغام ہوئی

کہتی ہے دنیا کی عبرت، تو ہے موج شوخ ادا
دیکھ لیں تجھکو نیند کے ماتے کھولدیں آنکھیں شام ہوئی

ثاقب کانپوری

بیداریوں کے افسانے

اور

قوت عمل کے مناظر جمیلہ

بعض احباب کہتے ہیں کہ شاید مجھے اہل امریکہ کی طرف سے کوئی وظیفہ ملتا ہے کہ میں ہمیشہ ان کے حالات کا پروپگنڈا کرتا رہتا ہوں اور نگار کی کوئی اشاعت ایسی نہیں ہوتی، جسمیں کچھ نہ کچھ ان کا ذکر نہ ہوتا ہو، لیکن کیا کروں جب میں اس قوم کے حالات اور اسکی قوت عمل کے مظاہر کا مطالعہ کرتا ہوں تو بے اختیار جی چاہتا ہو کہ کسی طرح میں بھی اپنے ابنائے وطن کو اسی حال میں دیکھوں اور مضطربانہ طور پر اُس بیدار قوم کے افسانے شروع کر دیتا ہوں جس کے حالات میں ہمارے لیئے بہت کچھ سامان عبرت و بصیرت موجود ہے۔

اب یہ حقیقت ہر شخص پر منکشف ہو چکی ہے کہ امریکہ سے زیادہ بیدار اسوقت کوئی دوسرا ملک نہیں ہو اور وہاں کی ترقیوں کے واقعات اسقدر حیرت انگیز ہیں کہ عقول عوام کو اُن کے باور کرنے میں تامل ہوتا ہو لیکن شواہد و حقائق سے انکار ممکن نہیں اور ارباب فہم ان کو رشتۂ اسباب و علل سے والستہ کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں یہ واقعات نئے نہیں ہیں، اور اس سے قبل بھی ہمیشہ تدبیر و عمل کا نتیجہ اسی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

الہیات کا مسئلہ ہے کہ مبداء فیاض، فیاض ہے اور فطرت اسباب کے لیے نتائج پیدا کرنے میں کبھی بخیل ثابت نہیں ہوئی، اسلیئے ہم ایک قوم کے حال سے اسکی ماضی کی تدابیر اور مستقبل کی کیفیت معلوم کر سکتے ہیں اور یہ معلوم کرنا ایسا یقینی و اذعانی ہو گا کہ گویا ہم نے خود اس اسٹیج میں کوئی حصہ لیا تھا، پھر چونکہ انسان ہمیشہ محرکات و مہیجات سے متاثر ہوتا ہے اسلیئے بیدار اقوام و ملل کے حالات و واقعات پر ہم کو ہمیشہ غور کرنا چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ اُن کے ذرائع ترقی کیا ہیں اور اُن کے وہ کون سے اصول ہیں جنہوں نے انہیں بام ترقی تک پہونچا دیا، یہی وہ خیال ہے جس سے مجبور ہو کر میں امریکہ کے حالات اور اُن کے مظاہر عمل وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہتا ہوں۔

چونکہ اسوقت دنیا کے متمدن ممالک میں اقتصادی و سیاسی مرکزیت صرف نیویارک کو حاصل ہو، اسلیئے غالباً بے محل نہ ہو گا اگر وہاں کے عجائب و غرائب ناظرین نگار کے سامنے پیش کیئے جائیں۔

نیویارک کا حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص سے اگر اس کے مرتسمات دماغی کا خلاصہ دریافت

کیا جائے تو وہ کہدیگا کہ دنیا میں نیویارک ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی ہر بڑی چیز اہم، ہر قوت شدید، ہر حرکت سریع، ہر فن جمیل اور ہر کثرت وافر ہے، وہاں کے کارخانوں کا حسن انتظام، وہاں کی تجارت کی عظمت، وہاں کی دولت کی زیادتی، وہاں کی کثرت آبادی، صحت و توانائی، سرگرمی و خوشدلی، تعلیم و تہذیب، غرض ہر وہ چیز جس کا تعلق انسان کی ظاہری و معنوی خوشحالی سے ہی، حیرت انگیز حد تک ترقی کر چکی ہی، اور ہر سیح صبح وہاں کا نشاط عمل ایک جدید وضع و اسلوب سے رونما ہوتا ہے۔

نیویارک کی آبادی مستطیل شکل میں واقع ہوئی ہی، اسکے مغرب کو دریائے ہڈسن سیراب کرتا ہی، مشرق میں ایک اور دریا ہے، جنوب میں بحر اٹلانٹک واقع ہی اور اسطرح اسکی صورت جزیرہ نما کی سی ہوگئی ہے جس کے قریب قریب چاروں طرف پانی ہے اور جہازوں کا غیر متناہی سلسلہ اُسے ہر وقت گھیرے رہتا ہے۔

نیویارک سے جتنا مال باہر جاتا ہی وہ ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کی برآمد کے برابر ہے، اور یہاں نقل و حرکت کے کہربائی ذرائع (یعنی ٹرامو وغیرہ) اسقدر وسیع ہیں کہ جتنے آدمی سارے ملک امریکہ میں سال بھر کے اندر سفر کرتے ہیں اتنے ۶ ماہ کے اندر صرف نیویارک میں ادہر سے ادہر منتقل ہوتے ہیں، حالانکہ ملک امریکہ کی ریل کی لمبائی ساری دنیا کی ریل کے برابر ہے۔

یہاں تمہیں ہر جنس و قوم کا آدمی نظر آئیگا، اور نہایت کثرت سے آئرلینڈ کے آدمی ڈبلن میں بھی اتنے نہ ہوں گے جتنے نیویارک میں نظر آتے ہیں، اسی طرح جرمنی آبادی ہمبرگ اور فرنکفورٹ کی آبادی سے زیادہ، روسی آبادی ریگا و ڈولنسک کی آبادی سے بڑھی ہوئی یہاں موجود ہے، یہاں کے مہاجرین کی تعداد پیرس و فلاڈلفیا کی آبادی کے برابر اور شکاگو و برلن کی آبادی سے کہیں زائد ہے، مختصر یہ کہ نیویارک کی آبادی گویا انسانی سیلاب ہے جو ہر وقت اوقیانوس عمل کی طرف بڑہتا ہوا نظر آتا ہے۔

اگر تم کسی چوراہے پر کھڑے ہو جاؤ گے تو انسانوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئیگا، لیکن اُسمیں ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جس کا مقصود کام کے علاوہ صرف تفریح یا لہو و لعب ہو، صرف ایک بروکلن کے پل سے روزانہ ۵ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں حالانکہ تین پل اتنے ہی اتنے بڑے اور بھی ہیں اور وہاں بھی ہجوم کا یہی عالم ہوتا ہے پھر ٹراموے موٹر، زمین کے اوپر نیچے کی ریلیں یہ سب کھچا کھچ آدمیوں سے بھری نظر آتی ہیں اور اسی طرح دریائے ہڈسن میں کشتیوں کی آمد و رفت کا حال ہے۔

ہر ۲۲ سکنڈ کے بعد یہاں ایک ریل آتی ہے، ہر چالیس منٹ پر دخانی جہاز روانہ ہوتا ہے، ہر ۹ منٹ پر

ایک ولادت ہوتی ہے، ہر ۱۳ منٹ میں ایک نکاح ہوتا ہے، ہر ۱۴ منٹ میں ایک موت ہوتی ہے، ہر ۵۱ منٹ میں ایک جدید عمارت طیار ہوتی ہے، اور روزانہ ۵۰۰ جدید ٹیلی فون قائم ہوتے ہیں۔

یہاں کی نمایاں خصوصیت حرکت ہے اور انسانوں کا سیلاب ہر وقت ادھر سے ادھر متحرک نظر آتا ہے، ظاہر ہے کہ اتنی کثیر آبادی کے لیئے وسائل نقل بھی کثیر و سریع ہوں گے، اور اسلیئے علاوہ ٹرامویے کے جو دسویں حصہ کے لیئے بھی کافی نہیں، ایک کہربائی ریل ستونوں کے اوپر دوڑتی ہے اور دوسری زمین کے اندر جاری ہے، بالائی ریل کی پانچ شاخیں ہیں جو شہر کے طول میں چلی گئی ہیں اور ہر شاخ میں دوہری ریل ڈالی گئی ہے، تاکہ آنے جانے میں تاخیر نہ ہو، بعض جگہ یہ ریلیں تہری ہیں تاکہ اکسپرس کے لیئے ایک لائن مخصوص رہے، زمین دوز ریل ابتدائے شہر سے شروع ہوتی ہے، اور اسکی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل جاتی ہیں، اصل شاخ پانی کے اندر سے گزر کر بروکلن چلی جاتی ہے اور یہاں پھر اسکی متعدد شاخیں ہوجاتی ہیں۔

چونکہ نیویارک سے بروکلن آنے جانے کے لیئے ہجوم بہت ہوتا ہے اسلیئے چار پل طیار کیئے گئے ہیں جنکی تعمیر میں ۷۰ ملین ڈالر صرف ہوئے ہیں، ان پلوں کی مجموعی لمبائی ۶ میل ہے، اور درمیان میں کوئی ستون واقع نہیں ہے، ان پلوں کے اوپر آدمی، موٹر، ٹراموے، ریل سبھی کا گزر ہوتا ہے اور اسطرح نیچے سے بڑے سے بڑا اوڈریڈناٹ بھی گزر جاتا ہے، اس سے ان پلوں کا عرض و طول اور اُن کی بلندی کا اندازہ ہوسکتا ہے، یہ حال اُن پلوں کا ہے جو جزیرۂ لانگ آئلینڈ کو نیویارک سے ملاتے ہیں، دوسری طرف دریائے ہڈسن کی جانب سے جتنے آدمیوں کی آمد و رفت ہے وہ بھی اس سے کم نہیں ہے۔ اس کے لیئے بہت سی کشتیاں طیار رہتی ہیں، لیکن اُن کے ناکافی ہونے کی وجہ سے دریا کے نیچے سے نیچے چار سرنگیں کھود کر ریل لائی گئی ہے، ان سرنگوں کا تعلق اُن دو بڑی سرنگوں سے نہیں ہے جنکی ریلیں نیویارک کو ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں سے ملاتی ہیں۔

ہم عام طور پر ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ جہاں آبادی کی کثرت ہوئی گندگی و عفونت پھیلی اور امراض وبائیہ پھیلنا شروع ہوئے اس لحاظ سے نیویارک یا امریکہ کے دوسرے بڑے شہروں میں یہ مصیبت اور زیادہ سخت ہونی چاہیئے، لیکن کسقدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود آبادی کے اسقدر کثرت کے صفائی کا ایسا انتظام ہے کہ ممکن نہیں کسی جگہ نجاست یا غلاظت نظر آجائے، وہاں کا محکمۂ حفظان صحت اتنا مستحکم، وسیع اور باقاعدہ ہے کہ ایک ایک ذرہ زمین کا اُسکی توجہ خاص حاصل کرتا رہتا ہے، چونکہ حکومت امریکہ اس بات کو جانتی ہے کہ ترقی ملک

نفوس کی ترقی پر منحصر ہے اور نفوس کی ترقی کا مدار ہے حفظان صحت، اسلیئے وہ ہر سال زر خطیر اس پر صرف کرتی ہے اور جب کبھی بچوں میں غیر معمولی طور پر موتیں ہونے لگتی ہیں تو تمام متعلق محکموں سے سخت باز پرس ہوتی ہے۔

صفائی کے علاوہ دوسری چیز جس پر صحت کا مدار ہے، کھانے پینے کی چیزوں کا صاف و پاکیزہ ہوتا ہے۔ اس کا اہتمام بھی وہاں غیر معمولی طور پر نہایت احتیاط سے کیا جاتا ہے، ہندوستان میں باوجود اس کے کہ مویشیوں کی کثرت ہے، دودھ، گھی صاف نہیں ملتا، لیکن امریکہ میں باوجود قلت مواشی کے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک قطرہ پانی بھی دودھ میں نظر آجائے یا اسمیں اور کوئی چیز مخلوط کر دی جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حکومت نگرانی کرتی ہے ہمیشہ جانچ کرتی رہتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود وہاں کے لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اشیاء خوردنی کو خراب کرنا اخلاقی اور قومی جرم ہے، اور ان کا یہ احساس نتیجہ ہے عام و بلند تعلیم و تربیت کا۔

وہاں کی تعلیمی حالت پر اس سے قبل نگار کے صفحات میں کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ یوں تو تمام ممالک مغرب میں تعلیم مفت اور لازمی ہے، لیکن امریکہ کا نظام تعلیم ہر صوبہ کے لحاظ سے جدا ہے، اور مختص المقام ضروریات کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے، لڑکے اور لڑکیاں دوش بدوش میدان تعلیم میں مسابقت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تمام فنی، صناعی، اور علمی مدارس میں عورتیں بھی اسی طرح جوش و انہماک کے ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں، جسطرح وہاں کے مرد۔ طب، قانون، ہندسہ، میکانکات، تجارت صرف مردوں کے لیئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ عورتیں بھی اسکی اعلیٰ سند حاصل کرکے میدان عمل میں منہمک نظر آتی ہیں۔

یہ ہیں وہاں کے روشن مناظر، لیکن اگر نگاہ تأمل سے دیکھا جائے تو تمدن کی اس ترقی کے ساتھ وہاں بہت سے اخلاقی نقائص بھی پیدا ہوگئے ہیں، جن کا تعلق زیادہ تر طبقۂ نسواں سے ہے، کہا جاتا ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم و آزادی تخریب اخلاق کی مترادف ہے، لیکن میں اس کلیہ کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ نفس تعلیم یا آزادی کبھی مضرت رساں نہیں ہوسکتی اگر اسی کے ساتھ تربیت صحیحہ کا بھی خیال رکھا جائے اور تربیت صحیحہ اسوقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک مذہبی روح نہ پائی جائے۔

تمدن جدید کا سب سے زیادہ تیتج رُخ یہی ہے کہ اسنے مذہبیت کو بالائے طاق رکھدیا ہے اور صرف مادہ کو اپنا خدا سمجھکر اسکی پرستش شروع کردی ہے۔ چنانچہ وہ عام اخوت جس کا تعلق دنیا کے امن و سکون سے ہے اب مفقود نظر آتی ہے اور صرف قومیت کے جذبات نے انسان کو سطح مرتفع سے کھینچکر نیچے ڈالدیا ہے۔

ایشیاء کی قومیں جنہیں اپنے ملک پر اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ سے روحانی رفارمروں کا گہوارہ

رہا ہے، باوجود کوشش کے بھی احترام مذہب اکے جذبات کو اپنے اندر سے محو نہیں کر سکتیں، اور تہذیب جدید کے اس سیلاب فنا سے نجات دلانے والی اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو وہ ان کا یہی حال ہو، اسلیئے جسوقت ہم ممالک اقیہ کے حالات کا مطالعہ کریں تو یہ بھی غور کرنا ہمارا فرض ہو کہ ان میں کون کون سی باتیں ہمارے لیئے قابل تقلید ہیں اور کون سی احتراز کے قابل۔

مثلاً آجکل تعلیم و آزادی نسواں کا مسئلہ ہے جو عجیب وغریب صورت اختیار کرتا جاتا ہو، قبل اس کے کہ ہم ممالک مغرب کی تقلید میں عورتوں کو بلند تعلیم دلائیں یہ بات دیکھنی ضروری ہے کہ ایک عورت کے لیئے شرائط نسائیت کیا ہیں۔ اگر وہ تعلیم سے فنا ہو جاتے ہیں، تو ہم کو ایسی تعلیم سے نفرت کرنی چاہیئے، اور اگر کوئی تدبیر ایسی ہو جو باوجود آزادی خیال و وسعت تعلیم کے ان کو حدود نسائیت میں رکھ سکتی ہو، تو سب سے پہلے اس کا سامان فراہم کرنا ضروری ہے، آلنسمی کا یہ قول ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہو، کہ "ایک عورت حسین بننے سے پہلے ماں ہی بنائی گئی تھی"، پس اگر تعلیم ہماری ماؤں کو ہم سے چھین لینے والی ہے، تو بدقسمت ہے وہ قوم جو ایسی تعلیم کی حامی ہو۔

غزل

ظہور حسن کو سمجھا ہے جو سراب نمود
طریق عشق میں وہ کور چشم ہے مردود

حریم عشق کا اے ہمنشین وقار نہ پوچھ
در ایاز پہ جھکتا ہے افسر محمود

ہے تنگ عرصۂ ادراک جسکی وسعت سے
ہے اس زمین کا ذرہ یہ آسمان کبود

اگر دلوں میں ہو اے ہم سفر یقیں پیدا
قدم قدم پہ نظر آئے منزل مقصود

زبان سے ترا انکار ہو نہیں سکتا
گواہ ہے تری ہستی پہ جب مرا ہی وجود

یہی نظیرؔ خم تیغ کا اشارہ ہے
کسی کے در سے نہ اُٹھے مری جبین سجود

اصغر حسین خاں نظیرؔ

استفسارات

آنسہ مّی کا شعرِ منثور

محمد مبین - مرادآباد

اس سے قبل آپ نے ایک جگہ مصر کی مشہور مصنفہ آنسہ مّی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "اس کے افکار جو شعر منثور کے تحت میں ذکر کرنے کے قابل ہیں خاص طور پر قابل مستحق داد ہیں" کیا میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ "شعر منثور" سے کیا مراد ہے اور آپ کوئی نمونہ اس کا نگار میں درج فرما سکتے ہیں؟ آنسہ مّی کی مشہور تصانیف کون کون سی ہیں اور کس موضوع پر۔

(نگار) شعر منثور سے مراد وہ افکار و خیالات ہیں جو اپنی لطافت و ندرت کے لحاظ سے ہیں تو نظم کئے جانے کے قابل لیکن ادا کئے جاتے ہیں نثر میں جیسا کہ خود لفظ "شعر منثور" سے ظاہر ہے، اسی کو انگریزی میں (Poetry in prose) کہتے ہیں۔

اسمیں کلام نہیں کہ آنسہ مّی کی ادبیت یوں تو اس کے ہر مضمون سے ظاہر ہے، لیکن "شعر منثور" میں اسکی پاکیزگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ میں اس کے ادبی افکار کو اسلیئے اور زیادہ پسند کرتا ہوں کہ انکا نتیجہ ہمیشہ اخلاقی و اصلاحی ہوتا ہے۔ اور وہ صرف حسن و عشق کا راگ نہیں گاتی۔

ادب و شعر میں اسکی تصانیف یہ ہیں:-

۱- سوانح فتاۃ

۲- ظلمات و اشعہ ——— یہ ساری کتاب "شعر منثور" کے تحت میں آتی ہے

۳- Fleurs de Rêve - خواب کے پھول (فرانسیسی زبان میں) یہ نظم و نثر کا مخلوط مجموعہ ہے۔

۴- ابتسامات و دموع - ایک افسانہ ہے۔

۵- رجوع الموجۃ۔

۶- الحب فی العذاب

دیگر مباحث پر اس کے افکار کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔ باحثۃ البادیہ ——— ایک انتقادی بحث ہے

۲۔ غایۃ الحیات ——— ایک مشہور لکچر ہے جس کا مقصود اصلاح اخلاق ہو

۳۔ کلمات و اشارات۔ ——— اس کے لکچروں کا مجموعہ ہے۔

۴۔ المساوات ——— اسمیں عمرانی، تاریخی اور سیاسی مباحث پائے جاتے ہیں۔

ظلمات و اشعہ سے اس کا ایک مختصر مضمون "بکاء الطفل" لیکر ترجمۂ مفہوم پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اس کے "شعر منثور" کا اصلی رنگ ظاہر ہو جائیگا۔

گریۂ معصوم

میں نے ایک بچہ کو ہنستے ہوئے سنا اور میری نورانی روح، جسم خاکی میں تڑپنے لگی۔ کیونکہ اسکی آواز فرشتوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی تھی اور اس کا خندۂ لطیف بہت سے پوشیدہ اسرار ازل کا حامل تھا۔

پھر میں نے اسی بچہ کو روتے ہوئے سنا اور میرا دل بیتاب ہو کر منہ کو آنے لگا، اللہ کسی معصوم بچہ کا رونا نہ سنائے کہ آدمیوں کے رونے سے اسمیں کہیں زیادہ ایذا ہے،

میں نے بچہ کو روتے ہوئے سنا اس حال میں کہ اس کے گلابی گالوں سے (آنسوؤں کی صورت میں) بہت سی عبرتیں جاری تھیں اور یہ ڈھلکنے والے رقیق موتی آگ کے انگارے نظر آتے تھے۔

وہ بچہ روتا رہا اور اس کے حسین چہرہ سے عجز و یاس کی علامتیں ظاہر ہوتی رہیں، وہ روتا رہا اس حال میں کہ کوئی اس کا پوچھنے والا نہ تھا اور نہ دنیا میں اس سے کوئی محبت کرنے والا ——— پیارا بچہ رو رہا ہے، میں کیونکر اسکی آنکھوں میں انکی چمک الیس آؤں اور کسطرح پھر اسکی ہنسی میں فرشتوں کی صدائے بازگشت سنوں؟

. . . .

میں جھکی اور اپنے بازوؤں سے سہارا دیکر اپنی ران پر بٹھا لیا، اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسکی پاک پیشانی پر پڑے ہوئے بال اٹھائے۔

پھر میں نے ایک بوسہ کے اندر اپنی روح کی تمام شفقتیں منتقل کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو اسکی پیشانی سے مس کیا ——— بچہ حیران ہو کر خاموش ہو گیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ اسوقت ایک روح دوسری روح سے ہمکلام تھی، اس نے حزن و ملال سے بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور ایک ایسی آواز کے ساتھ جسمیں ہدایت پنہاں تھی، دنیا میں سے سب

زیادہ عزیز چیز کو پوچھا:۔ ماں، ماں!

....

اے چھوٹے بچے کی ماں، تیرا جگر گوشہ تجھے پکار رہا ہے، تو کیوں جواب نہیں دیتی۔ تو بیمار نہیں ہے، کیونکہ میں نے تجھے گلے میں جواہر کا ہار ڈالے خوش خوش چلتے پھرتے دیکھا ہے، تو صحیح و تندرست ہے، پھر کیوں نہیں دوڑ کر آتی، کیا اس بچہ کے آنسو تیرے دل کو بیتاب نہیں کرتے، کیا اسکی چیخ تجھے نہیں تڑپاتی۔

اپنی طویل تفریحوں، متعدد احباب کی ملاقاتوں، اور لغو و بیکار باتوں کو ختم کر کے جلدی آ، اور چھوٹے بچہ کے سامنے جھک کر معافی چاہ!

حسین بننے سے پہلے تو ماں ہی پیدا کی گئی تھی اور قبل اس کے کہ دن تجھے زانیہ بناتا، فطرت نے تیرے اندر صرف ماں ہونے کی کیفیت پیدا کی تھی۔

اس گہوارہ کے سامنے سربسجود ہو جا جس کے ساتھ تو پردوں کے اندر حالت طفلی میں کھیلا کرتی تھی، جوان ہونے پر تو جس کا خواب دیکھتی تھی، بیوی بننے پر تو جس کا انتظار کیا کرتی تھی، اب کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ ماں ہو کر اسکو چھوڑ بیٹھی گہوارہ کے سامنے جھک جا، کیونکہ یہی تیری ہستی کا مرکز ہے.........

چند اصطلاحات کا ترجمہ

مرزا سیف علی۔ حیدرآباد

انگریزی میں علوم و فنون کی کتابیں دیکھنا میرا تنہا مشغلہ ہے، اور یہ بھی جی چاہتا ہو کہ بعض کا ترجمہ اُردو میں پیش کروں، لیکن مناسب الفاظ نہ ملنے کے وجہ سے سخت دقت ہوتی ہے، کیا آپ کوئی اصولی بات ایسی بتا سکتے ہیں جو اس اشکال کو دور کر سکے، نمونتاً چند الفاظ پیش کرتا ہوں، براہ کرم ان کا ترجمہ بتایئے تاکہ میں ترجمہ کے اصول کو سمجھ کر اسپر آیندہ کاربند ہو سکوں، وہ الفاظ یہ ہیں:۔

(الفاظ یہاں درج نہیں کیئے جاتے۔ جواب میں درج کئے گئے ہیں)

(نگار) آپ حیدرآباد میں ہیں اور پھر بھی ترجمہ کے مشکلات کو رفع نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک جامعہ عثمانیہ اس باب میں خاص کاوش سے کام لے رہا ہے اور وہاں بعض علوم کی اصطلاحات کا ترجمہ بھی ہوا ہو ہرچند اس باب میں اہل ملک کا اختلاف ہے بعض نہایت ٹھیٹھ اُردو کے الفاظ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہیں ملتے تو ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، بعض عربی و فارسی سے مدد لینا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، اسوقت میں اس اختلاف پر محاکمہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں

لیکن کم از کم مجھے یہ ظاہر کر دینا چاہیئے کہ میں فریق ثانی کا موافق ہوں اور میرے پاس اسکی بڑی دلیل یہ ہے کہ اسطرح ہم کو عربی فارسی کی طرف میلان پیدا ہوگا، یا یہ کہ کم از کم اتنی بیگانگی باقی نہ رہیگی، علاوہ اسکے چونکہ اردو زبان خود غیر زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ ہے اسلیئے کوئی وجہ نہیں کہ اسکی حقیقی ترکیب کے اصول کو نظر انداز کر دیا جائے، اسی کے ساتھ عربی سے مدد لینے میں ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ لفظی آسانیاں بہت پیدا ہوجاتی ہیں جو کسی دوسری طرح حاصل نہیں ہوسکتیں۔ آپ کے مرسلہ الفاظ کا ترجمہ میں یہ کرونگا:-

انکسار نور	Refraction	انعکاس	Reflection
تخفیف، تلطیف	Rarefaction	زاویۂ انکسار	angle of refraction
منشور	Prism	خواص	Properties
رواق	Porch	مقدار ایجابی	Positive quantity
متساوی الابعاد	Equidistant	ملحقات	Fixtures
ترکیب، تعمیر	Erection	توازن	Equilibrium
منحرف، مائل	oblique	ترتیب	Equipment
متوازی السطوح	Parallelopiped	مقیاس الرطوبت	Psychrometer
متوازی المستطیلات	„ rectangle	مقیاس الزوایا	Pantometer
حمل	Conductivity	فتیل	Fuse

میں ممنون ہوگا اگر کوئی صاحب ان الفاظ کا ترجمہ ٹھیٹھ اردو میں کرسکیں۔

ابوالعتاہیہ کے متعلق چند سوالات

(عبدالصمد۔ الہ آباد)

(۱) ابوالعتاہیہ کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے (۲) کیا واقعی اسکو مہدی کی لونڈی عتبہ سے عشق تھا یا یوں ہی از راہ تمسخر ایسا ظاہر کرتا تھا (۳) اسکے بہترین اشعار کون سے ہیں (۴) اور خلیفہ مہدی نے لونڈی اسکو دی یا نہیں؟

(نگار) غنیمت ہو کہ آپ نے ایک سانس ٹوٹ جانے کے بعد دوسری سانس کو استفسارات کے لیئے وقف نہیں کیا، ورنہ میرے لیئے بڑی مشکل ہوجاتی، بندہ نواز اگر آپ تکلیف فرماکر صرف ابن خلکان کی وفیات الاعیان ہی ملاحظہ فرمالیتے، تو کم از کم

دوسرے اور تیسرے سوال کا جواب تو آپ کو مل ہی جاتا، کہ نہ اس کو لونڈی ملی، اور نہ اسکو حقیقتاً اُس سے زیادہ محبت تھی، جب ایک مرتبہ اسنے خلیفۂ مہدی کی خدمت میں عتبہ کی طلب کے لیئے یہ اشعار لکھکر پیش کیئے کہ:۔

نفسی بشیٔ من الدنیا معلقۃ — اللہ والقائم المہدی یکفیہا
انی لایأس منہا ثم یطعمنی — فیہا احتقارک للدنیا وما فیہا

(میرا جی دنیا کی صرف ایک چیز میں لگا ہوا ہے، جس کا ملنا اللہ اور مہدی کی مہربانی پر منحصر ہے، میں تو اس سے مایوس ہی ہوچکا ہوں، لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ تو دنیا و ما فیہا کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا، تو پھر امید بندھ جاتی ہے)

تو خلیفہ نے ارادہ کیا کہ عتبہ اس کے حوالہ کردے، لیکن جب عتبہ نے بہت معذرت کی تو خلیفہ نے حکم دیا کہ جو چینی کا برتن ابوالعتاہیہ نے پیش کیا تھا اسکو مال سے بھر کر دیدیا جائے، چونکہ مال کی تخصیص نہ تھی اسلیئے درہم بھر کر برتن واپس کردیا گیا، ابوالعتاہیہ ایک سال تک اسی بات پر عمال و اراکین سے لڑتا رہا کہ بجائے درہم کے دینار ہونا چاہیئے تھا، اور عتبہ کا نام تک نہ لیا۔

شاعری میں اس کا مرتبہ ایسا زیادہ بلند نہیں ہے، لیکن اسمیں بھی کلام نہیں کہ وہ فطری شاعر تھا، اور اپنے عہد کے اچھے شاعروں میں تھا۔ برجستہ گوئی میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا، اور اسی کمال کی بدولت وہ خلیفۂ مہدی کے حضور میں اسقدر گستاخ تھا،

اب رہا یہ امر کہ اس کے بہترین اشعار کون کون سے ہیں، اس کا جواب تو صرف انتخاب کے بعد دیا جا سکتا ہے مجھے تو فرصت نہیں، آپ ہی ایک مجموعہ ایسا شائع کرا دیجیئے۔ اسوقت جتنے اشعار اسکے میرے پیش نظر ہیں، ان میں ذیل کے اشعار مجھے زیادہ پسند ہیں:۔

کم من صدیق لی أسا — رقہ البکاء من الحیاء
واذا تفطن لامنی — فاقول مابی من بکاء
لکن ذہبت لارتدی — فطرفت عینی بالرداء

(میں اکثر شرم کے مارے اپنی گریہ وزاری کو اپنے احباب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، کیونکہ جب اسکی وجہ انہیں معلوم ہوجاتی ہے تو مجھے ملامت کرتے ہیں، اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ روتا کون ہے، یہ تو چادر اوڑھنے میں اس کا کنارہ آنکھ میں لگ گیا ہے)

عالم نزع میں مغارق مغنی کو بلا کر جو اسنے دو شعر سنے ہیں، وہ بھی خوب ہیں:۔

اذا ما انقضت عنی من الدہر مدتی — فان عزاء الباکیات قلیل

سیعرض عن ذکری و تنسیٰ مودتی — و یحدث بعدی للخلیل خلیل

(جب دنیا میری زندگی کا زمانہ ختم ہو جائیگا (تو رفتہ رفتہ مجھے سب بھول جائیں گے،) ماتم کرنے والیوں کا ماتم بھی کم ہو جائیگا، میرا ذکر بھی لوگ چھوڑ دینگے، میری محبت بھی بھلا دی جائیگی اور میرے دوستوں کے اور نئے دوست پیدا ہو جائیں گے۔)

فرقہ معتزلہ کے مختلف فرقے

(اکرام اللہ۔ ڈھاکہ)

کیا طبقۂ معتزلہ سے مراد مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جو منقولات کو معقولات سے مطابق کرکے دیکھتا ہے، یا یہ کوئی مخصوص جماعت ہے، سنا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے متعدد فرقے ہیں اور ان سب کے معتقدات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے، کیا براہ کرم مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

(نگار) یہ تو صحیح نہیں کہ طبقۂ معتزلہ سے صرف وہ طبقہ مراد ہے جو معقول و منقول میں تطابق کی کوشش کرتا ہے، بلکہ اس جماعت سے مراد وہ جماعت ہے جو صفات الہیہ کی نفی کرتی ہے، اور تمام معارف کو حصولاً و وجوباً (قبل شرع ہو یا بعد شرع) عقلی ظاہر کرتی ہے اسمیں اکثر اس کے بھی قائل ہیں کہ ان الامامۃ بالاختیار۔ اس جماعت کے بیس فرقے ہیں۔

(۱) واصلیہ، یعنے واصل بن عطاء کے متبعین۔ یہ ۸۰ھ میں بمقام مدینہ پیدا ہوا، یہ شخص اپنے عہد کا بڑا فاضل تھا اس کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گفتگو کے دوران میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہ کرتا تھا جس میں حرف ر پایا جائے۔ کیونکہ یہ الثغ تھا اور ر اس سے ادا نہ ہوتی تھی۔ یہ نفی صفات اور قدر کا قائل تھا، مرتکب کبائر کے خلود فی النار کو تسلیم کرتا تھا۔ ۱۳۱ھ میں اس کا انتقال ہوا (۲) عمرویہ، عمرو بن عبید کے مقلد بن عمرو کہلاتے ہیں (۳) ہذیلیہ محمد بن الہذیل کے متبعین کو کہتے ہیں، اسکو شیخ المعتزلہ کہتے ہیں، یہ واصل بن عطا کا شاگرد تھا، اور اپنے عہد کا نہایت زبردست عالم تھا، اس کا قول تھا کہ تمام طاعات فرائض ہوں یا نوافل ایمان میں داخل ہیں، یہ اللہ کے علم اور اسکی قدرت و حیات کو عین ذات تصور کرتا تھا اور مقدورات الہی کے منتہی ہو جانے کا قائل تھا، یعنے اب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے اور فنا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

(۴) نظامیہ۔ ابراہیم بن سیار النظام کے اتباع کا لقب ہے۔ یہ جزو ہر فرد کا قائل نہ تھا اور اسے اعراض کا مجموعہ

تھا، قرآن کو صرف اس کے مخبر غیب ہونے کے لحاظ سے معجز جانتا تھا، اجماع کا قائل نہ تھا، قضاء نماز، صلوٰۃ تراویح میقات حج، شق قمر اور رویۃ جن وغیرہ کو بھی تسلیم نہ کرتا تھا، لیکن اس کا سب سے زیادہ قبیح حرکت بعض صحابہ کو برا کہنا تھا،

(۵) اسواریہ :- ابو علی عمرو بن قائد الاسواری کے مقلدین کا نام ہے، یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ میں اس کام کی قدرت نہیں ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ نہیں کرتا۔

(۶) اسکافیہ :- ابو جعفر محمد بن عبد اللہ الاسکافی کے ارادت مند اس نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ کہتا تھا کہ اللہ ظلم عقلا پر قادر نہیں ہے اور اطفال و مجانین کے ظلم پر قادر ہے۔

(۷) جعفریہ :- یعنی جعفر بن حرب بن میسرۃ کے متبعین۔ یہ صغائر کے مرتکب کو بھی جہنمی سمجھتا تھا۔

(۸) بشریہ :- بشر بن المعتمر کے پیرو۔ اس نے صفات خداوندی کی دو قسمیں کی تھیں، صفات ذاتی، اور صفات فعلی، ارادۂ خداوندی کو بھی افعال خداوندی میں شامل کرتا تھا۔

(۹) مزداریہ :- ابو موسی عیسی بن صبیح مزدار کے متبعین۔ یہ بڑا زاہد و مرتاض تھا، یہ کہا کرتا تھا کہ خدا کذب و ظلم پر قادر ہے، یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ نہ سمجھتا تھا، اور اس سے بہتر کتاب پیش کئے جانے کا قائل تھا، نگاہ کے ساتھ رویت خدا کے قائل کو کافر کہتا اور جو اس کے کفر میں شک کرتا اسے بھی کافر تسلیم کرتا، خلق قرآن کا بھی قائل تھا،

(۱۰) ہشامیہ :- ہشام بن عمرو الفوطی کے متبعین۔ قدر میں بہت مبالغہ کرتا تھا، جنت و نار کو غیر مخلوق کہتا تھا، موسیٰؑ کے لیئے دریائے نیل کا پھٹ جانا، ان کی عصا کا سانپ بن جانا، شق قمر، عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا اس کے نزدیک سب لغو باتیں تھیں، چونکہ ایام فتنہ و فساد میں امامت کا قائل نہ تھا اسلیئے حضرت علی کی خلافت کو بھی ناجائز کہتا تھا۔

(۱۱) حائطیہ :- احمد بن حائط کے اتباع۔ یہ مسیح کو ابن اللہ کہتا تھا، چوپایوں، چڑیوں اور حشرات میں بھی ظہور انبیاء کا قائل تھا، اور دلیل میں کلام مجید کی یہ آیات پیش کرتا تھا:- ان من امۃ الا خلا فیہا نذیر۔ وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم —— یہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور رسول اللہ کے تعداد ازدواج کو برا کہتا تھا۔

(۱۲) حماریہ۔ یہ ایک جماعت تھی جو کسی خاص شخص کی پیرو نہ تھی، اس کا اعتقاد تھا کہ خدا اپنے بندے کو خلق حیات کی قدرت عطا کر سکتا ہے۔

(۱۳) حماریہ :- یہ ایک جماعت تھی جو کسی خاص شخص کی پیرو نہ تھی، اس کا اعتقاد تھا کہ خدا اپنے بندے کو خلق حیات کی قدرت عطا کر سکتا ہے،

(۱۳) معمریہ :- معمر بن عباد السلمی کے اتباع - یہ انسان کو حی، عالم، قادر اور مختار مانتا تھا، وہ کہتا تھا کہ خدا نے غیر احیام کو پیدا نہیں کیا - وہ اللہ کو قدیم بھی نہیں مانتا تھا۔

(۱۴) ثمامیہ :- ثمامہ بن اشرس النمیری کے اتباع - یہ کہتا تھا کہ یہود، نصاریٰ، زنادقہ قیامت میں مٹی ہو جائینگے ان پر ثواب عذاب کچھ نہ ہوگا کیونکہ یہ لوگ معرفت الٰہی پر مجبور نہیں ہیں -

(۱۵) جاحظیہ :- ابو عثمان عمرو بن الجاحظ کے معتقد - وہ کہتا تھا کہ خدا خود کسی کو جہنم میں نہ ڈالیگا، بلکہ جہنم خود کھینچ لیگا قرآن کو قبیل اجساد سے سمجھتا تھا، اور کہا کرتا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ کبھی مرد ہو جائے اور کبھی عورت، وہ اس کا بھی قائل تھا کہ اللہ معاصی کا ارادہ نہیں کرتا۔

(۱۶) خیاطیہ :- ابو الحسین بن ابی عمرو الخیاط کے اتباع - یہ معدوم کو بھی ایک شے سمجھتا تھا،

(۱۷) کعبیہ :- ابو القاسم عبد اللہ بن احمد بن محمود الکعبی کے ارادت مند - ارادۂ اللہ کو وہ کوئی صفت قائم بالذات قرار نہیں دیتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ خدا کے دیکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آنکھ سے دیکھتا ہے بلکہ اس سے مقصود صرف قوت تمیز ہے،

(۱۸) جبائیہ :- ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی کے پیرو - کلام اللہ کو عرض کہتا تھا۔

(۱۹) بہشمیہ :- ابو ہاشم عبد السلام کے متبعین - یہ طہارت کے غیر واجب ہونے کا قائل تھا، اور ضعیف انسان کے زنا سے تائب ہونے کو لغو قرار دیتا تھا، وہ قرآن کی طرح دوسری کتاب لکھے جانے کو بھی ممکن سمجھتا تھا۔

(۲۰) شیطانیہ :- محمد بن نعمان کے اتباع - یہ شیطان الطاق کے لقب سے مشہور تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ اللہ نے جو کچھ پیدا کر دیا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔

ایک برہم مستفسر

(عبد الصمد - ریح باغ کانپور)

میں نہایت افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ تین چار مہینے سے برابر نگار دیکھ رہا ہوں، مگر میرا مطلب نہیں نکلتا حالانکہ کئی مرتبہ سوال پیش کر چکا ہوں - اگر جواب دینا ہے تو اس مہینہ میں لکھ دیجئے، ورنہ آئندہ سے میرے نام نگار نہ بھیجئے، حالانکہ ابھی نگار کو دسمبر تک آنا چاہیئے، مگر میں اسکو چھوڑتا ہوں - سوالات یہ ہیں: -

(۱) اورنگ زیب نے اپنے باپ کو کیوں قید کیا جب کہ وہ اسقدر باشرع و خدا شناس تھا۔

(۲) پٹھان کب سے ہوئے اور کہاں سے آئے،
(۳) سنا ہے کہ سید آگ پر چلتے ہیں مگر جلتے نہیں
(۴) ایک ملک ہے جہاں ۶ مہینے دن رہتا ہے اور ۶ مہینہ رات، وہاں کے مسلمان کیسے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اور افطاری وسحری کا انتظام کیسے ہوسکتا ہے۔

(نگار) میں نے آپ کی تحریر بجنسہ اسلیئے درج کردی تاکہ ناظرین نگار کو اندازہ ہوجائے کہ میرے پاس سلسلۂ استفسار کیسے کیسے دلچسپ خطوط آتے ہیں۔ میں نہایت ادب سے تاخیر کی معافی چاہتا ہوں اور اس اندیشہ سے کہ اگر آپ زیادہ روٹھ گئے تو پھر منانا مشکل ہوگا، آپ کے سوالات کا جواب پیش کرتا ہوں:۔

(۱) اگر ان تمام سیاسی مصالح کو نظر انداز کردیا جائے، جن کی رعایت ایک بادشاہ پر بمنزلہ فرض کے ہوتی ہے، تو بھی آپ اورنگ زیب کو زیادہ سے زیادہ گنا ہگار کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ کو مقید کیا (اگر اسے قید کرنا کہہ سکتے ہیں) لیکن آخر آپ کو اسقدر الجھن کیوں ہے، کیا آپ اورنگ زیب کو معصوم خیال کرتے تھے، اس غریب نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا

(۲) پٹھانوں کے متعلق قول مرجح یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں، ان کی مفصل تاریخ نواب عبدالسلام خانصاحب رام پوری نے لکھی ہے اُسے ملاحظہ کیجیئے

(۳) سنا ہے کہ سید آگ پر چلتے ہیں مگر جلتے نہیں"۔ . . . . اب بھی بہت سی وحشی قومیں ایسی ہیں جو آگ پر چلتی ہیں۔ ایک سید محض سید ہونے کے لحاظ سے آگ پر چلنے کی قدرت نہیں رکھتا، یہ بالکل لغو و مہمل بات ہے، ہاں جس طرح اور لوگ مشق و ترکیب سے ایسا کرسکتے ہیں۔ سید بھی کرسکتا ہے اور شیخ بھی، آگ اندھی ہے۔ اور تفریق قومی کو نہیں دیکھتی۔

(۴) ایسے ملکوں میں نماز و روزہ کے متعلق حکم ہے کہ درجات بروج کے حساب سے دن رات کی تقسیم کرلی جائیگی، اسکی سہل ترکیب یہ ہے کہ چاند کا منطقۂ مائلہ، منطقۃ البروج سے ۵ درجے مائل ہوتا ہے، اسلیئے منازل شمالیہ میں اسکا مدار مہینہ نظر آئیگا۔ اور اسکو نصف کرکے افطار و سحار کا حساب لگالیا جائیگا، جب وہ بروج جنوبیہ میں ہوگا تو بھی اسی طرح حساب ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ ہو الذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔ اس سے ثابت ہے کہ جب احکام شرعیہ میں کسی حساب کی ضرورت ہوگی تو چاند کے منازل بروج کا اعتبار کیا جائیگا۔

یہ مسئلہ طویل بحث کا محتاج ہے لیکن آپ کے سمجھانے کے لیئے مختصراً نتیجہ عرض کردیا گیا۔

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۸۸

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء

جعفری جنتری سنہ ۱۹۲۵ء

اُردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی جنتری ہے، کیونکہ اسمیں تمام وہ معلومات درج ہیں جن کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، ہر قسم کے اعداد و شمار، صنعتی معلومات، تجارتی کمپنیوں کے پتہ، ہندوستان کے مشاہیر کے مختصر حالات مع اُنکے پتہ کے درج کئے گئے ہیں، اسکے علاوہ مشہور اہل قلم حضرات ہند مضامین نظم و نثر سے بھی جنتری کو زینت دیگئی ہے۔

جنتری سنہ ۱۹۲۵ء کثیر تعداد میں ۲۲+۲۹/۸ سائز چھپ رہی ہے، جن لوگوں کو اشتہار شائع کرانا ہو وہ اپنا اشتہار مع زر اُجرت کے جلد بھیجدیں اُجرت فی صفحہ عنہ روپیہ ۲ بھیجیں

جعفری جنتری - [illegible]

ملاحظات

۱۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ جولائی اور ستمبر کے نگار میں جو غزل و نظم جناب ثاقب کانپوری کی درج ہوئی ہے وہ اس سے قبل کسی اور رسالہ یا اخبار میں شائع ہو چکی تھی، اسی طرح جناب ہادی مچھلی شہری کی غزل جو ستمبر کے نگار میں درج ہے، نیرنگ خیال کو بھیجی جا چکی تھی۔

مانا کہ یہ حضرات اپنے کلام کو گنج گرانمایہ سمجھ کے ہر رسالہ کو اپنا محتاج سمجھتے ہیں، لیکن بڑا کرم ہو اگر وہ نگار کو اپنے اس احاطۂ پندار سے باہر رکھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہر شخص پر منکشف ہے کہ نگار کبھی کسی نثار یا نظام کے سامنے دست گدائی پھیلانے کا عادی نہیں ہے اور اس کا انداز شروع سے لیکر اسوقت تک بجائے اخذ افتخار کے ہمیشہ افتخار بخش رہا ہے۔

امید ہے کہ آئندہ اس کا لحاظ رکھا جائیگا کیونکہ غزلیں اور منظومات شائع کرنا نگار کا مقصد حقیقی بھی نہیں ہے، میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب ثاقب کا خط معذرت میں آیا جسمیں آئندہ کے لیئے احتیاط کرنے کا انہوں نے وعدہ فرمایا ہے،

۲۔ جولائی میں تعویذ کے عنوان سے جو فسانہ محمد مشہود صاحب فاروقی کا شائع ہوا ہے وہ amulet کا ترجمہ تھا جو "کرانکل" کے سنڈے اڈیشن میں شائع ہوا تھا۔

۳۔ اس مہینہ میں مطبوعات جدیدہ نے اسقدر جگہ لے لی کہ معلومات کا حصہ درج نہ ہو سکا، انشاء اللہ ماہ آیندہ میں اس کمی کو پورا کر دیا جائیگا۔

۴۔ اس سے قبل کسی اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ ماسٹر محمد حمزہ خان صاحب ناندورہ ضلع بلڈانہ (برار) متعدد رسائل کی جلدیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ بعض حضرات ان رسائل کی فہرست معلوم کرنے کے لیئے بیتاب ہوں گے اسلیئے ان کی اطلاع کے لیئے یہ ظاہر کیئے دیتا ہوں کہ کل رسائل کی تعداد ۲۷ ہے لیکن ان میں خاص خاص یہ ہیں، زمانہ، مخزن، نقاد، الہلال، البلاغ، شباب، نگار، ہمایوں، الناظر، دس سال کی مکمل و نامکمل جلدیں ماسٹر صاحب کے پاس موجود ہیں۔ ان سے خط و کتابت کی جائے۔

فن تنقید

(بسلسلۂ ماہ مئی ۱۹۲۴ء)

۵

ادب تکوینی اور تخیل کا تعلق

تکوینی ادب کے باب میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نوعِ خاص کی ادبیات کی خوبی کا اندازہ تین امور پر منحصر ہے: خیال کی صداقت، اظہار خیال کا اعتدال، اور تخیل کا اُسے قبول کرلینا؛ اور یہ تینوں باتیں تکوینی ادب کے مواد، طرزِ بیان، اور قوت سرور آفرینی کے مقابلہ میں بالترتیب رکھی جا سکتی ہیں۔

ان امور پر غور کرنے کے لیئے بہتر ہے کہ ہم اس باب میں زمانہ حدیث کے دو جلیل القدر اہل تنقید کے خیالات کا مطالعہ کریں، اور وہ لیسنگ (Lessing) اور وکٹر کزن (Victor Cousin) ہیں۔ لیسنگ نے اپنے مختصر مگر مفید اور اہم رسالہ موسوم بہ "لاؤکون" میں جو ۱۷۶۶ء میں شائع ہوا تھا اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے؛ اور وکٹر کزن نے اپنے ۱۸۱۸ء کے متن لیکچروں میں (جو ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئے) ان امور سے بحث کی ہے، ان دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ فنون کا اثر زیادہ تر تخیل پر ہوتا ہے، اور تخیل ہی اُن کی پذیرائی کرتا ہے؛ اور یہ کہ فنون کے اثر کو جذب کرنے میں انسان کے فہم اور حواس کا درجہ تخیل کے بعد ہے۔ گو دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ سلسلۂ خیالات اور اسلوب مختلف ہے۔ لیسنگ کو یہ بحث مدنظر تھی کہ "حقیقت" کے کون کون سے عناصر اور اسکی کیا کیا شکلیں ہیں جن کا اظہار شاعر اور نقاش کا فرض ہے، اور وہ اپنے اپنے خاص فنون میں یہ خوبی کس طرح پیدا کر سکتے ہیں کہ اُن کے پیدا کردہ مظاہرِ فنون کو تخیل قبول کرلے، برعکس اسکے کزن اُس عمل کی تشریح و تفصیل کر رہا تھا جس کے ذریعہ سے ایک صناع (یا شاعر) اپنے حواس کے پیش کردہ خام اور ہیولانی مادے کو ایک ایسے خیال یا ایسی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے جو (اُس صناع کے خاص وسیلۂ اظہار کی وساطت سے) اپنے ناظر یا قاری کے تخیل پر قبضہ کر لیتا ہے۔ یا مختصراً یوں کہنا چاہیئے کہ لیسنگ یہ بتاتا ہے کہ ایک صاحب فن صناع کے لیئے ضروری ہے کہ اظہار حقیقت کے لیئے وہ اپنی انتخاب کردہ شے کی مادی صفات کو اپنے فن کے لوازم اور ضروریات کے مطابق تبدیل کرکے پیش کرے؛ اور کزن یہ بتاتا ہے کہ ایک صاحب فن جس "خیال" — یا حقیقت کی شکل ذہنی — کو اپنے خاص فن کی شے میں ظاہر کرنا چاہتا ہے، وہ

"خیال" اس کے ذہن میں کسطرح قائم اور مرکوز ہوتا ہی۔

لیسنگ بھی، جیسا کہ ہم پہلے دکھا چکے ہیں، نقاشی کو "آنکھ کا فن" اور شعر کو "کان کا فن" کہتا ہی۔ چنانچہ وہ کہتا ہی کہ "شعر قابلِ سماعت آواز کو زمان میں پیش کرتا ہی، اور نقاشی شکل اور رنگ کو مکان میں جلوہ گر کرتی ہی"۔ حقیقت کی جو صورت ایک نقاش کے لیے موزون حال ہی، وہ اُس کی رائے میں "ایک، الیامرئی مگر ساکن عمل ہی، جس کے مختلف اجزاء مکان میں نشو ونما پاتے ہیں" اور وہی صورت شاعر کے نقطۂ خیال سے "ایک الیامرئی مگر متحرک اور مسلسل عمل ہی جس کے مختلف اجزاء زمانی ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جب نقاش کسی عمل کی نقل کرتا ہی، تو وہ نقل بالواسطہ ہوتی ہی، یعنی یہ کہ وہ اجسام اور اشکال کا نقش اس طرح کھینچتا ہی جس سے عمل کا اندازہ ہو سکتا ہی، علیٰ ہذا القیاس شاعر کا طرز عمل بھی بالواسطہ ہے، یعنے یہ کہ وہ بھی اپنے مجوزہ اجسام کے عمل یا اُس عمل کے اثرات کا بیان ہم کو سنا دیتا ہی خواہ وہ اجسام زندہ ہوں خواہ مردہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کوئی نقاش کسی عمل کا اظہار کرتا ہی تو وہ اُس عمل کے صرف اسی ایک لمحہ کو انتخاب کرتا ہی جس خاص لمحہ کے نقش سے اُس کے ماقبل اور مابعد کے کوائف اور احوال کا ناظر کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح ایک شاعر بھی جب کبھی شئے کو بیان کرتا ہی، تو وہ اُس شئے کی اُس خاص صفت کو انتخاب کر لیتا ہی جس سے سامع کے ذہن میں اُسکی ایک صاف و واضح تصویر کھنچ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک "جہاز" کو لیجیے۔ نقاش اپنے پردہ پر جہاز کا جو نقش کھینچتا ہی وہ صرف اسی قدر ہوتا ہی جس قدر کسی ناظر کی نگاہ میں کسی ایک زاویۂ نگاہ سے سما سکے۔ برعکس اس کے ایک شاعر کسی جہاز کا ذکر کرتے ہوئے اُسکی کسی خاص صفت یا خصوصیت کا بھی ذکر کرتا ہی۔ مثلاً "جہازِ رواں"

....

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی، نہاں ہی یونہی (اقبال)

قلم کا کام (اور کمال) یہ ہے کہ وہ کوائف باطنی کو ہمارے اندر اس طرح برانگیختہ کرکے کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے حقیقی نظاروں کی صورت میں آموجود ہوں۔ اور چونکہ ہمارا ذہن کسی طویل بیان کو دیر تک ایک مشاہدۂ عینی کی صورت میں قائم نہیں رکھ سکتا، اسلیئے صرف وہی شاعر اپنے سامع یا قاری کے ذہن میں ایک مستقل اور پائدار نقش پیدا کر سکتا ہی جو اپنے کل بیان کو ایک نقطہ یا ایک جملہ میں بھر دے۔ قرآن کریم نے کس خوبصورتی سے چند حسینانِ مصر کے ہاتھوں میں چاقو اور سیب دیکر اور ان کے ہاتھوں کو زخمی کرکے صرف ایک فقرے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اُس حسن جہاں آرا کی تعریف ختم کر دی ہے جس کے لیئے شاید کئی صفحے بھی کم ہوتے! پھر چونکہ ایک طرف

انسان کا حسن اور دوسری طرف مناظر قدرت کا حسن دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، اس لیئے مناظر قدرت کا بیان ایک شاعر کے لیئے مناسب اور موزوں نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہو کہ شاعر اس قسم کے مناظر کو بیان نہیں کر سکتا، نہیں، بلکہ وہ ضرور بیان کر سکتا ہو، کیونکہ اُس کے پاس جو وسیلۂ بیان ہو ــــ یعنی الفاظ ــــ وہ ایسا ہو کہ اُسکی وساطت سے انسان ہر نوع کے خیالات کے لیئے اپنے ذہن میں جگہ پیدا کر سکتا ہو۔ مگر تکوینی ادب پیدا کرنے والے کا مقصد ایک مورخ یا فلسفی کے مقصد سے بالکل مختلف ہو؛ وہ ایک صناع ہے، صاحب فن ہے، اور اس لیئے ضروری ہو کہ وہ اپنے "فن" کا طریقہ استعمال کرے، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیانات کو اس انداز سے قلمبند کریگا کہ جو نہ صرف فہم، بلکہ زیادہ تر، تخیل کو مقبول ہو۔ لیسنگ نے اس امر کو خوب بیان کیا ہو، سنیئے، وہ کہتا ہو کہ "[۵] چونکہ گویائی (یعنے بولنے) کے اشارے خود ہمارے ہی مقرر اور اختیار کیئے ہوئے ہیں، اسوجہ سے ہمارے لیئے یہ بالکل آسان اور ممکن امر ہے، کہ ہم اُن اشاروں کے ذریعہ سے کسی شے کے مختلف حصوں کے متصل اور مسلسل نظارے کو اُسی کمال کے ساتھ بیان کر سکیں جسطرح ہم انکو اصلی فطری حالت میں دیکھتے ہیں مگر یہ ہماری گویائی اور اُس کے اشارات (الفاظ) کی ایک عمومی صفت ہے، اور اس سے فن شعر کو کسی خاص قسم کی مدد نہیں ملتی، شاعر کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے خیال کو سننے والوں پر عیاں کر دے بلکہ ضروری ہے کہ اُس کے اظہار میں وضاحت سے بھی بلند تر کوئی صفت پائی جائے، وہ چاہتا ہے کہ جو خیالات اُس کی تقریر سے ہمارے ذہن میں برانگیختہ ہوئے ہیں وہ اسقدر صاف و واضح ہوں کہ جسوقت وہ خیالات ہمارے ذہن میں موجزن ہوں اُسوقت ہم کو یہ احساس ہو رہا ہو کہ گویا ہم اپنی آنکھ سے ان تمام اشیاء کا مشاہدہ کر رہے ہیں جن کی وہ خیالات نمایندگی کر رہے ہیں ــــ اور ہم اُس عالم میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اُسوقت شاعر کے اختیار کردہ وسیلہ (یعنی اس کے الفاظ) کا مطلق خیال نہیں رہتا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا ہیں۔ نقش شعری کی توضیح کی بنیاد اسی اصول پر ہے"

یہ تو جرمن عالم کا قول و خیال تھا۔ اب فرانسیسی اہل رائے، "کزن"، کے خیالات سنیئے۔ کہتا ہو کہ "[۵] اس عالم محسوسات میں ہم فطرت کے حُسن کا ایک بار نظارہ کر چکنے کے بعد کبھی کبھی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اُسی فطری حسن کو (جسمانی ہو، خواہ اخلاقی) پھر دیکھیں اور محسوس کریں، اس خواہش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اُس حسن کے نقش کو دوبارہ اپنی نگاہ کے سامنے کھینچنا چاہتے ہیں۔ مگر کس رنگ میں؟ اُس رنگ میں نہیں جیسا کہ وہ حسن فی الواقع ہے، بلکہ اُس رنگ میں کہ جس میں ملبوس کرکے ہمارا تخیل اُسے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اسطرح انسان، اپنی بساط کے لائق، اپنا ایک حقیقی مخلوق پیدا کرتا ہے ــــ یہ اُس کے فن کا مخلوق ہے"؛ صناع نہ تو اس معنی میں خالق ہوتا ہے

[۵] کزن کا لیکچر "صداقت، فن" از ترجمۂ درسفلڈ

جس معنی میں ہم اللہ کو خالق کہتے ہیں، اور نہ وہ محض نقال ہوتا ہے وہ اس اصلی محسوسات کی دنیا میں سے اپنے مواد کا انتخاب کرتا ہی، مگر اس تمام مواد کو ایک نئی اور بدلی ہوئی صورت میں پیش کرتا ہی، نقاش کے لیے کائنات میں ایک اُسوہ[51] موجود ہے، اور اُسی کو مدنظر رکھ کر وہ از سر نو اُسوہ گری کر کے اپنے لیے سُرور کا سامان بہم پہونچاتا ہی۔ کزن کا قول ہے کہ "ایک حقیقی صناع کے دل میں فطرت کا پورا پورا احساس اور تحسین جاگزین ہوتی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ فطرت کی ہر قابل تحسین چیز رتبہ میں برابر نہیں ہی" اس لیے جب کوئی صناع اپنی "مخلوق" کے ناظر کے ذہن میں کوئی "خیال" برانگیختہ کرتا ہی، تو ایسا کرنے کے لیے وہ مظاہر فطرت میں سے اپنے خاص مضمون کے لیے چند امور کو انتخاب کر لیتا ہے اور چند کو بالکل ترک کر دیتا ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیز میں خواہ کسی عمل کو پیش کرے، خواہ کسی شخص کو، خواہ کسی شے کو، ہر صورت میں وہ اس "خیال" کی تخلیق کے لیے یہی کرتا ہی کہ اصلی مظہر فطرت میں (جس سے اُس نے یہ "خیال" لیا ہی) جو جو عیب ہوتے ہیں ان کو ترک کر دیتا ہی اور ان کی جگہ ایسی خوبیاں رکھ دیتا ہے جو اُس میں موجود نہیں ہوتیں۔ گویا وہ از سر نو "اُسوہ گری" کرتا ہے، اور یہی اُسوہ نما اصلیت ــــ نہ کہ خود اصلیت ــــ وہ چیز ہے جسے وہ اپنے فن کے موزون حال وسیلہ (نقش ہوں یا الفاظ) کی مدد سے اپنے سامع یا ناظر کے سامنے پیش کرتا ہی۔ کزن کہتا ہی کہ "یہی[52] سبب ہے کہ ہم پر "فن" جو اثر پیدا کر سکتا ہی، وہ فطرت نہیں پیدا کر سکتی۔ فطرت کے پاس ہمارے تخیل اور ہماری نگاہ کو مسرور کرنے کا ایک اور ذریعہ نہایت کثرت کے ساتھ موجود ہے ــــ یعنی حیات "فن" کا اثر ہم پر اسلیے زیادہ ہوتا ہی کہ وہ اخلاقی حسن کو پیش کر کے براہ راست ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہی، جاذب ہونے کے لحاظ سے فن کو فطرت پر فوقیت حاصل ہو سکتی ہے؛ اور یہی طاقت جذب اعلیٰ درجہ کے حسن و کمال کی علامت اور معیار ہے"

ذرا سے غور سے آپ پر یہ امر واضح ہو جائیگا کہ تمام "فنون" میں شعر اور تکوینی ادب ہی وہ چیزیں ہیں جن میں یہ اُسوہ گری کا عمل نہایت آزادی اور نفاست سے ہو سکتا ہی، ایک تو یہ کہ تمام فنون کے وسائل اظہار میں ان ہی دونوں کا وسیلۂ اظہار، یعنے زبان، سب سے زیادہ لچکدار ہے؛ دوسرے یہ کہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے، اور اس وجہ سے شاعر اپنے مطالب کو نہایت آسانی سے اور براہ راست اپنے سامع (یا قاری) کے ذہن تک پہونچا سکتا ہے،

اس مضمون کو کزن کس خوبی سے بیان کرتا ہی، گویائی[53] شعر کا ایک آلہ ہے، اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے

---

[51] Ideal [52] کزن کا لیکچر "صداقت فن" [53] لیکچر "صداقت فن"

شعر گویائی کو جسطرح چاہتا ہے ڈھال دیتا ہے، اور اسطرح اسکی اُسوہ گری کرتا ہے کہ وہ (گویائی) اُسوۂ حسن کے قرار واقعی اظہار پر قادر ہو جائے۔ شعر اپنی بحر سے گویائی میں دلاویزی اور شکوہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ گویائی کو ایک ایسی چیز کی صورت میں بدل دیتا ہے، جو نہ آواز ہے نہ موسیقی ہے، بلکہ ان دونوں کی خصوصیات اُسمیں موجود ہیں، جو مادیت اور روحانیت دونوں صفات سے موصوف ہے؛ جو مکمل ہے، صاف و واضح ہے، اور دقیقہ رسی کے ساتھ صحیح ہے؛ جسمیں شکل و وضع کی باریک ترین تفصیل موجود ہے؛ جو کچھ ایسی چیز ہے کہ رنگ کی طرح جاندار اور زندہ بھی ہے، اور آواز کی مانند جاذب اور لا انتہا بھی۔ ایک لفظ، محض ایک لفظ، اور خصوصاً وہ لفظ جسے شعر نے چن کر اپنی ضرورت کے موافق اُسکی ہیئت کذائی بدل دی ہو، قوی ترین اور عالمگیر ترین چیز ہے۔ شعر خود اپنے اسی مخلوق سے آراستہ اور مسلح ہو کر سنگتراشی اور نقاشی کی طرح دنیائے حواس کی تمام تصویروں کو، نقاشی اور موسیقی کی طرح تمام دلی جذبات کو، اُن کی تمام اختلافِ نوعیت کے ساتھ، اپنے اندر منعکس کرتا ہے ـــ اور یہ اختلافِ نوعیت بھی کیسا کہ جس تک موسیقی کی بھی رسائی نہیں ہے، اور جس کا رنگ اسقدر تیزی کے ساتھ بدلتا ہے کہ نقاشی اُس کی گرد بھی نہیں پاتی، پھر یہی نہیں، بلکہ شعر اُس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے کہ جو دوسرے فنون کی رسائی کی حد سے باہر ہے یعنے خیال ـــ اور پھر خیال بھی وہ خیال کہ جسمیں کوئی رنگ نہیں، وہ خیال جس سے کوئی آواز بج کے نہیں نکل سکتی، وہ خیال جس کا اندازہ انسانی چہرہ کی کسی عارضی وضع سے نہیں کیا جا سکتا ـــ ہاں، شعر خیال کی بلند ترین پرواز اور اُسکی دقیق ترین اور باریک ترین وجدانی حالت کا بھی اظہار کرتا ہے!"

غرض یہ کہ تکوینی ادب میں سب سے بڑی اور نہایت ضروری صفت یہ ہونی چاہیئے کہ اُسے تخیل قبول کرے

محمد نعیم الرحمن ایم اے

غزل

اب جذبۂ وفا کی نظر سوئے در کہاں | اب آہِ سرد و گرمِ تلاشِ اثر کہاں

تقدیر کا بگاڑ امیدوں کے ساتھ تھا | اب ہم پہ وہ عتابِ قضا و قدر کہاں

مرنا قبول ہے مگر اے حسنِ بے نقاب | اب مانتی ہے جرأتِ شوقِ نظر کہاں

وہ آئیں گے سحر کو یہ ہے نامہ بر درست | لیکن مریضِ غم کو امیدِ سحر کہاں

آتا ہے پھر بہ سیر وہ قاتل اسی طرف | وحشی تمھیں جنوں ہے تم آئے ادھر کہاں

وحشی شاہجہانپوری

مجھے چا ہونا!

ایک انگریزی انشا پرداز کا قول ہے کہ "کہانیاں شروع نہیں ہوتیں بلکہ پودوں کی طرح اُگتی ہیں"۔

اسی طرح عام فہم زبان میں سعید حسن کی کہانی اُس وقت سے شروع ہوئی جب وہ اپنے والد اور والدہ کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ خادمہ نے آکر کہا:۔

"چھوٹے میاں دروازے پر ایک آدمی آپ کو بلاتا ہے"۔

سعید حسن نے پوچھا "کون ہے؟"

خادمہ نے جواب دیا "فقیر سا معلوم ہوتا ہے اور نام نہیں بتاتا آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

سعید حسن نے خادمہ سے کہا "پوچھو تو سہی کیا چاہتا ہے"۔

خادمہ نے دروازے پر جا کر قدرے نخوت کے انداز میں تیوری چڑھا کر پوچھا "وہ کہتے ہیں کیا کام ہے؟"

اس آدمی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت ٹوکری تھی جس کے ڈھکنے پر پیازی رنگ کا فیتہ بندھا ہوا تھا۔ وہ ٹوکری کو اُٹھا کر اپنے منہ کے قریب لے آیا اور اسکے چھیدوں میں سے دیکھ کر کہنے لگا "بلی ہے"۔

خادمہ نے پوچھا "سعید میاں کے لیۓ؟ کسنے بھیجی ہے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ سامنے سڑک پر سے ایک بند گاڑی جارہی تھی، اسمیں سے ایک دایا نے دروازہ کھول کر مجھے بلایا۔ ایک چونی دی اور اس مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ ٹوکری سعید حسن صاحب کو جو اس مکان میں رہتے ہیں دے آؤ"۔

خادمہ نے کہا "اچھا تو ٹھہرو میں انہیں بلاتی ہوں" اور کھانے کے کمرے میں جا کر کہنے لگی "چھوٹے میاں وہ کہتا ہے کہ آپ کے لیۓ کسی نے بلی بھیجی ہے"۔

سعید حسن نے حیران ہو کر کہا "بلی؟ میں نے تو کوئی بلی نہیں منگائی تھی"۔

خادمہ نے جواب دیا "نہیں صاحب وہ کہتا ہے کہ ایک زنانہ گاڑی میں سے کسی نے اُسے پیسے دیکر بلی آپ کو پہونچا دینے کے لیۓ بھیجا ہے"۔

سعید حسن کی والدہ مسکرائی "خوب!" اور سعید حسن کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں۔

اسکی والدہ نے خادمہ سے کہا "بلی کو اندر لے آؤ"۔

سعید حسن نے بھی دبی زبان سے کہا "اس آدمی سے کہنا کہ ٹھہرے"۔ اُسے خواب وخیال بھی نہ تھا کہ کوئی عورت یا لڑکی اُسے بلی یا کوئی اور تحفہ بھیج سکتی تھی، کیونکہ وہ ان کے احاطہ اثر سے بھی کوسوں دور تھا۔

خادمہ ٹوکری اندر لے آئی اور اسمیں سے ایک ہلکی باریک غم زدہ سی "میاؤں" کی آواز آئی سعید حسن نے اُٹھکر ٹوکری لے لی اور اسے میز پر رکھ کر کھول دیا، اسمیں سے

ایک بڑی بڑی آنکھوں والا چھوٹا سا ایرانی بلّی کا سفید بچہ نکل کر باہر آگیا، جو بمشکل ایک مہینے کا ہوگا۔ جہاں تک سعید حسن کو بلیوں کے متعلق واقفیت تھی وہ کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ نہایت اعلیٰ اور کمیاب نسل کا تھا۔

سعید حسن کی والدہ نے کہا "اسے دودھ پلائیں" اور ایک پرچ میں دودھ ڈالکر اسکے آگے رکھ دیا۔ سعید حسن نے کمرے سے باہر آکر اس آدمی سے پوچھا۔

"یہ بلّی کا بچہ تمہیں کس نے دیا تھا؟"

"ایک زنانہ بند گاڑی وہاں کھڑی تھی" اور اسنے سڑک کی طرف اشارہ کیا "اسمیں سے ایک نرس نے سر نکال کر مجھے بلایا اور یہ ٹوکری دیکر مجھ سے کہا کہ آپ کو پہنچا دوں جب میں نے آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو گاڑی چلی گئی"

سعید حسن نے پوچھا "نرس؟"

آدمی نے جواب دیا "ہاں ہاں نرس جو ہسپتال کی طرح کی وردی پہنے ہوئے تھی۔ اور گاڑی میں کوئی اور بھی تھا غالبًا پردہ دار عورت ہوگی کیونکہ وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتی تھیں، اور نرس نے بہت تھوڑا دروازہ کھول کر مجھ سے گفتگو کی تھی۔"

"تو لو یہ تمہارا انعام ہے" سعید حسن نے ایک اور چونی اسے دیدی، اور جب وہ چلا گیا تو کھانے کے کمرے کی طرف واپس آیا۔ آتے ہی اسکی والدہ نے کہا:-

"ٹوکری میں کچھ اور بھی تھا سعید"

"کیا؟"

اسکی والدہ نے ایک سادہ کارڈ اسکے ہاتھ میں دیدیا جسپر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:-

"اس نوجوان کے لئے جسے بلیوں سے پیار ہے"

"لانے والے سے کچھ پتہ ملا؟" اسکے ابا نے پوچھا "کیا اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟"

"نہیں۔"

سعید حسن کہنے لگا "اس بچے کا نام عطیہ ہونا چاہئے کیونکہ ہے بھی تو عطیہ ہی۔"

وہ ایک تیئیس سالہ نوجوان تھا۔ نہ بہت حسین اور نہ بدصورت بلکہ جسطرح ایک ذی شعور اوسط درجے کے نوجوان ہوا کرتے ہیں وہ بھی تھا گریجویٹ ہوجانے پر بھی کالج کی زندگی اسکے اطوار کو بگاڑ دینے میں کامیاب ثابت نہ ہوئی تھی اور چونکہ وہ ولایت نہیں گیا تھا اسلئے صنف لطیف سے زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اب بھی جب کبھی اسکے والدین اسکی شادی کا تذکرہ چھیڑتے تو اسکی پیشانی عرق آلود ہوجاتی، اور وہ آنکھیں نیچی کرکے کہا کرتا "فی الحال اسکی کیا ضرورت ہے۔"

ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ اسے پالتو جانوروں، خصوصًا بلیوں سے بہت انس تھا۔ جب کبھی بازار میں کچھ خریدنے جاتا اور وہاں کسی دوکان پر بلّی بیٹھی ہوئی نظر آتی تو اور سب کام بھول کر وہ اسے گود میں لے لیتا اور پیار کرنے لگ جاتا، راستہ میں چار پانچ بلیوں سے اس نے دوستانہ تعلقات پیدا کر رکھے تھے اسلئے روز دفتر جاتے وقت ایک دو منٹ

ہر ایک کے پاس ٹھہر کر اسے پیار کرتا اور اسکے کان میں میٹھی میٹھی باتیں کہتا۔ کبھی کبھی ان کے لیے گھر سے کوئی لذیذ چیز جیب میں ڈال کر لے جایا کرتا۔ اور وہ بھی اپنے مالک یا مالکہ سے چھٹی لیکر صبح نو بجے کے قریب اپنے مکان کے احاطہ کی دیوار پر یا پھاٹک کے سامنے بیٹھ کر چشم براہ رہتیں کہ ابھی ہمارا چاہنے والا اس راستے سے گزریگا۔

عطیہ نے دودھ ختم کرکے سب کی طرف دیکھا۔ پھر سعید کی طرف آئی اور اُس کے شانے پر سوار ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے مالک کی آنکھیں کسی دور کی چیز کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں، وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہوگا جس نے اُسے یہ تحفہ بھیجا تھا، اسے محبت یعنی صحیح معنوں میں محبت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا لیکن اسوقت اس کے دل میں ایک عجیب سی محسوس ہو رہی تھی، اسے خیال آرہا تھا کہ کسی اجنبی ہستی نے اسکی طرف پیار کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوگئی تھی کیونکہ جوانی میں اور کوئی شے اس خیال سے زیادہ دل کی حرکت کو بے ترتیب کردینے والی نہیں ہوتی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور گھر کے افراد بھول گئے کہ عطیہ کسطرح ان کے پاس آئی تھی، لیکن سعید نہیں بھولا، اکثر جب وہ تھکا ماندہ دفتر سے گھر آتا اور عطیہ فرش پر لُڑکتی ہوتی یا کسی مکھی کے تعاقب میں بھاگتی، یا اپنی دُم پکڑنے کی کوشش میں اپنے ہی گرد گھومتی۔ یا جب وہ بلاتا تو اسکی گود میں اچھل کر آ بیٹھتی اور لپٹ لپٹا کر غرغر کرنے لگتی تو وہ اس سے پوچھا کرتا "عطیہ تو کس کا عطیہ ہے؟ وہ کون ہے؟"

وہ خیالی حسینہ اسکے دماغ میں سیکڑوں شکلیں اختیار کرتی اور کبھی کبھی خواب میں بھی آجاتی لیکن جب عطیہ کو آئے ہوئے دو مہینے گزر گئے تو بتدریج وہ تصویر مدھم ہونا شروع ہوگئی تاہم وہ بدستور دفتر کے راستے میں بلیوں سے ملتا رہتا تھا، انہیں سے ایک بلا عطیہ کا نزدیکی رشتہ دار بھی تھا، جو اپنے لمبے لمبے نیلگوں، سیاہ بالوں کو سنوار کر اور بڑی بڑی زرد آنکھوں سے "چشم براہ انتظار" دیوار پر بیٹھا رہتا اور جب سعید آتا تو اپنی پشت کو محراب کی طرح بنائے ہوئے غرا کر اس سے اپنے حسن کی داد لیا کرتا۔ سعید نے اس کا نام سہراب رکھا تھا۔ اور جب وہ اس حسن خداداد کے زندہ بت کے سامنے اپنی نذر تحسین پیش کرکے دفتر کی طرف چلا جاتا تو اس بت کی "خادمہ، یا دوسرے الفاظ میں "مالکہ" اسے بلا کر اُن بالوں میں جنھیں سعید کے مضبوط ہاتھ چھو لیتے اپنا خوبصورت لیکن زرد چہرہ چھپا لیا کرتی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا اور عطیہ میں وہ شاہانہ وقار پیدا ہونا شروع ہوگیا جو اسے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا تھا۔ سعید حسن مکان میں اکیلا تھا کیونکہ اس کے والدین پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ ایک ناول جسمیں بقول ایک مصنف کے "حسن و عشق کی نیرنگیاں" دکھائی گئی تھیں فرش پر اوندھا پڑا تھا اور سعید سگرٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر

ان کی طرف ٹکٹکی لگائے خواب بیداری کے مزے لے رہا تھا وہ حیران تھا کہ کیوں بعض لوگوں کو زندگی میں عجیب و غریب واقعات کا سامنا ہوتا ہے اور دوسروں کو باوجود خواہش کے کوئی واقعہ پیش نہیں آتا۔ وہ بھول گیا تھا کہ عطیہ کا آنا ایک عجیب واقعہ تھا، اور اگر اسکے بھیجنے والے کی تلاش کیجاتی تو ممکن تھا کہ عجیب تر ثابت ہوتا۔۔۔۔۔۔ لیکن شاید یہ بھی ہو کہ عجیب واقعات تلاش کرنے سے نہیں ملتے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عطیہ اچھل کر میز پر جہاں گھنٹی بج رہی تھی جا بیٹھی، سعید حسن نے جماہی لی اور آلہ کو اٹھا کر کان سے لگالیا۔

اس آلہ پر جسے لوگ بغیر کسی قسم کے احساس کے بے پروائی سے استعمال کرتے ہیں عام طور پر آوازیں کرخت اور بے سُری معلوم ہوتی ہیں، گویا بولنے والے کی روح میں سفر کی طاقت نہیں ہے لیکن بعض آوازیں دلی جذبات کی کیفیتوں سے پُر ہوتی ہیں۔ آواز اسی دوسری قسم کی تھی۔ اسمیں حسن و نزاکت کا اظہار پایا جاتا تھا۔

آواز نے پوچھا "کیا آپ سعید حسن ہیں؟"

"ہاں" سعید حسن نے جواب دیا "آپ کون ہیں؟"

"صبر کیجئے صاحب" آواز نے کہا۔ اور اسمیں ایک ہلکا شرارت آمیز ہنسی کا سا اثر تھا "بیشتر اس سے کہ میں آپ کو اس کا یا کسی اور بات کا جواب دوں آپ یہ بتائیں کہ کسی ضروری کام میں مشغول تو نہیں ہیں اور کیا آپ کے پاس ایک

——— روح سے گفتگو کرنے کے لیئے وقت ہے؟"

اسے احساس ہوا کہ یہ کسی عجیب واقعہ کا آغاز ہے اسلیئے وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا، اور ٹیلیفون کے آلہ کو اپنے منہ کے قریب رکھ کر بولا "نہیں مجھے بالکل فراغت ہے۔ تاہم ———"

بہانے بنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں تو میں کہنا شروع کروں، کیا آپ بیٹھ گئے ہیں؟"

سعید نے کہا "ہاں بیٹھ گیا ہوں۔ اب بتائیے کہ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا بات کرنا ہے؟"

آواز نے کہا "میں ——— میں ایک لڑکی ہوں"

"یہ تو مجھے آپ کی آواز بتا رہی ہے"

"غالباً ناخوش آیند تو نہ ہوگی؟ ——— آپ کی آواز میں بھی استقلال اور مہربانی کا اظہار پایا جاتا ہے، لیکن اب میں آپ سے ایک عجیب سوال کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ شریف اور بالکل قابل اعتماد ہیں؟"

سعید حسن نے کہا "غالباً ہوں تو سہی"۔

"اچھا تو شریف اور قابل اعتماد صاحب کیا آپ مجھ سے ایک وعدہ کرینگے؟"

سعید حسن نے پوچھا "کیسا وعدہ؟"

"آپ دوراندیش بھی ہیں؟ خوب! لیکن میں آپ سے کسی کام کے کرنے کا وعدہ نہیں چاہتی۔ میں صرف یہ وعدہ چاہتی ہوں کہ آپ کچھ نہ کرینگے"۔

"مجھے منظور ہے"۔

"تو آپ "باستت" کی قسم کھائیے کہ آپ یہ دریافت کرنے کی کوشش نہ کرینگے کہ میں کون ہوں"

سعید حسن نے حیران ہوکر پوچھا "باستت کون ؟"

"ہو باستت یعنی مصری بیقاہ کی بیوی۔ بلیوں کی دیوی۔ کیا اسکی قسم کھاتے ہو؟"

"ہاں قسم کھاتا ہوں۔ لیکن ——— مجھے دریافت کرنے کا اشتیاق ضرور ہے"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کو اشتیاق ہے لیکن ہماری دیوی کی قسم کھانے کے بعد آپ اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ نے قسم کو توڑ دیا تو تمام شہر کی بلیاں جمع ہوکر آپ کو نوچ لینگی۔ کیا اس خیال سے آپ کو خوف نہیں آتا ؟"

سعید حسن نے کہا "بیشک خوف آتا ہے۔ لیکن کیا یہ پوچھنا بھی ناجائز ہوگا کہ آپ کو کیونکر علم ہے کہ اس دیوی کا نام مجھ پر موثر ثابت ہوگا ؟"

آواز نے پوچھا "تو کیا آپ وہ نوجوان نہیں ہیں جسے بلیوں سے پیار ہے ؟"

"تو کیا عطیہ کے لئے مجھے آپ کا ممنون ہونا چاہیئے ؟"

"خوب۔ اے ہیو باستت کے پرستار صاحب آپ کو بلیوں کا نام رکھنا خوب آتا ہے۔ کیا عطیہ خوبصورت ہے ؟"

سعید حسن نے جواب دیا "اب تو وہ اور بھی خوبصورت ہوگئی ہے۔ وہ ہماری باتیں سن رہی ہے اور نہایت سمجھدار اور عقلمند ہے"

آواز نے کہا "میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو پسند ہے لیکن اب اے مہربان اور قابل اعتماد صاحب مجھے آپکا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے، میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کہہ سکتی"

"تو کہہ ڈالیئے نا"

"جب کبھی رات کے وقت میری طبیعت چاہے کیا میں آپ سے باتیں کرلیا کروں ؟"

سعید حسن نے کہا "بڑی خوشی سے"

"میں زیادہ مدت تک آپ کی سمع خراشی نہیں کرونگی اب غالباً بہت تھوڑا حصہ باقی ہے۔ پھر میں چلی جاؤنگی" آواز میں غمگینی کی جھلک تھی۔

اس نے پوچھا "آپ کہاں جارہی ہیں ؟"

اس نے جواب دیا "مجھے خود علم نہیں"

سعید حسن کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن وہ خوش تھا کہ کسی نے دیکھا نہیں۔

"مجھے معلوم نہیں۔ لیکن بعض وقت انسان کا دل کسی سے بات کرنے کو خواہ مخواہ چاہتا ہے۔ اے مہربان آواز کیا آپ اکیلی ہیں ؟"

مہربان آواز نے غمزدہ لہجہ میں جواب دیا "بیشک۔ سوائے آپ کے میں بالکل تنہا ہوں۔ ورنہ آپ سے باتیں کسطرح کرسکتی۔ آپ براہ عنایت کسی سے نہ کہیں کہ میں آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں۔ یہ ہمارا باہمی راز ہونا چاہیئے"

سعید حسن نے کہا "میں کسی سے نہ کہونگا۔ تاہم آپ کو مجھ سے باتیں کرنے کی کیوں خواہش ہے، کیا ہم نے ایک دوسرے کو کہیں دیکھا ہے؟"

اس کے کان میں ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی "کیا معلوم؟ شاید صدیاں گذریں ہیوپاسستس کے مندر میں دیکھا ہوگا، لیکن کیا میرا اسطرح آپ سے باتیں کرنا کا خیال عجیب نہیں ہے۔ کسی وقت بعض لوگ تنہائی سے اسقدر گھبرا جاتے ہیں کہ اگر یہ آلہ گفتگو انکی مدد کرے تو کوئی عیب کی بات نہیں۔ کیا آپ نے اس لڑکی کی کہانی سُنی ہے جس نے تنہائی سے عاجز ہو کر ایک شخص کو جسے وہ چاہتی تھی کئی محبت نامے لکھے لیکن اسے یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ وہ کون ہے جب تک کہ اس جہان سے سفر نہ کر گئی۔"

"میں نے نہیں سُنی" سعید حسن نے کہا "لیکن کیا آپ تنہائی سے عاجز ہیں؟"

"بیشک"

"تو آپ کو میرا ہی خیال کیوں آیا؟"

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی، اگر اے مہربان اور قابل اعتماد صاحب، آپ خود نہیں سمجھ سکتے۔"

اسکے بعد ٹیلیفون کا تعلق علیحدہ کر دیا گیا اور سعید حسن گویا کسی نہایت دلخوش کن خواب کے درمیان بیدار ہو گیا۔

رات کے نو بجے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ سعید حسن کا تمام دن ایک عجیب قسم کی بیقراری میں گزرا تھا، شام کا کھانا کھا کر وہ نشست کے کمرے میں ٹیلیفون کے پاس ایک ناول ہاتھ میں لیکر بیٹھ گیا تھا، اور گو اس واقعہ کو ایک گھنٹہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا کتاب کا وہی صفحہ اسکے پیش نظر تھا، وہ اسے بار بار شروع سے اخیر تک پڑھ چکا تھا لیکن چونکہ اس کے دماغ میں ناول کے واقعات کے ساتھ بلبلوں اور ٹیلیفونوں کی گھنٹیاں اور نرم و نازک غمگین سی آواز کے ساتھ کسی خیالی حسینہ کی ہنکڑوں مختلف تصاویر پھر رہی تھیں اسے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

وہ گھنٹی کی آواز سے چونکا، اور ٹیلیفون کی طرف جھپٹا۔ آلہ کو کان سے لگانے پر اسی میٹھی میٹھی آواز نے یہ سوال کیا

"کیا آپ خود ہی ہیں؟"

"بیشک میں ہی ہوں۔"

"آپ کیا کر رہے تھے؟"

"انتظار"

"کس کا؟"

"آپ جانتی ہیں کس کا"

"خوب! آپ کیا جانیں کہ میں کون ہوں آپ کے پڑوس کے مکان میں ہوں یا دو میل کے فاصلے پر، حد درجہ خوبصورت ہوں یا نہایت بدصورت، تار گھر کی ملازمہ ہوں یا کسی شاندار محل میں رہنے والی مالدار دوشیزہ۔ کسی کے گھر کی نوعمر خادمہ

ہوں یا کوئی ستر سالہ کنواری خاتون، غرض یہ کہ آپ کیونکر علم ہے کہ میں کوئی خوش طبع شہر لڑکی یا کوئی زنانہ حقوق کے بزور شمشیر طلب کرنے والی آزاد خیال عورت ہوں؟"

سعید حسن نے کہا" مجھے یقین ہے کہ آپ عجیب ہیں اور بے حد خوش مذاق"

آواز نے جواب دیا" ہاں میں بے حد خوش مذاق ہوں اور پرلے درجے کی حسین بھی، میں آپ کا دل چرا لونگی اور ہر روز رات کے وقت آپ سے گفتگو کیا کرونگی"

سعید نے پوچھا" آپ کون ہیں۔ خدا کے لیئے بتایئے کیا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ممکن بھی ہے غیر ممکن بھی۔ میں نے تو آپ کو ضرور دیکھا ہے۔ کم از کم آپ نے ایک ایسی ہستی کو کئی بار دیکھا ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی آپ کی نسبت کم"

"تو۔۔۔۔۔ تو کیا آپ مجھے چاہتی ہیں؟"

"بیشک۔ اے بالکل قابل اعتماد صاحب ورنہ میں آپ سے ہمکلام کیوں ہوتی۔ میں ضرور آپ کو چاہتی ہوں اور کئی مہینے سے۔ اسوقت سے بھی قبل جب کسی نے آپکو وہ ایرانی تحفہ بھیجا تھا۔ کیا آپ کو یہ سنکر خوشی ہوئی ہے یا افسوس؟"

"میں۔۔۔۔۔ میں کہہ نہیں سکتا" سعید حسن نے کہا" معاملہ بھی تو عجیب ہے"

"یہی تو وجہ ہے کہ مجھے اسمیں لطف آتا ہے" آواز نے کہا۔ سعید حسن کو ایسا معلوم ہورہا تھا گویا وہ دونوں اندھیرے میں کسی خفیہ جگہ بیٹھے ہیں اور وہ اس سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی ہے "ہم عورتوں کو کبھی موقع نہیں ملتا کہ بغیر بے حیا کہلانے کسی سے پہلے اپنی محبت کا اظہار کریں باوجودیکہ بعض اوقات ہمارے دل محبت سے بھرے ہوئے اور اظہار کے لیئے اسقدر بیتاب ہوتے ہیں کہ برداشت کرنا محال ہوتا ہے۔ کیا اے مہربان صاحب آپ کو میری باتوں میں بڑھاپے کی عقلمندی اور تجربہ کار بے شرمی کی بو نہیں آتی؟"

سعید حسن کے دل میں ایک فوری خوف سا پیدا ہوا۔

"اگر آپ ایسی باتیں کرتی رہیں تو غالباً آپ کو ملنے سے مجھے ہمیشہ کے لیئے مایوس ہو جانا پڑیگا"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ ــــ"

"ــــ اتنی سمجھدار ہیں؟"

"بیشک" سعید حسن کو ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی اسنے پوچھا:۔

"آپ ہنستی کیوں ہیں؟"

"کیونکہ اب آپ پہلے کی نسبت زیادہ عقلمند معلوم ہونے لگے ہیں۔ اچھا تو یہ بتایئے کہ آج تک آپ نے کبھی کسی لڑکی کو چاہت کی نگاہ سے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ عملی طور سے نہیں۔ خیالات میں ضرور کبھی کبھی"

"اچھا تو پھر آپ مجھے چاہیں نا! اور اس لطف سے بہرہ اندوز ہولیں۔ چلے جانے سے پہلے میرے لیۓ یہ ایک بڑی بات ہوگی اور میں اس آڑ گفتگو پر جس نے مجھے ایسی طاقت دی ہے جو کبھی کسی لڑکی کو نصیب نہیں ہوئی پھولوں کے ہار چڑھایا کرونگی۔ غالبًا میں دنیا میں پہلی لڑکی ہوں جسنے اسطرح باتیں کی ہیں۔ اچھا تو اب آپ کہہ دیں نا کہ آپ مجھے چاہتے ہیں"

سعید حسن نے کہا "آپ واقعی عجیب غریب ہیں۔ لیکن یہ میں کسطرح کہہ سکتا ہوں"

"نامہربان اور ظالم صاحب کہنے میں کیا حرج ہے۔ آپ نے اب تک محبت کا ذائقہ نہیں چکھا۔ محبت آپکے دل میں ضرور ہے گو خفتہ ہے۔ آپ کو مجھ سے نفرت تو نہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ کو یہ خیال کسطرح آیا، کاش میں آپ کو دیکھ سکتا۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"جو آپ رکھ لیں"

"جو میں رکھ لوں؟ تو گویا یہ بھی آپ نہیں بتائینگی؟"

"آجکل ہر قسم کے اُلٹے سیدھے بے معنی اور بے معنی نام رکھنے کا دستور ہے، آپ بھی کوئی گز بھر لمبا نام تجویز کرلیں۔ امت البسم الله الرحمٰن الرحیم کی بابت آپکا کیا خیال ہے؟"

"نہیں نہیں"

"تو بیچاری ہی کافی ہوگا۔ ہے بھی حسب حال" لہجہ تبدیل ہوگیا تھا اب اسمیں مغمومیت کا اثر تھا۔

"نہیں میں آپ کو "نادیدہ خانم" کہا کرونگا۔ لیکن ایک بات میں ضرور پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ علیل ہیں؟"

"ہاں لوگ کہتے تو یہی ہیں۔ لیکن..... کسی دن ...... مجھے صحت ہوجاویگی" اسنے ٹھنڈی سانس بھری۔

اسکی آواز میں حد درجے کا اندوہ بھرا ہوا تھا اور سعید حسن اسے محسوس کر رہا تھا، آواز پھر آئی "کوئی آرہا ہے آپ کو بھی نیند آرہی ہوگی، اسلیۓ اب ہمدرد لیکن ضرورت سے زیادہ مستقل مزاج صاحب کل رات تک۔ خدا حافظ"

سعید حسن کو امید تھی کہ اسے خواب میں دیکھے گا لیکن یہ امید بر نہ آئی۔ شاید اسکے خواب دن اور عالم بیداری کے لیۓ مخصوص تھے، وہ ہر وقت سوچتا تھا اور حیران تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اسکی عمر کیا ہے صورت کیسی ہے؟ اسے خیال آیا کہ ابکی دفعہ اس سے یہ پوچھے کہ اسکی بلی کس قسم کی تھی، اور اس روز راستے میں جتنی بلیاں ملیں انہیں بڑے غور سے دیکھتا رہا، لیکن جب رات آئی اور سلسلۂ کلام شروع ہوا تو مایوسی ہوئی کیونکہ جب عطیہ کا ذکر چھڑنے پر اسنے سوال کیا کہ آپ کی بلی کس قسم کی ہے تو جواب ملا کہ اسکی چار ٹانگیں ہیں۔ دو زرد آنکھیں ہیں۔ ایک دُم ہے، بدن پر بال ہیں اور پیار کرنے پر غُرغُر کرتی ہے" اسکے بعد قہقہہ کی آواز آئی۔

"اسکا مطلب تو فقط یہی ہے کہ وہ بلی ہے اور بس!"

"چونکہ میں خفیہ ہوں میری بلی بھی خفیہ ہونی چاہیئے تاکہ جب میں .... خاک ہو جاؤں اور ....

..... آپکی شادی ہو جائے تو آپ مجھے پیار سے یاد کریں اُن دنوں میں جب آپ اُداس ہوں اور آپکی بیوی آپکی اُداسی دور کرنے میں ناکامیاب رہے تو میری یاد بہارے برقی نامہ بر ٹیلیفون کے خیال کے ساتھ آکر تمہیں پھر اسی طلسمی اندھیرے میں ملا دے .... وہ وقت ہو گا کہ میری خاک کے ذرے ستاروں کی طرح چمکنے لگیں گے۔"

"آپکی خاک؟ آپ کی خاک کیوں؟ کیا آپ اسقدر علیل ہیں؟"

"ہاں۔ سب لوگ اب یہی کہتے ہیں۔ گو زبان سے نہیں بلکہ حسرت بھری نگاہوں سے"

"تو کیا آپ قریب الموت ہیں؟"

"آپ زرد کیوں ہوگئے؟ ہاں۔ بیشک میرا آئینہ یہی کہتا ہے"

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک بار! صرف ایک بار!"

"اسکا وقت گزر چکا ہے۔ ...... یعنے جب میں حسین تھی .... میں چاہتی ہوں کہ آپ اس صورت ہی کو یاد رکھیں جو آپ کے دل میں ہے کیونکہ اگر اب کبھی میں حسین ہو سکتی ہوں تو صرف اس دل میں جسمیں میری محبت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔"

"میں واقعی آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ کیا آپ کی زندگی کی کوئی امید نہیں ہے؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس آخری وقت میں جب میں قریباً خاک ہو چکی ہوں میں آپ سے گفتگو کر سکی، کیونکہ میری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کوئی دل میرے لیئے بیقرار ہو۔ اور کوئی چہرہ ایسا بھی ہو جسپر میرا خیال آنے سے سرخی آجائے۔"

سعید حسن نے کہا "میں اب محسوس کرنے لگا ہوں کہ مجھے آپ سے بہت محبت ہو گئی ہے"

آواز نے جواب دیا "مضمحل نہ ہو۔ گو میں نے کسی جادوگر کی طرح آپ کو درد دل میں مبتلا کر دیا ہے تاہم اس خیال سے آپ کو مسرت ہونی چاہیئے کہ آپ کو کسی نے دل سے چاہا ہے"

اس شب کو اور کوئی گفتگو نہ ہوئی پھر بھی سعید حسن جانتا تھا کہ وہ اس آواز کو شاعری کی زبان میں دل دے چکا ہے تمام دن جہاں کہیں بھی ہوتا وہ آواز اسکے کانوں میں رہتی اور وہ بڑی بے صبری سے رات کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اسکے احباب اسکی حالت دیکھکر حیران تھے لیکن ایک دوست جو غالباً سب سے زیادہ سمجھدار تھا کہا کرتا تھا کہ سعید عبادت کرنے لگ گیا ہے۔ اور وہ سچ کہتا تھا کیونکہ عبادت محبت نہیں تو محبت عبادت ضرور ہے۔

یہ برقی ملاقات کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور رفتہ رفتہ سعید کے زرد چہرے پر رونق آنے لگی۔ اسکے تیمارداروں کو

کو خیال ہوا کہ شاید وہ رو بصحت ہے اور ان کے دلوں میں امید پیدا ہو گئی لیکن وہ خود مایوس تھی۔ وہ اپنی قسمت اور دلیری کی شکر گزار تھی جنہوں نے اس محبت کے حصول کو ممکن بنا دیا جسے وہ اپنی زندگی کی تکمیل اور عمر کی پہلی اور آخری پیداوار تصور کرتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ صرف اسی کے لیئے دنیا میں آئی تھی، وہ اس بات سے خوش تھی کہ جب وہ نہ ہو گی تو کسی کے دل میں اسکی یاد باقی ہو گی، کیونکہ کسی شے کی یادگار باقی رہنا گویا اسکا غیر فانی ہونا ہے۔

ایک روز ڈاک میں سعید حسن کو ایک پارسل ملا جسمیں ایک چھوٹی سی رنگین تصویر تھی، اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چنگاریاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں سیاہ بال تھے اور تمام صورت نہایت دلفریب تھی، اسے فوراً اپنی ٹیلیفون والی ساحرہ کا خیال آیا اور اسکے منہ سے نکلا "یہ وہی ہے"، لیکن تصویر اگر اسی کی تھی تو کچھ عرصہ پہلے کی بنی ہوئی تھی کیونکہ اسمیں علالت کا کوئی نشان چہرے پر نہ پایا جاتا تھا، رنگت صاف سرخ و سپید تھی اور چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر چنبیلی سی شوخی بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی ایک خاص قسم کی شیرینی آمیز مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔

اس نے وہ تصویر کسی کو نہ دکھائی۔ بازار سے ایک طلائی لاکٹ خرید کر اسے چھاتی پر اپنے دل کے قریب آویزاں کر لیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

آخرکار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور سعید حسن نے پوچھا:۔

"کیا تم ہی ہو؟"

"ہاں میں ہی ہوں"

"آپ نے جو چیز بھیجی تھی مجھے مل گئی"

"کیا چیز؟"

"وہی ننھی سی دلفریب تصویر"

"کسی قابل نفرت لڑکی نے جسے آپ سے محبت ہے آپ کو اپنی تصویر بھیجدی ہو گی اسے جلا دو"

"آپکی تصویر ہے۔ میں جانتا ہوں"

"میں کسی بات کا اقبال نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہوں یہ سچ ہے کہ مجھے آپ سے الفت ہے، لیکن میں محض ایک آواز ہوں اور آواز بغیر شخصیت کے ایک خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ کیا وہ بے تمیز لڑکی جسنے اپنی تصویر آپ کو بھیجی ہے حسین ہے؟"

"بے حد"

"تو مجھے اس سے نفرت ہے، شاید کسی گزشتہ زمانہ میں میں بھی ویسی تھی، لیکن اب آپ اسے ایکطرف رکھ دیں اور میری بات سنیں"

"میں ہمہ تن گوش ہوں"

"آج ایک اور ڈاکٹر میرے معالج کے ساتھ آیا تھا..."

"اسنے کیا کہا۔ کچھ امید دلائی؟"

"بہت کم۔ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اسکی بھویں ملتی رہیں۔ میں جانتی تھی کہ سوچ رہا ہے وہ

عجیب سا آدمی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یک لخت اسنے کوئی ایسی بات کہی کہ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر وہ چپ ہو کر سوچنے لگ گیا اور اس کے بعد مجھ سے کہنے لگا کہ تم بہت حوصلہ مند ہو۔ اسکی شکل نپولین کی تصویر سے ملتی تھی"

"اسنے کچھ کہا بھی؟"

"اسنے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں۔ ایک یہودی لڑکے کی کہانی سنائی جو بہت علیل اور بمشکل چھ سال کا تھا، اسکے باپ نے اس سے کہا کہ اگر تم جلدی تندرست ہونے کی کوشش کروگے تو میں تمہیں بہت سے روپے انعام دونگا۔ لڑکے نے آنکھیں کھولے بغیر فوراً سوال کیا "کتنے؟"۔ مجھے فقط یہی بات رہ گئی ہے، کیونکہ اس کے بعد نپولین کہنے لگا کہ اب ہمیں باتیں چھوڑ کر کچھ کرنے کا خیال ہونا چاہیئے۔"

"کیا؟ خدا کے لیئے بتاؤ کیا؟"

وہ کہتا تھا کہ مجھے بیمار رہنے کی سزا ملنی چاہیئے بیمار ہونا اور تندرست ہونے کی کوشش نہ کرنا بہت بری بات ہے اور اسکی یاد داشت میں وہ مجھے..... اور تو میں کچھ نہیں جانتی فقط اتنا میری سمجھ میں آیا کہ اسمیں کلوروفارم اور نشتروں اور اوزاروں کا ذکر تھا اسکے بعد ڈاکٹر نے اپنی ٹھوڑی کو ٹٹولا اور کہنے لگا کہ تم تندرست ہوجاؤگی۔"

"اللہ تعالے کا شکر ہے۔ اس ڈاکٹر کا نام کیا ہے؟"

"نپولین۔ میں اسے یہی کہہ کر بلاتی ہوں اور آپکی تسلی کے لیئے بھی اتنا ہی نام کافی ہونا چاہیئے ورنہ مجھے خوف ہے کہ آپ اپنی قسم کو توڑنے کی فکر شروع کردینگے۔"

"خیر کوئی بھی ہو، ایک بار آپ تندرست ہولیں، مجھے ایک ایک کرکے ان تمام باتوں کی آپ کو سزا دینا ہوگی"

"تو آپ کو میری صحت کا یقین بھی ہوگیا کیا؟ اتنے خوش نہ ہو جایئے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور ڈاکٹر سے بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ یہ اسکی آخری کوشش ہے، اور پھر بھی بہت کم امید ہے۔"

"نہیں، نہیں آپ یہ نہ کہیں۔ اور یہ عمل کب ہوگا؟"

"کل صبح دس بجے۔ اب میری نرس آرہی ہے، صبح آٹھ بجے کیا آپ مکان ہی پر ہونگے؟ اسوقت میں خدا حافظ کہونگی۔"

"ضرور۔ میں آپکی آواز کا انتظار کرونگا"

سعید حسن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور اسکی آواز افسردہ تھی۔ بستر پر وہ گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہا آخر جب نیند آئی تو اسے اپنی نامعلوم معشوقہ کی قبر دکھائی دی جسکے سرہانے بیٹھ کر اسنے دل کھول کر آنسو بہائے۔

صبح آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی

"خدا حافظ"

سعید حسن نے کہا "تم بڑی ظالم ہو"

"میں ظالم؟ کیونکر؟"

"میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا۔ کچھ کر نہیں سکتا اس طرح باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے، خدا کے لیے مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں آپ کے والدین سے اجازت لے لونگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہ کرینگے۔"

"واہ کیا کہتے! آپ میرے اتنی محنت سے بنائے ہوئے طلسم کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اگر مجھے صحت ہو گئی تو انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ اور اگر نہیں تو مجھے آپ اس لڑکی کی شکل میں یاد رکھیں جسکی تصویر آپ کے پاس ہے، اور جو آپ کو دل سے چاہتی ہے، جب اور سب لوگ مجھے بھول جائیں گے تو آپ کے دل میں میری یاد باقی ہوگی۔ میرے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے۔"

"آپ کی یاد اب کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے علم کسطرح ہوگا؟ اب غالباً کئی دن تک مجھ سے گفتگو نہ کر سکیں گی۔"

لڑکی نے آہ بھر کر جواب دیا "ہاں کئی دن تک لیکن میں نے دو خط لکھ کر ایک جگہ رکھ دیے ہیں جنمیں سے ایک آپ کے نام ہے، اگر میں شہر خموشاں کو سفر کر گئی، تو وہ آپ کو مل جائیگا۔ میں بالکل خوش ہوں اور موت کے نام سے مجھے بالکل خوف نہیں آتا۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ مجھے چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو ہمیشہ چاہونگا۔"

"اچھا تو اب آپ اس تصویر سے جو آپ کے پاس ہے باتیں کریں۔ اور میرے لیے دعا۔ خدا حافظ"

"خدا حافظ" سعید حسن کا گلا گھٹا جا رہا تھا اور آواز بمشکل نکلتی تھی۔

اس روز دفتر سے واپس آتے وقت وہ راستے کے ہر ایک مکان کی طرف بغور دیکھتا تھا، کہ کہیں کسی کے جنازے کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔ لیکن اسے کوئی ایسا مکان نہ ملا اور اس بات سے اسکے دل کو قدرے راحت محسوس ہوئی گو رات میں وہ وحشت انگیز خواب ہی دیکھتا رہا اور بار بار اس خیال سے چونک پڑا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن جب بیدار ہوتا تو سناٹا نظر آتا۔

دوسرے دن وہ راستہ میں سہراب کو پیار کر رہا تھا کہ یک لخت اسے معلوم ہو گیا کہ وہ بلی "نادیدہ خانم" کی تھی کیونکہ اسکے بالوں میں سے ہسپتال کی سی بو آ رہی تھی غالباً وہ اپنی مالکہ کے کمرے میں بیٹھی رہی تھی اور وہاں سے اسکے بالوں میں ان دواؤں کی بو بس گئی تھی۔ جو اس کمرے میں استعمال ہو رہی تھیں۔

سعید کی نظر مکان کی کھڑکیوں کی طرف اٹھ گئی اور گو اور کوئی ثبوت سوائے بدبو کے موجود نہ تھا تاہم اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی جگہ رہتی ہے۔ یہ مکان اس کے مکان سے نزدیک ہی تھا اور وہ جانتا تھا کہ اسمیں ایک معزز اور شریف سرکاری عہدہ دار کا قیام تھا جن کے اس کے والد سے کافی مراسم تھے وہ اسکی لڑکی ہوگی۔۔۔۔۔ اور

چونکہ قومیت وغیرہ میں بھی کوئی فرق نہ تھا...... غالباً رشتہ ہوجانے میں کوئی مشکل نہ ہوتی...... یا خدا! اے میرے پروردگار! اسکو صحت عطا کردے!

اگلے روز صبح کو جب وہ دفتر جا رہا تھا اسنے دیکھا کہ ایک موٹر اسکی معشوقہ کے مکان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور اسمیں سے ایک انگریزی وضع قطع کا شخص بیگ ہاتھ میں لیئے ہوئے اترا، اسکے چہرے پر نظر پڑنا تھی کہ سعید حسن کو نپولین والی تشبیہ یاد آگئی کیونکہ اس ڈاکٹر کے خط و خال نپولین سے مشابہ تھے۔

وہ ٹھہر گیا اور سڑک پر ٹہل کر ڈاکٹر کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کھڑکیوں کی طرف نظر اٹھانے پر اسنے دیکھا کہ بالائی منزل کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سہراب بیٹھا دھوپ کے مزے لے رہا ہے۔ اسے خیال آیا "یہ اُس کا کمرہ ہے"۔ ہر منٹ ایک گھنٹہ کے برابر معلوم ہوتا تھا لیکن آخرکار ڈاکٹر مکان سے نکلا اور سعید حسن نے آگے بڑھ کر مکان کی طرف اشارہ کرکے اس سے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں صحت ہوجائیگی"

"امید تو ہے۔ انشاء اللہ"۔

سعید حسن نے بمشکل شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اسکے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور دفتر کو چلا گیا۔ دوسرے اور تیسرے دن انتظار میں رہا۔ لیکن ڈاکٹر سے نہ مل سکا، اگلے روز اتنا بیتاب تھا کہ دفتر بھی نہ گیا، اور تمام دن اپنے صحن میں ٹہل کر گزار دیا۔ لیکن خیالات کی محویت کی وجہ سے ڈاکٹر آیا بھی اور چلا بھی گیا اور اُسے خبر نہ ہوئی اسکا کئی بار اپنے احاطہ سے نکل کر دوسرے مکان کی طرف دیکھنا بیکار ثابت ہوا۔

اسنے رات کا کھانا نہ کھایا اور لیٹ گیا۔ مدت کے بعد نیند آئی تو خواب میں دیکھا کہ اسکی معشوقہ کی روح سفید لباس پہنے ہوئے اس سے کہہ رہی ہے کہ "میں مرگئی ہوں اور اب ہمیشہ کے لیئے تمھاری ہوں"۔ وہ گھبرا کر اٹھا۔ اسکے دماغ پر سیکڑوں من کا بوجھ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سوگیا۔ پھر جاگا اور پھر سوگیا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے تر تھا اور اس یقین سے کہ جس بات کا اسے خوف تھا وہ ہوگئی اسکے جوش کھاتے ہوئے خیالات میں قدرے تسکین کی سی صورت پیدا ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن ایک دفعہ اور وہ یک لخت چونکہ اٹھا اور سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسکا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور سر کے بال کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ چلا کر کہنا چاہتا تھا "میری پیاری" لیکن آواز نہ نکلتی تھی۔

کیونکہ ٹیلیفون کی گھنٹی واقعی بج رہی تھی (عطاء الرحمن)

۱۵ دسمبر تک جن حضرات کا چندہ سالانہ بابت ۱۹۲۵ء بذریعہ منی آرڈر وصول ہوجائیگا اُنہیں "نگارستان" بجائے ۴؎ کے ۲؎ میں مل سکے گا۔ منیجر نگار بھوپال

زبانِ اُردو

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

صلاح و مشورہ

حضرات! اردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ کم و بیش عرض کر چکا اب میں اپنے فرض کے اُس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھکر آسان دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے، یعنی صلاح اور مشورہ! قبل اسکے کہ میں کچھ اور عرض کروں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اسوقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اُردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں حالانکہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہے یہ خانقاہیں صرف اپنے گزشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں، کنعاں اور مصر دونوں ویران ہیں اور متاع یوسفی کے لئے آنکھیں بے قرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں ہے جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدر آباد کی فضا کو اپنے نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اُردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں ان سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب زمانہ کا انقلاب انہیں لیل و نہار کو پھر ہمارے سامنے کردے جن کی گردش کبھی اُردو کی گہوارہ جنبانی کر چکی تھیں۔

حضرات! اس سلسلہ میں میں خود علی گڑھ کی ذمہ داریوں کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اُردو کا رینائسنس علیگڈھ ہی میں طلوع ہوا اور دشمنان اردو کا مقابلہ بھی ہمیشہ اسی محاذ سے کیا گیا، دلی اور لکھنؤ کے بعد اُردو کا پرستش کدہ علیگڈھ ہی رہا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ہم اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے ہیں۔ جو سرسید، محسن الملک، نذیر احمد شبلی، حالی اور آزاد، سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہونچی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ موجودہ حالات کچھ اس درجہ متناقض اور ہماری قوت عمل اس درجہ نامکمل ہے کہ ہم کسی قطعی فیصلہ پر پہونچنے کی جرأت نہیں کرسکتے، آپ حضرات نے مہمات جیسن میں وہ قصہ تو ملاحظہ فرمایا ہی ہوگا، جہاں جیسن کے جہاز کو دو ایسی چٹانوں سے گزرنا پڑا تھا، جن کے درمیان سے کوئی چیز گزرتی تو وہ یک لخت ایک دوسرے سے ٹکرا ئیں اور اُسے پرزہ پرزہ کرکے پھر علیحدہ ہو جاتیں۔ اس طور پر کوئی چیز ان دونوں کی زد سے محفوظ رہ کر نہیں نکل سکتی تھی، ایک حد تک یہی حالت ہمارے انسٹی ٹیوشن کی ہے۔ ہماری کشتی اسوقت آکسفورڈ اور غرناطہ کے درمیان میں ہے دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے۔

حضرات! اسوقت اس مسئلہ کا چھیڑنا مصلحت نہیں ہے کہ علی گڈھ کو کیمبرج اور آکسفورڈ بنایا جائے یا قرطبہ اور غرناطہ، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث مباحثہ کے ساتھ آکسفورڈ یا غرناطہ

کا سا کچھ کام بھی ہوتا رہے، اردو کی حیثیت کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، وہ ہماری توجہ کی محتاج ہے، میں نہیں کہتا کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اسی پر صرف کر دینی چاہیئے۔ استدعا صرف اتنی ہے کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اس کے خلاف نہیں بر سر کار لانا چاہیئے۔ خدا مسلمانوں کو قائم رکھے ابھی بہت سے مواقع ایسے آئیں گے جہاں وہ "تماشا" کو کامیاب، اور "تمنا" کو بے قرار رکھ سکیں گے۔

لائبریری

حضرات! سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم کو عہدہ برآ ہونا ہے اُردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام ہے، یوں تو یہ ضرورت بظاہر نہایت خفیف اور معمولی نظر آتی ہے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کام میں ہم کو انتہا سے زیادہ سعی و کوشش سے کام لینا پڑیگا، اسوقت کم و بیش اُردو کی آٹھ ہزار مطبوعات ہیں اور ہر نسخہ کی قیمت کا اوسط اگر روپیہ رکھ لیا جائے تو آٹھ ہزار روپے تو صرف کتابوں کی قیمت ہونگے، اسوقت ہندوستان میں اردو کتابوں کا کوئی مکمل کتب خانہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسا افسوسناک واقعہ ہے جس کا ہم کو احساس ہونا چاہیئے، کتب خانہ اسی پیمانہ کا ہونا چاہیئے یا نہیں جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اسکی ضرورت اگر علیگڈھ کو نہ ہوگی یا اس ضرورت کو علیگڈھ نے پورا نہ کیا تو پھر کس سے توقع رکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک اُردو کی ایک مکمل اور جامع لائبریری نہ ہوگی ہماری مساعی کا شیرازہ کبھی استوار نہ ہو سکیگا۔

انجمن اردوئے معلیٰ

دوسری ضرورت یہ ہے کہ علیگڈھ میں ایک اُردو انجمن قائم کی جائے، جس کے اراکین وہ لوگ ہوں جنکو اردو سے شغف ہے یا جو اُردو کی ترویج اور ترقی کو اپنا مشن خیال فرماتے ہیں، اس انجمن میں ہفتہ وار یا ماہوار اردو کے معرکۃ الآرا مسائل پر عالمانہ مضامین پڑھے جایا کریں، اور ان پر سنجیدگی اور فرزانگی کے ساتھ تبادلۂ آرا کیا جائے، اس انجمن کی کامیابی ارباب یونیورسٹی اور اراکین انجمن کی پر خلوص مساعی پر ہے، انجمن کا ایک ادبی رسالہ ہونا چاہیئے جسمیں ان مضامین کو شائع کیا جائے اور وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوتے رہیں جن کا مبحث اردو سے متعلق ہو، مثلاً اُردو کیونکر مقبول انام بنائی جا سکتی ہے، رسم الخط، اُردو صحیح لکھنے اور بولنے کے فوائد اور قواعد، تعلیم اُردو، اردو انشا پردازی، اردو ترجمے اور تالیفات، مشہور شعرائے اُردو اور فارسی کے منتخب کلام مع مقدمہ، فرہنگ اور حاشیہ، مشاہیر ملک و قوم کے سوانح زندگی جو بچوں اور کم لکھے پڑھے لوگوں کے لیئے مفید ہو، خوشنویسی اور اُس کا فن، خطاطی، قومی اور نیچرل نظمیں وغیرہ وغیرہ اس رسالہ میں مشہور مطبوعات پر فاضلانہ نقد اور تبصرہ ہو تاکہ لوگوں میں تنقید صحیح کا ملکہ پیدا ہو اور وہ مشہور مطبوعات سے آشنا ہو سکیں، فی الحال میں نے یہ تجویز پیش کی ہے، کہ انجمن اردوئے معلیٰ کا احیا کیا جائے اور رسالہ کا نام اُردوئے معلیٰ رکھا جائے، اسکی ترتیب اور تہذیب معارف

اور اُردو کے نمونے پر ہو اور سال میں چار بار شائع ہوا کرے،

کانفرنس معلمین اُردو تیسری ضرورت جسکی نوعیت ایک حد تک، نیم سرکاری، ہوگی، یہ ہی کہ ہر سال اُن معلمین اُردو کی ایک کانفرنس منعقد ہوا کرے جن کا تعلق مختلف یونیورسٹیوں سے ہو، مثلاً علی گڑھ لکھنؤ، دہلی، بنارس، حیدرآباد، پنجاب، بمبئی، وہ لوگ جو ان یونیورسٹیوں میں شعبۂ اُردو سے تعلق رکھتے ہیں، ہر سال مجتمع ہوکر ان تدابیر اور اسباب پر غور کیا کریں اور حتی الوسع ان کو عمل میں لانے کی کوشش کریں جو کانفرنس کی نوعیت دیگر اس قسم کی جماعتوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہوگی، اس کے ارکین وہ ہونگے جن کا براہ راست اُردو کی تعلیم اور نشر و تعمیم سے تعلق ہوگا۔ اور یہ لوگ اپنے اپنے مخصوص مقامی ضروریات کو مدنظر رکھکر مناسب تدابیر عمل میں لائیں گے۔ جہاں تک براہ راست اُردو کی درس و تدریس کا تعلق ہی معلمین کی یہ کانفرنس بے حد ضروری ہے اور اگر یہ کامیابی کے ساتھ چلائی جا سکے، تو میرا خیال ہے اس سے نہایت عمیق اور دور رس نتائج مترتب ہونگے۔

اکاڈمی چوتھی ضرورت جس کا میں اس سے قبل اعادہ بھی کرچکا ہوں ایک اکاڈمی کی ہی، اسوقت اردو کا کوئی "اسکول" نہیں ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اسوقت صرف ایک ایسی وراثت کے دعویدار ہیں جو مدت ہوئی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقامات کی وہ فضا ہی نہیں رہی جہاں ذوق شعری تربیت پاتا، جہاں طبیعتیں سلجھتی تھیں، زبان کو صیقل ہوتی تھی۔ نظر میں وسعت اور قلب میں سوز و ساز پیدا ہوتا تھا، لکھنؤ اب بھی غنیمت ہے لیکن یہ چھاؤں بھی ثاقب اور صفی کے دم سے قائم ہے میری ذاتی رائے ہے کہ اسوقت ایک حد تک دلی نثر کی اور لکھنؤ نظم کی علمبرداری کر رہا ہی۔ دارالمصنفین پر زبان کا نہیں بلکہ علمیت کا رنگ غالب ہی، حیدرآباد سے سرمایہ فراہم کرنے کی توقع ہے، اعظم گڑھ اور حیدرآباد کا مقابلہ یوں بھی کیا جاسکتا ہی کہ اول الذکر مثال متلاشیان آثار قدیمہ کی ہی جو خزائن اور دفینوں کی تلاش میں ہے، اسلاف کے کارناموں کو روشن اور ان سے موجودہ نسل کو آشنا کرنا دارالمصنفین کا کام ہے، ان کی جولانگاہ معصر ہر کو لیسیم اور پامپیائی ہے۔ حیدرآباد خام پیداوار کا مالک ہے اور یہ بمنزلہ ہندوستان کے ہے آپ اگر معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کرونگا کہ دنیا میں بدمذاقوں کی کمی نہیں ہے ممکن ہے لفظ، خام، سے کچھ لوگ دوران تنفس میں مبتلا ہوجائیں۔ اسلیئے میں جلد سے جلد یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ لفظ، خام، سے یہاں، ناقص، مراد نہیں ہے بلکہ یہ (Raw - Product) را پروڈکٹ کا مرادف ہے اسلیئے اس سلسلہ میں علی گڑھ کو کیا حیثیت دی جائے، میں اب تک طے نہیں کرسکا ہوں اور اسے آپ ہی کے حسن تخیل پر چھوڑتا ہوں بشرطیکہ آپ ستم ظریفی کو دخل دینے سے اجتناب فرمائیں۔ بہرحال یہ بحث اٹھائی جا سکتی ہی

کہ اس اکاڈمی کا مقصد کیا ہوگا اور اسکی ضرورت کیا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کرونگا، کہ اسوقت اُردو کو صحیح راستہ پر ڈالنے والی کوئی ایجنسی نہیں ہے، رفتار زمانہ کے مطابق نئی نئی قومیں برسرکار ہیں اور ہر روز نئی نئی ضرورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں، اگر کوئی خاص مجلس یا ایجنسی ایسی نہ ہوئی جو ان ضروریات کا تجزیہ کرتی رہے یا مناسب تدابیر پیش کرے، تو جیسا کہ آج عام طور پر نظر آرہا ہے اُردو کی حیثیت صرف نیوز پیپر لٹریچر (اخباری زبان) کی ہوجائیگی اور اس قسم کا لٹریچر جیسا کہ ظاہر ہے، کبھی کلاسکس کے زمرہ میں نہیں آسکتا۔ اُردو کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، دوسری زبانوں میں نئے الفاظ کے آمیزش کی بہت کم گنجائش ہے، لیکن اردو کا دامن اس کے لیئے نہایت وسیع ہے، اسما اور افعال کی آمیزش کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے یعنی زبان اور محاورہ کے مسئلہ میں ہم کو نہایت احتیاط برتنی پڑیگی۔ ہندوستان کی حیثیت ایک براعظم کی ہے۔ اسمیں سیکڑوں قومیں بستی ہیں اور سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر اُردو کی کوئی ٹکسال مقرر نہ کی گئی، تو کچھ دنوں میں اسکی صورت کچھ اس طور پر مسخ ہوجانے کا اندیشہ ہے کہ آپ کھرے کھوٹے کا بھی پتہ نہ لگا سکینگے۔ الفاظ، جملوں، طرز انشار، زبان، لب و لہجہ محاورہ وروزمرہ میں ایسی تفریق نظر آنے لگے گی کہ شاید پھر آپ اُردو کا کوئی محاذ ہی نہ متعین کرسکیں، اسلیئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے مسلم الثبوت شعرا اور انشا پردازوں کی ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو اب اردو کا معیار قایم کرے۔ لیکن براہ راست اُسے مسلم یونیورسٹی سے تعلق نہ ہو، ورنہ انتظامی دقتوں کے علاوہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اسکی کامیابی کے لیئے مستعد نہ ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا

اس سلسلہ میں میں اُردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک زمانہ میں معارف نے اس کی تحریک کی تھی اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس تحریک کی ناکامی کا ماتم کیا تھا، میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تحریک اس زمانہ میں ایک حد تک قبل از وقت تھی، کسی زبان کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا ایک خاص وقت اور موقع ہوتا ہے۔ ابھی بہت سے ابتدائی مراحل طے کرنے ہیں اور چونکہ یہ مدارج ابھی ناتمام ہیں اسلیئے انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل کی دشواریاں اور زیادہ سنگین ہوتی جارہی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامع اور مکمل ہو، اس کے بعد کام کرنے والوں کا سوال آتا ہے۔ کام کرنے والوں کا مسئلہ کچھ بہت زیادہ دشوار نہیں ہے، لیکن تحقیق اور تفحص کے اسباب اور وسائل ابھی ناپید ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت، اسوقت ایک مکمل اور جامع اردو لغت کی ہے، اب تک جتنی لغات مدون ہوئی ہیں وہ بہمہ وجوہ مکمل اور مستند نہیں ہیں، یہ اسکیم انسائیکلوپیڈیا کی اسکیم سے مختصر اور آسان تر ہے، اور اس مرحلہ کے طے ہوجانے کے بعد انسائیکلوپیڈیا کی تدوین میں کافی سہولت پیدا

ہونے کی توقع ہے، اس سلسلہ میں دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ مختلف شعبہ جات علوم اور فنون پر مستند اور مکمل تصنیفات کی ضرورت ہے، میں اسے تسلیم کرنے کے لیئے طیار ہوں کہ دوسری زبانوں کی کتب کا حوالہ دیا جاسکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بعض اوقات وضع اصطلاحات کا مسئلہ اپنی انتہائی پیچیدگیوں کے ساتھ رونما ہوگا اور اسوقت ہم کو ایسے مترادفات کی ضرورت پیش آئیگی جو جامع اور مانع ہونے کے علاوہ ایک حد تک عام فہم اور سہل ورواں بھی ہوں اس معاملہ میں حیدر آباد یونیورسٹی کی کوششیں ہر طور پر قابل ستائش ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ایسا کام اٹھایا ہے جس کی کامیابی یا ناکامیابی پر اُردو کا مستقبل منحصر ہے۔

اُردو مکاتب پانچویں ضرورت جس کی طرف خود ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کو متوجہ ہونا چاہیئے اُردو مکاتب کا قیام ہے، اس سلسلہ میں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کانفرنس کے نظام عمل کی طرف (جہاں تک اردو کا تعلق ہے) آپ کی توجہ مبذول کراؤں، کانفرنس کو اپنے مساعی میں جب کبھی ناکامیابی ہوئی ہے اسکا اصلی راز یہ ہے کہ اس نے اپنا نظام عمل ہمیشہ نہایت وسیع پیمانہ پر مرتب کیا ہے، ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اسکی مختلف تعلیمی ضروریات ایک مرکز سے اتمام کو نہیں پہونچ سکتیں۔ کانفرنس کو جزئیات پر نہیں جانا چاہیئے، اس سے سوائے طوالت اور پریشانی کے کچھ اور حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسمیں شک نہیں اب پراونشل کانفرنسیں بھی قائم کی گئی ہیں، لیکن میرے نزدیک اسمیں بھی اختصار کی ضرورت ہے، میری رائے یہ ہے کہ ہر ضلع میں مسلمانوں کی ایک مجلس تعلیمی ہونا چاہیئے، جس کے اراکین اور عہدہ دار اسی ضلع کے باشندہ ہوں اور تمام تعلیمی مصارف کا بار خود اسی ضلع پر ہو، اس معاملہ میں گورنمنٹ بھی کافی اعانت کرنے پر آمادہ ہے، گورنمنٹ کی طرف سے جو مکتب کی کمیٹیاں قائم ہیں ان کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آرہی ہے کہ جن لوگوں کے لیئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے وہ خود اسکی طرف سے بے پروا ہیں، میری تجویز یہ ہے کہ کانفرنس کے معتمد حضرات خود تکلیف فرما کر یا قوم کے دیگر باثر بزرگوں کے توسل سے، ہر ضلع کا دورہ فرمائیں اور وہاں کے مقامی حالات کو مدنظر رکھکر اس ضلع کے باثر اور ہمدرد افراد کی حمایت حاصل کریں اور اندرونی انتظام کی عناں بالکل ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر لوگ دلسوزی اور محنت سے کام کریں تو ہر ضلع کے مکاتب اپنی ضروریات کے خود کفیل ہو سکتے ہیں، میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ لوگ دلسوزی یا محنت سے کام کرنے کے لیئے آمادہ نہیں ہیں، مشکل یہ ہے کہ اسکے لیئے بالعموم غلط اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے، اسمیں شک نہیں، کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کے مسلمان فرقہ بندی کی سعادت سے محروم ہوں اور اپنی ذاتی حقوق پر قوم اور ملک کے بہترین اغراض و مقاصد کو قربان کردینے کے لیئے طیار نہ ہوجاتے ہوں، لیکن اگر کوشش کیجائے

تو کوئی دقت ایسی نہیں ہے جسپر عبور حاصل نہ ہو سکے، اور میرا خیال ہو کہ اگر کانفرنس پوری تندہی کے ساتھ کام کرے تو ممکن نہیں ہے کہ یہ معاملات بروقت نہ سلجھ جایا کریں،

حضرات! اسوقت اردو کی اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ابتدائی تعلیم کی، جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہونگے ہماری آیندہ نسل میں تعلیم کا ذوق فطری اور قومی نہ ہوگا۔ اب ہم کو قلمی نہیں بلکہ تعلیمی فضا کی ضرورت ہے اب ضرورت اسکی ہو کہ ہر شخص کم سے کم ابتدائی تعلیم کو، اتنا ہی ضرور سمجھے، جتنا ہمارے گریجوایٹ ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں، اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان مکاتب کا نصاب مقرر کرے، ان کا امتحان لے، اور بہترین طریقہ تعلیم کو عمل پذیر بنائے، میری تجویز یہ ہے کہ ان مکاتب کی تعلیم بالکل مفت ہو، اور محض اتنی ہو کہ ہر طالب علم معمولی اُردو لکھ پڑھ لے۔ ان مکاتب میں یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ ہفتہ میں دو ایک بار رات کے وقت بھی کلاس ہوا کرے تاکہ وہ لوگ (اسمیں لڑکوں کی تخصیص نہیں ہے) جو کاروبار کی وجہ سے دن میں تعلیم کا شغل نہ رکھ سکیں، شب میں نوشت وخواند کر لیا کریں، استادوں کے انتخاب میں یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی شعائر کا پابند ہو اور ضروری مسائل دینی سے واقف ہوں، ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار اپنے قصبہ یا قریہ میں لوگوں کو جمع کر کے تعلیم، اسلام اور حفظانِ صحت پر لکچر دیا کرے۔

اردو گفتگو

ایک اور مسئلہ جسکی طرف میں آپ کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو داں حضرات جب کبھی کسی اُردو داں شخص یا پبلک سے مخاطب ہوں اُردو ہی میں گفتگو فرمائیں۔ آپ خود ان حضرات سے واقف ہوں گے جنکی پوری اُردو تقریر میں اُردو الفاظ کا تناسب صرف ۱۵ یا ۲۰ فیصدی کا ہوتا ہے یہی حالت خط وکتابت میں بھی نظر آتی ہے، بہت کم ایسے انگریزی داں حضرات دیکھے گئے ہیں جو اُردو میں خط وکتابت رکھتے ہیں۔ اس کے جواز میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طور پر اظہار خیال میں سہولت ہوتی ہے لیکن میں ان سے سوال کرونگا کہ وہ جب کبھی کسی ایسے شخص کو اپنا مخاطب بناتے ہیں جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہوتا ہے، کیا وہ انگریزی کے الفاظ استعمال ہیں لاتے ہیں اور اگر نہیں لاتے تو کیا اظہار مطالب میں کوئی نقص یا سقم رہ جاتا ہے۔ یہ صفت اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو انگریزی کے تمام مدارج طے کئے ہوتے ہیں یا محض ابجد خواں ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ جب کبھی اپنے دوستوں یا ڈاکٹروں سے اپنے اعزا کا عموماً اور بیوی کا خصوصاً تذکرہ کرتے ہیں تو بجائے اسکے کہ (بیوی) یا کچھ اور کہیں ہمیشہ وائف یا مسسٹر یا مدر کہیں گے، مجھے نہیں معلوم کہ اگر بیوی یا ہمشیرہ یا والدہ کہنے سے شرم آتی ہے تو ان الفاظ کے

انگریزی جامہ پہن لینے سے شرم و حیا کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ امراض کا نام لینے میں بھی اُردو کے بجائے انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اخفائے حال یا عریانی خیال مدنظر ہوتی ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اُس سے کہاں تک مقصد برآری ہوتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں بے اختیار ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں ہسپتال میں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب تشریف لائے، ان کی ساری تقریر اردو میں تھی صرف جہاں کہیں بیوی کا نام آجاتا تھا، برابر وائف کا لفظ استعمال کرتے تھے، میں نے دریافت کیا کیوں جناب، گستاخی معاف، آپ کی ساری تقریر تو نہایت برجستہ قسم کی اُردو میں تھی، بیوی کو بجائے بیوی کہنے کے آپ، وائف، کیوں فرماتے رہے؟ میرے اس سوال پر انہوں نے کسی قدر تامل کے بعد فرمایا، بات یہ ہے کہ ان کو کچھ فیمیل کمپلینٹس (نسوانی شکایات) ہیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر دریافت کیا اور کیوں حضرت فیمیل کمپلینٹس کیا؟ اس کا جواب انھوں نے صرف اس طور پر دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر جلد جلد کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگے اور ہمارا سوال اور ان کے فیمیل کمپلینٹس دونوں یہیں ختم ہو گئے!

ترجمہ تالیف اور تصنیف چھٹی ضرورت جو آج ہمارے سامنے ہے وہ ترجمہ اور تالیف کی ہے، اسوقت اُردو کو ایسی زبانوں سے مقابلہ کرنا ہے جو شاہراہ ترقی پر اُردو سے بہت آگے پہنچ چکی ہیں۔ اسی سلسلہ میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بھی آجاتا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی اس کام کو نہایت تندہی اور سرعت کے ساتھ پورا کر رہی ہے، گو وہاں جن کتابوں کے تراجم اب تک ہو چکے ہیں ان میں بیشتر کتب درسی ہیں اسمیں شک نہیں یہ بھی ہمارے انتہائی تشکر و امتنان کا موجب ہے اور اس میں شک نہیں ایک طور پر یہ کوشش بھی مستحسن ہے کیونکہ ہندسہ ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ مشہور اور مستند انشاپردازوں کی سرپرستی اور نگرانی میں ایک دارالترجمہ قائم ہو جسمیں نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر زبانوں کے بھی اُردو تراجم مرتب کیے جائیں۔ اس سے زبان کا ذخیرہ نہایت وسیع ہو جائیگا۔ اور وہ لوگ جو صرف اردو سے آشنا ہیں اور اسمیں کمال حاصل کر چکے ہیں، دیگر زبانوں کے محاسن اور معائب پر وقوف حاصل کر سکیں گے اور اسمیں علاوہ اسکے کہ خود اُردو زبان وسیع ہوگی اسکے ہمہ گیر ہونے کا امکان اور زیادہ ترقی کر جائیگا، اس مسئلہ خاص میں انجمن ترقی اُردو کی مساعی بہر نوع قابل ستائش ہیں، لیکن جسپر یہ فرض اپنی انتہائی سختیوں کے ساتھ لازم آتا ہے وہ مسلم یونیورسٹی ہے، میرا خیال ہے کہ اگر یہاں کے اُردو داں اسٹاف پر فرداً فرداً یہ ذمہ داری عائد کردی جائے، کہ وہ یونیورسٹی کی نگرانی میں اپنے مضمون خاص کی کسی مقتدر تصنیف کو اُردو کے قالب میں لائیں تو شاید بے موقعہ نہ ہوگا۔

افسانہ نویسی ساتویں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے وہ دوست اور کرم فرما جنکو اُردو ادب کا ذوق صحیح ہے

اور ان کی انشا پردازی ہر حیثیت سے مسلّم ہے، اپنی توجہ کو مختصر افسانہ نویسی اور ناول نگاری کی طرف مائل فرمائیں، میرا خیال ہو کہ اسوقت جب کہ ملک میں ادب متین کی طرف سے انتہائی استغنا برتا جارہا ہو اور معقول اور غیر معقول اسباب کی بنا ربر اُردو ہماری توجہ کو جذب نہیں کر رہی ہے، ہمارے انشا پردازوں کو ایسی چیز پیش کرنی چاہیئے، جو عوام کے لمحات فرصت کو دلچسپ اور ایک حد تک کار آمد بھی بنا سکے۔ اسوقت ہمارا ادبی ذوق جس حد تک پست ہوچکا ہے اسکی صرف یہ وجہ ہے کہ اُردو میں سستے اور مبتذل ناول کثرت سے پھیل چکے ہیں اور معمولی لکھا پڑھا آدمی ہمیشہ ان کی طرف مائل ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی ابتدائی نقوش اسکے علمی اور عملی زندگی دونوں کو ہمیشہ کے لیئے برباد کردیتے ہیں۔ جس قسم کی افسانہ نگاری کا میں نے تذکرہ کیا ہو اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے مشرقی معتقدات، مشرقی شعائر، مشرقی تہذیب و تمدن، اس صنف انشا کے لیئے ہر طرح بار اس آسکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ مشرقی آب و رنگ اس کے لیئے نہایت موزوں ہے لیکن افسانہ نگاری کا فن بجائے خود نہایت مشکل ہے اور اس کے اصول و قواعد کو عمل میں لانا آسان نہیں ہو۔ ان افسانوں اور ناولوں میں مقامی رنگ کا ہونا لازمی ہے ورنہ یہ ہمارے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہوسکیں گے، غرضکہ اس سلسلہ میں ہم کو نئی بنیاد تعمیر کرنی پڑیگی، جس کے لیئے ہمارے ماہران ادب کو طیار ہوجانا چاہیئے۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا

حضرات! مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کرچکا، آپ نے جس صبر و شکر کے ساتھ میرے خیالات کی پذیرائی کی اسکا شکر گزار ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب کوئی ایسا موقعہ نہ آئے جہاں میری جسارت اور آپ کے ضبط و تحمّل کو یوں معرض امتحان میں لایا جائے، صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کا میں نے عمداً کہیں تذکرہ نہیں کیا ہو اور وہ یہ کہ کہنا سننا تو ہمیشہ رہا ہے، اس سے حاصل ہی کیا،

"کچھ کیجیے بھی"

جس اندیشہ سے میں نے اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا وہ آپ پر روشن ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی

اُٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

رشید احمد صدیقی ایم اے

--- ختم ---

ہندی شاعری کی تاریخ

(سلسلہ ماہ گزشتہ)

جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ (۱۶۸۱-۱۷۲۴ء) نے بھی ایک کتاب تصنیف کرائی جسمیں سورج بنسی خاندان کے حالات شروع سے اپنے عہد تک درج کر دیئے، اجیت سنگھ کے بیٹے مہاراجہ ابھے سنگھ کے عہد میں (۱۷۲۴-۱۷۵۰ء) کرن بہت مشہور بھاٹ ہوا ہے اس نے ایک نظم سورج پرکاش ۰۰ ۷۵ اشعار کی لکھی جسمیں ۱۶۳۸ء سے لیکر ۱۷۳۱ء کے حالات درج کئے۔

مہاراجہ بجے سنگھ (۱۷۵۳-۱۷۸۴ء) خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کا بڑا قدردان تھا، اس کے زمانہ میں ایک کتاب بجے بلاس لکھی گئی جسمیں ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اس تصنیف میں صرف اس لڑائی کا حال درج ہے جو بجے سنگھ اور اس کے برادر عم زاد رام سنگھ کے درمیان ہوئی تھی۔

دوسرے درباروں کے بھاٹ

علاوہ میواڑ اور مارواڑ کے اور درباروں میں بھی بھاٹوں کی قدر کی جاتی تھی، جب جگت سنگھ راجہ مئو نے شاہجہاں کے خلاف بغاوت کی تو اس کا حال ایک بھاٹ گمبھیر رائے نے ۱۶۵۰ء میں لکھا، راؤ رتن کے عہد میں (۱۶۵۰ء) جو راجہ اُدے سنگھ کا پوتا تھا کسی بھاٹ نے ایک تاریخ راؤ رتن سا آسیا نظم میں لکھی۔

جے سنگھ سوائی مہاراجہ جے پور (۱۶۹۹-۱۷۴۳ء) نہ صرف شعراء کا سرپرست تھا بلکہ خود بھی شاعر تھا اس نے خود اپنی لائف جے سنگھ کا پدرم کے نام سے نظم کی ہے، اسی جے سنگھ کا برادر نسبتی بدھ راؤ، راجہ بوندی بھی اچھا شاعر تھا۔

جودھ راج ایک برہمن زادہ نے مہاراجہ ہمیر رانا کے حکم سے ایک کتاب ہمیر کاوی لکھی۔ اسمیں انہیں واقعات کو نظم کیا گیا ہے جنہیں سارنگ دھر چودھویں صدی میں لکھ چکا تھا۔

گھنشیام شکل راجہ ریواں کے دربار کا بھاٹ تھا، اور کچھ عرصہ تک راجہ بنارس کے دربار میں بھی رہ چکا تھا، اسکا شمار بہترین بھاٹوں میں ہے،

ہری کشن (۱۷۳۱ء) راجہ چھتر سال فرمانروائے پنا کے دربار سے متعلق تھا اور اسکی رزمیہ شاعری بہت مشہور ہے۔

سدن برہمن (سنہ ۱۷۵۰ء) بھی رزم گو شاعر تھا اور مہاراجہ بھرت پور کا بیٹا سورج مل اس کا سرپرست تھا، اسکی کتاب سُجان چرتر مشہور ہے جسمیں سورج مل کی جنگ کا حال درج کیا گیا ہے، سدن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ کے حالات لکھنے میں مہارت تامہ رکھتا تھا،

ایک بھاٹ لال جھا (سنہ ۱۷۸۰ء) بہاری زبان میں شاعری کیا کرتا تھا اسکی ایک نظم کسری گھاٹ لڑائی مشہور ہے، جسمیں مہاراج نرندر سنگھ فرمانروائے دربھنگہ کے رزمیہ وقائع درج ہیں۔

لال کوی

راجہ چھتر سال (سنہ ۱۶۴۶-۱۷۳۱ء) فرمانروائے پنا بڑا اعلم دوست رئیس تھا، اس نے شعراء اور دیگر اہل کمال کی بہت قدر کی، اس کے عہد کا نہایت مشہور شاعر یا بھاٹ گورے لال پروہت تھا جسے عام طور سے لال یا لال کوی کہتے ہیں۔ اس کی تصنیف چھتر پرکاش بہت مشہور کتاب ہے، اسمیں بندیلکھنڈ کے تمام راجاؤں کے حالات لکھے ہیں اور چھتر سال اور اس کے باپ کے واقعات زیادہ مفصل درج ہیں۔ لال کوی رزمیہ شاعری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا اور جنگ کے واقعات اس طرح بیان کرتا ہے کہ ساری تصویر پیش نظر ہوجاتی ہے۔

اس عہد کا اور لٹریچر

علاوہ شعر و شاعری کے اس عہد میں اور قسم کی کتابیں بھی فلسفہ ویدانت جین مذہب اخلاق، زراعت، نجوم، سالوتری، لغت وغیرہ کے متعلق مرتب ہوئیں۔ خاص خاص مصنفین کی فہرست ذیل میں درج ہے:-

(۱) ناتھ کوی، (پیدائش سنہ ۱۵۸۴ء) برج کا باشندہ تھا، اس نے موسموں اور دیگر مباحث پر متعدد نظمیں لکھیں۔

(۲) مبارک علی، (پیدائش سنہ ۱۵۸۳ء) بلگرام ضلع ہردوئی کا رہنے والا تھا۔ اس کے دوہے چھوٹی بحر میں بہت مشہور رہیں

(۳) ناظر (پیدائش سنہ ۱۶ء) آگرہ اس کا وطن تھا، یہ اپنے زمانہ کا بڑا مشہور اور ذی کمال شاعر تھا

(۴) بنارسی داس:- (پیدائش سنہ ۱۵۸۶ء) جین مذہب کا مقلد تھا اور جونپور اس کا مسکن تھا، اس کی شاعری تمام تر مذہبی تعلیمات سے لبریز ہے،

(۵) سری دھر:- (پیدائش سنہ ۱۶۲۳ء) راجپوتانہ کا باشندہ تھا اس کی کتاب بھوانی چھند مشہور ہے۔

(۶) گھاسی رام:- (زمانہ ترقی سنہ ۱۶۲۳ء) اپنے عہد کا بڑا زبردست شاعر تھا، محبت و اخلاق وغیرہ پر اسکی نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔

(۷) ٹھکر (زمانہ ترقی سنہ ۱۶۳۴ء) یہ کایستھ تھا۔ اس کا تعلق جہانگیر کے دربار سے تھا، جہانگیر نے ایک بار اسے

کسی خطا پر قید کر دیا، چنانچہ اس نے قید ہی کی حالت میں رس رتن تصنیف کی، جب جہانگیر کے سامنے وہ پیش ہوئی تو اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔

(۸) دمودر داس: (ترقی ۱۶۶۰ء) یہ دادو پنتھی جماعت سے تعلق رکھتا تھا اس نے مارکنڈے پران کا ترجمہ راجستھانی زبان میں کیا، یہ ترجمہ نثر میں ہے۔

(۹) چھتر:۔ (ترقی ۱۶۷۰ء) یہ کالیستھ تھا اور موضع انتر (گوالیار) کا رہنے والا تھا، اس نے مہابھارت کو ہندی نظم میں مختصر کر کے لکھا اور اس کا نام بیجے مکتا دلی رکھا۔

(۱۰) سبل سنگھ:۔ (پیدائش ۱۶۷۰ء) یہ کسی راجہ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بھی مہابھارت کے ... ۲۴ اشعار کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا تھا

(۱۱) بیتال:۔ (پیدائش ۱۶۷۰ء) وکرم شاہی دربار سے اس کا تعلق تھا یہ زیادہ تر اخلاقی نظمیں لکھتا تھا۔

(۱۲) دیبی داس:۔ (ترقی ۱۶۸۵ء) بندیلکھنڈ کا رہنے والا تھا۔ اور راجہ رتن پال سنگھ رئیس قردلی اس کا سرپرست تھا۔ اس نے اخلاق پر اک نہایت عمدہ کتاب پریم رتنکار لکھی۔

(۱۳) ہوتی رام:۔ (ترقی ۱۶۸۳ء) اسنے افسانہ مادھونل کا ترجمہ برج بھاشا زبان میں کیا جو بعد کو للولال جی کی کوشش سے اردو زبان میں بھی منتقل ہوا۔

(۱۴) بھودھرداس:۔ (ترقی ۱۷۲۴ء) جینی مذہب کا پیرو تھا، اور اسکی تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں، بہ حیثیت شاعر ہونے کے یہ ممتاز درجہ رکھتا ہے،

(۱۵) گھاگھ:۔ (ترقی ۱۶۹۶ء) قنوج کا باشندہ تھا۔ اس نے فن زراعت پر ایک کتاب لکھی، اس کے بہت سے مقولے شمالی ہند میں اب بھی زباں زد ہیں۔

(۱۶) گنگاپت:۔ (ترقی ۱۷۱۹ء) ہندوؤں کے اصول فلسفہ کے متعلق اس نے ایک نظم لکھی ہے جو مکالمہ کی صورت میں ہے۔ اس کا نام اسنے وگیان بلاس رکھا تھا،

(۱۷) کرپارام:۔ (ترقی ۱۷۲۰ء) راجہ جے سنگھ فرمانروائے جے پور کے دربار کا نجومی تھا اس نے علم نجوم پر ایک کتاب ہندی زبان میں اچھی لکھی ہے۔

(۱۸) گری دہر:۔ (پیدائش ۱۷۱۳ء) دوآبہ کا باشندہ اور اخلاق کے متعلق خوب کہتا تھا۔ کنڈلیا جو

یہ بڑا استاد مانا جاتا تھا، اس کے بہت سے اشعار نے ضرب الامثال کی صورت اختیار کرلی ہے۔

(۱۹) سری ناگری داس :۔ (ترقی ۱۷۲۳ء) کرشن گڈھ کا راجہ تھا اس کا اصلی نام سوت سنگھ اور شاعرانہ متخلص ناگری داس تھا، یہ لحاظ شاعری یہ بھی اک خاص رنگ کا مالک تھا۔

(۲۰) نور محمد : (ترقی ۱۷۲۳ء) اسکی تصنیف اندر اوتی بہت مشہور کتاب ہے، یہ اک افسانہ ہے جسے ملک محمد جائسی کے پدماوتی کی طرح اسنے منظوم کیا ہے۔

(۲۱) من بودھ جھا (ترقی سنہ ۱۷۵۰ء) اسکو بھولن جھا بھی کہتے ہیں یہ ضلع دربھنگہ کا باشندہ تھا اور بہاری زبان کا اچھا شاعر تھا،

(۲۲) ندھان : (ترقی ۱۷۵۰ء) فن سالوتر پر ایک کتاب کا مصنف ہے، دیاندھ بھی اس زمانہ کا مصنف تھا اور اس نے بھی اس فن پر ایک کتاب لکھی ہے۔

(۲۳) رام چندر :۔ قوم کا برہمن تھا اسنے اٹھارویں صدی کے آخر میں شہرت حاصل کی، اسنے پاربتی کے پانوں کی تعریف میں ایک کتاب پانچ جلدوں میں لکھی جس کا نام چرن چندر رکھا ہے۔ یہ کتاب شاعری کے لحاظ سے بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔

ہندی لٹریچر

(سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد)

اٹھارویں صدی ہندی لٹریچر کی ترقی کے لیئے نامبارک ثابت ہوئی، البتہ انیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوگئی اور انتظام سلطنت کے لیئے انگریزوں کو ضرورت ہوئی کہ وہ یہاں کی زبانوں سے واقفیت حاصل کریں، اور اپنی زبان یہاں کے باشندوں کو سکھلائیں، اسوقت پھر یہ تحریک زندہ ہوئی اور مغربی خیالات کی آمیزش، مطابع کے رواج اور حکام کی ناگزیر توجہ سے ہندی اور اردو لٹریچر کا ایک جدید دور شروع ہوا۔

للو لال جی انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کا منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گلکرسٹ

Gilchrist وغیرہ) کی مدد سے ہندوستان کے لٹریچر پر صرف اس لیئے توجہ کی کہ یورپین لوگوں کے لیئے ایک سلسلۂ نصاب ایسا مرتب کیا جائے جس سے وہ یہاں کے مروجہ زبانوں کو آسانی سے سمجھنے لگیں۔ چنانچہ اس نے کالج کے دیگر اراکین (کپتان ابراہیم لاکٹ پروفیسر ٹیلر، ڈاکٹر ہنٹر

اس نے اسوقت کے ماہرین زبان کو جمع کیا اور اُن سے متعدد کتابیں لکھوائیں۔ جو زیادہ تر اُردو کی تھیں ہندی زبان کے لیئے للولال جی اور سدل مصر کا انتخاب کیا گیا، ہندی لٹریچر کے لیئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ نثر میں قاعدہ کوئی کتاب اچھے پیمانہ پر مرتب کی جاتی۔

للولال جی قوم کا برہمن اور گجرات کا رہنے والا تھا مگر اک عرصہ سے شمالی ہند میں بود و باش رکھتا تھا، یہ ایک ذہین اور قابل شخص تھا چنانچہ اس نے سدل مصر کی مدد سے موجودہ ہندی لٹریچر کی بنیاد قائم کی۔ اسوقت شمالی ہند میں بہت سی بولیاں رائج تھیں لیکن سب سے زیادہ فصیح و سلیس صرف اُردو تھی، جو شرفا اور پڑھے لکھے طبقہ کی زبان سمجھی جاتی تھی، للولال جی نے کوشش اس امر کی کی کہ اُردو میں جو الفاظ فارسی و عربی کی کثرت سے پائے جاتے ہیں اُن کو علیحدہ کرکے ہندی الفاظ اُن کی جگہ رکھدئے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے ایک کتاب پریم ساگر مرتب کی جو بھگوت پران کی دسویں باب کا ترجمہ ہے، یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۱۰ء میں تمام ہوگئی، اسکے بعد ۱۸۰۹ء میں راج نیت کی تصنیف شروع کی گئی جو برج بھاشا زبان میں تھی پھر سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی لکھی گئیں جن کی زبان اُردو ہندی ملی ہوئی تھی، للولال جی نے اسی سلسلہ میں بہاری لال کے ست سئی کی شرح لکھی اور اس کا نام لال چندر کا رکھا۔

سیرام پور

اس سلسلہ میں سیرام پور کی اُس عیسوی جماعت کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے ۱۸۱۱ء میں انجیل کا ترجمہ ہندی میں شائع کیا، علاوہ اس کے اور کتابیں بھی تصنیف کرائیں جن میں سے ایک ترجمہ رامائن کا بھی تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مسٹر کیرے نے جو اس مسیحی جماعت کا سردار تھا ایک اخبار بنگالی زبان میں جاری کیا اور غالباً یہ سب سے پہلا اخبار تھا۔ جو کسی ہندوستانی زبان میں شائع ہوا۔

راجہ شیو پرشاد

للولال جی نے جس زبان میں کتابیں لکھی تھیں وہ اس اعتبار سے بہت مشکل تھیں کہ اسمیں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے موجود تھے، اسکی طرف سب سے پہلے راجہ شیو پرشاد (۱۸۹۵-۱۸۲۳ء) نے توجہ کی اور غالباً یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے موجودہ ترقی یافتہ ہندی [illegible] تمام مشکل الفاظ سنسکرت کے اس سے خارج کردیئے اور روزہ بولنے

لکھنے کے لیئے زیادہ آسان ہوگئی شیو پرشاد، بی بی رتن کنور مشہور شاعرہ کا (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) پوتا تھا پہلے یہ مہاراجہ بھرتپور کا وکیل تھا، بعد کو انگریزی ملازمت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ میر منشی کے عہدہ سے ترقی کر کے انسپکٹر مدارس ہوگیا، راجہ کا موروثی خطاب بھی گورنمنٹ نے بحال رکھا، اسنے متعدد کتابوں کے ترجمے کیئے اور مدارس کے نصاب کے لیئے ہندی کی کتابیں بھی لکھیں

مطابع کا قیام اس عہد کی ہندی ترقی کا نمایاں امتیاز یہ تھا کہ نثر کی کتابیں زیادہ لکھی گئیں، جسکی اشاعت بھی مطابع کی وجہ سے کافی طور پر ہو سکی سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج ہندی کتابیں طبع ہوئیں لیکن چونکہ مصارف زیادہ ہوتے تھے، اور ٹائپ بھی خراب ہونے کی وجہ سے مقبول نہ تھا اسلیئے کالج نے اس کام کو روک دیا، اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ایک لیتھو پریس قائم ہوا اور اس کے بعد سے ہندی لٹریچر کی اشاعت پورے طور پر ہونے لگے۔

ہریش چندر اسی سلسلہ میں بابو ہریش چندر (۱۸۵۰-۱۸۸۵ء) کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ بنارس کا رہنے والا تھا اور بھارت رندو (یعنی ہندوستان کا چاند) کے لقب سے مشہور تھا کوئینس کالج بنارس میں اسکی تعلیم ہوئی اور سوا سال کی عمر سے اس نے شاعری شروع کی۔ اس نے ۱۲۵ کتابیں تصنیف کیں جمیں اٹھارہ ڈراما اور ناٹک کی کتابیں ہیں علاوہ ادب لطیف کے تاریخ و مذہب وغیرہ کے متعلق بھی اسکی تصانیف پائی جاتی ہیں۔ تاریخ میں کسشمیر کشم اور چرتاولی اسکی مشہور کتابیں ہیں۔ ڈراما کے بعد اس کا عاشقانہ کلام زیادہ مقبول ہوا۔

اس نے ایک رسالہ بھی ہریشچندر کا کے نام سے جاری کیا اور تذکرۃ الشعراء کے طور پر ایک کتاب سندری تلک شائع کی۔

ہندی اور بہاری ڈراما ہندی ڈراما بہت حال کی چیز ہے، اس سے قبل بعض شعراء نے ناٹک کی کتابیں ضرور لکھی تھیں لیکن ڈراما سب سے پہلے ۱۸۵۷ء میں گوپال چند نے لکھا، اس کا نام نہش ناٹک تھا، اس کے بعد ۱۸۶۲ء میں راجہ لکشمن سنگھ نے ایک مشہور ڈراما لکھا جو شکنتلا کے نام سے اب بھی مقبول و معروف ہے، اس کے بعد ہریشچندر اسکی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے ودیا سندر لکھا اس کے بعد سترہ ڈرامے اور تصنیف کیئے، علاوہ ہریشچندر کے تونارام، گوپال رام، کاشی ناتھ، سیتارام وغیرہ نے بھی ڈرامے لکھے اور سب سے پہلے ۱۸۶۸ء

میں ڈراما اسٹیج پر لایا گیا۔

بہار میں ڈراما زیادہ قدیم چیز ہے، ودیاپت ٹھاکر جو پندرہویں صدی کا مصنف ہے سب سے پہلے اس نے بہاری زبان میں ڈراما لکھا۔ اس کے بعد لال جھا نے ۱۷۸۰ء میں پربھاوتی ہرن کے نام سے ایک ڈراما تصنیف کیا۔ یہ بہاری ڈراما ہندی ڈراما سے کچھ مختلف ہے، گفتگو سنسکرت اور پراکرت زبان میں دکھائی ہے، صرف گانے بہاری زبان کے ہیں۔

شعرا کے تذکرے اس عہد میں ہندی شعرا کے تذکرے بھی شائع ہوئے، علاوہ ان تذکروں کے جو للولال جی اور ہریچندر نے لکھے ذیل کی تصانیف بھی قابل ذکر ہیں:۔

راگ کلپدرم۔ اسمیں تقریباً دو سو شعرا کا منتخب کلام ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اس کا مصنف ایک برہمن کرشنانند ویاس دیو تھا، یہ کتاب ۱۸۴۳ء میں مرتب ہوئی۔

رس چندرودے:۔ اسمیں ۲۴۲ شعرا کے کلام کا انتخاب ہے، ٹھاکر پرشاد اس کا مصنف اور ۱۸۶۳ء تاریخ ترتیب ہے۔

دگ بجے بھوشن:۔ اسمیں ۱۹۲ شعرا کا کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا مصنف بلرام پور کا ایک کایستھ گوکل پرشاد تھا، یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مرتب کی گئی۔

شیو سنگھ سروج۔ اس کا مصنف شیو سنگھ ہے، یہ کتاب اور تذکروں سے ماخوذ ہے لیکن بہت مفید اور عمدہ انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔

گوکل ناتھ اس عہد کی ایک مشہور تصنیف ترجمۂ مہابھارت بھی ہے۔ اس کام کو گوکل ناتھ نے ۱۸۲۰ء میں راجہ اودت نرائن (بنارس) کی فرمائش پر شروع کی، اسکی اور تصانیف بھی ہیں، لیکن سب سے زیادہ مشہور اور کارآمد مہابھارت کا ہندی ترجمہ ہے۔

رؤسائے ہند کی سرپرستی ہرچند اس زمانہ میں مطابع وغیرہ کے قیام سے ہندی لٹریچر کی اشاعت زیادہ ہو گئی، پھر بھی بہت سے مقامات میں وہی قدیم طریقہ باقی تھا، اور شعراء ریاستوں کی قدردانی پر پڑے ہوئے تھے، چنانچہ پنا، چرکھاری، ریواں، ناگپور، بنارس، وغیرہ کے درباروں میں شعرا اور بھاٹ اب بھی پائے جاتے تھے، اور بعض فرمانروا خود بھی شاعر تھے، مثلاً مہاراجہ مان سنگھ (جودھپور) جس نے خود متعدد تصانیف کیں۔

مہاراجہ ہندوپت رئیس پنا کے دربار میں موہن بھٹ، روپ ساہی، اور کرن مشہور شاعر تھے، موہن نے فن شعر پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا بیٹا پدماکر بھی بہت مشہور شاعر ہوا ہے۔

جرکھاری کے تین راجہ کھمان سنگھ، وکرم ساہی اور رتن سنگھ نہ صرف شاعروں کے قدردان بلکہ خود بھی شاعر تھے، وکرم ساہی (۱۷۸۵-۱۸۲۹ء) نے بھی ایک ست سئی، بہاری لال کی تتبع میں لکھی ہے، اس کے دربار میں بیتال، مان اور بال دیو خاص شاعر تھے،

راجہ رتن سنگھ کے دربار میں بہاری لال، راؤ رنا، گوپال، رام دین اچھا کہنے والے تھے، ان سب کا زمانہ ترقی ۱۸۴۰ء سمجھنا چاہیئے۔ اس سند میں ایک شاعر سوریا ملا۔ راجہ بوندی کے دربار میں تھا جسکی کتاب بنس بھاسکر مشہور ہے، ریواں میں بھی مہاراجہ جے سنگھ (۱۷۶۴-۱۸۳۴ء) اور اس کے بیٹے وشواناتھ سنگھ (۱۷۸۹-۱۸۵۴ء) نے شعراء کی اچھی قدردانی کی، یہ دونوں خود بھی شاعر تھے، وشواناتھ سنسکرت کا بھی مصنف تھا، اس نے کبیر کی بیجک اور تلسی داس کے ونے پترکا کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ وشواناتھ کا جانشین راجہ رگھوراج سنگھ (۱۸۲۳-۱۸۷۹ء) بھی جو ۱۸۵۹ء میں تخت نشین ہوا اچھا ذوق شاعری کا رکھتا تھا، اسنے بھگوت پران کا ترجمہ کیا اور ہنومان کی تاریخ سندر ستک کے نام سے مرتب کی۔

مہاراجہ مان سنگھ (۱۸۵۰ء) اجودھیا کا رئیس بھی شاعر اور شاعر پسند تھا۔

فن شعرا اس عہد میں بعض شعرا ایسے بھی تھے، جنہوں نے فن شعر کے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ گوردین باندے (۱۸۰۳ء) اور بینی پربین باجپئی (۱۸۱۷ء) نے جو لکھنؤ کا ایک برہمن اور خوشگو شاعر تھا، کئی کتابیں فن شعر کے متعلق لکھیں۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور پدماکر بھٹ ہوا ہے (۱۷۵۳-۱۸۳۳ء) یہ باندہ کا رہنے والا تھا، اور مختلف درباروں میں رہکر اپنی قدر کرا چکا تھا، اسنے سات کتابیں تصنیف کیں جو تقریباً سب کی سب فن شعر سے متعلق ہیں اور آج بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اس کی بہترین تصنیف جگت ونود ہے جو ۱۸۱۰ء میں مرتب کی گئی۔ آخر عمر میں اسنے اپنی زندگی گنگا کی پرستش کے لیئے وقف کردی تھی، اسی بنا پر اسکی آخری تصنیف گنگا لہری ہے، اس کا پوتا گدادھر بھٹ (۱۸۶۰ء) بھی اچھا شاعر تھا، پدماکر کا ایک ہمعصر رقیب اور بھی تھا اس کا نام گوال اور متھرا کا باشندہ تھا، اسکی ایک کتاب جمنا لہری بہت مشہور ہے۔

اسی زمانہ میں ایک شخص بنارس میں رام سہائے داس (۱۸۲۰ء) اور دوسرا پنا میں —— بجیس (۱۸۴۳ء) اچھا کہنے والا تھا ۱۸۲۹ء میں ایک شخص اور پرتاب سہائے بھی خوش فکر شاعر

گذرا ہے، ۱۸۴۲ء میں نبیس نے شہرت حاصل کی جو اس زمانہ کے بہترین شعراء میں سے تھا،
گنیش پرشاد فرخ آبادی (۱۸۴۷-۱۸۷۷ء) بھی اچھا کہنے والا تھا اسکی نک سکھ مشہور ہے، گری دھرداس (۱۸۴۳ء) ہرلیش چندر کا باپ بھی بڑا پرگو شاعر ہوا ہے، اسکی تصانیف چالیس کے قریب ہیں۔

ایک شاعر اور سردار (۱۸۴۵-۱۸۸۳ء) بنارس کا رہنے والا تھا اس نے بہاری لال اور سورداس کے کلام کی شرح لکھی، اور فن شعر پر سرنگار سنگرہ اچھی کتاب تصنیف کی۔ اس کا ایک شاگرد نرائن رائے تھا، اور وہ بھی اچھا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہندی شاعری کی بعض خصوصیات

بیان ماسبق سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہندی شاعری کی ابتداء مذہب سے ہوئی، اور صرف مذہبی خیالات کا اظہار شاعری کا حقیقی مقصود تھا، یہی وجہ ہے کہ نصف سے زائد ہندی لٹریچر بھگتی تحریک سے پیدا ہوا، اور اسی تحریک کے اصول پر اسنے ترقی کی، علاوہ مذہبی لٹریچر کے فن شعر کے متعلق بھی کچھ لٹریچر پیدا ہوا۔ رزمیہ شاعری نے بھی رواج پایا۔ لیکن یہ بھی کسی نہ کسی واسطے سے مذہب ہی پر جاکر منتہی ہوئی۔

انیسویں صدی سے قبل تقریباً تمام ہندی لٹریچر نظم کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہ تصانیف جن کو گورکھ ناتھ سے منسوب کیا جاتا ہے (جو یقیناً اسکی نہیں ہیں) اگر علیحدہ کردیئے جائیں تو پھر کوئی اہم مستثنے بھی باقی نہیں ہے۔ نظم نے نثر کی جگہ اسقدر وسعت کے ساتھ گھیر لی تھی، کہ شرحیں بھی نظم ہی میں لکھی جاتی تھیں حتی کہ نجوم، لغت، تشریح وغیرہ کی کتابیں بھی منظوم ہی ہوا کرتی تھیں۔

نصف سولہویں صدی سے ہندی لٹریچر نے ہوش سنبھالا اور کیشو داس کے زمانہ سے جو فن شعر پر توجہ ہوئی تو اس طرف لوگوں کا میلان بڑھتا ہی گیا حتی کہ عروض وغیرہ کی کثیر کتابیں مرتب ہوگئیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک خرابی بھی شامل تھی، اور وہ یہ کہ جذبات اور مفہوم شعر سے زیادہ الفاظ پر زیادہ نگاہ کی جاتی تھی، اور صناعت لفظی کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔

تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے بھی ہندی نے کوئی ترقی نہیں کی، وہی نیلوفر، چکوا، چکور وغیرہ جو نہایت قدیم زمانہ میں ذریعہ تشبیہ و استعارہ تھے، اب بھی باقی ہیں اور سوائے چند شعراء کے کسی نے مناظر فطرت سے استعارہ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی،

چونکہ ہندی شاعری کا ماخذ بالکل مذہبی روایات ہیں، اسلیئے اسمیں کوئی تنوع پیدا نہ ہوسکا اور سوائے

غیوں افسانوں اور واقعات کے اور کوئی میدان عاشقانہ شاعری کیلیئے تلاش نہیں کیا گیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اخفاءِ حقیقت ہوگا اگر اس کے بعض محاسن کا ذکر نہ کیا جائے۔ شاعری کی حقیقی روح صرف جذبات کی سادگی ہے اور غالباً مشکل سے کوئی اور زبان اس مسئلہ میں ہندی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے،

خلوص و فداکاری کی وہ آلہانہ کیفیت جو ہندوستانی عورت کی خصوصیات میں سے ہے جس خوبی کے ساتھ ہندی زبان میں ادا ہو جاتی ہے، وہ کسی اور زبان کو نصیب نہیں، اور چونکہ اسکی عاشقانہ شاعری میں اظہار جذبات بالعموم عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے اسلیئے اسکی اثرات اور زیادہ بے پناہ ہو جاتے ہیں۔ انداز بیان کے لحاظ سے بھی ہندی شاعری خصوصیت کے ساتھ قابل تعریف ہے اور اگر آج کوئی اسکی مثالیں یکجا کرنا چاہے تو مشکل سے اسکی عمر اس کام کے لیئے کافی ثابت ہو سکتی ہے،

یہ ایک مختصر حقیقت تھی ہندی شاعری کی۔ لیکن چونکہ لٹریچر ہمیشہ نثر سے بنا کرتا ہے اور ہندی نثر حقیقتاً بہت پیچھے ہے اسلیئے ہم ہندی لٹریچر کو فی الجملہ کامیاب نہیں کہہ سکتے، موجودہ دور میں جبکہ ملکی زبان کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا ہے، میں ہندی زبان کی کمزوریوں اور بعض نقائص کو بیان کرنا مناسب سمجھتا کہ مبادا میں موضوع سے علیحدہ ہو جاؤں اور اصلی مقصد سے انحراف کرنے والا کہلایا جاؤں۔

عالم و ما فی العالم

قطرۂ آب میں ہے سطوتِ قلزم مستور
شعلۂ برق ہے جو ڈنکے میں ہوا کے معمور

تخمِ کم مایہ میں پنہاں ہے شجر کی تصویر
ابرِ نیساں میں نمایاں ہے گہر کی تنویر

یوں تو کہنے کے لیئے اسکی بِنا خاک سے ہے
منسلک اپنا کرۂ عالم افلاک سے ہے

بحرِ آتش متلاطم ہے کسی تارے میں
اور آباد ہے خلقت کسی سیّارے میں

بزمِ خورشید میں رقصاں نظر آتا ہے کوئی
مثلِ فانوس درخشاں نظر آتا ہے کوئی

قوتِ ثقل سے ہے ہستیِ اشیاء کو قرار
کششِ مہرِ درخشاں پہ ہے عالم کا مدار

سمتِ قطبین نہ ہو گر کششِ مقناطیس
اہلِ کشتی کو سمندر میں ملے کون انیس

وصلِ ذرات سے شیرازۂ عالم ہے بہم
ان حقائق میں بصیرت ہے اگر سوچیں ہم

(محمود اسرائیلی)

ایک شاعر کی محبت

(سلسلۂ گزشتہ)

۲

انسان مصنوعات کا بندہ ہے اور اپنے زائیدۂ خیال کا غلام، ایک ایسا صناع ہے جو اپنی صنعت کا دلدادہ ہے وہ ایک ایسا خالق ہے جو اپنے مخلوق کی پرستش کرتا ہے۔ عالم حیات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ عدم سے وجود میں آنا گویا سکون میں حرکت کا پیدا ہونا ہے اسلیئے تم کیسے ہی سراپا عمل انسان کو لے لو بالطبع وہ سکون کی طرف مائل ہے، یہی سبب ہے کہ ماضی کی دلچسپیاں اُسے انتہائی دلکش معلوم ہوتی ہیں اور مستقبل کو بھی اپنے انتظار میں ٹھیرا ہوا محسوس کرکے اس کے حصول کے لیئے وہ بیتاب نظر آتا ہے، لیکن حال چونکہ ہر وقت حرکت میں ہے اسلیئے اسکی طرف سے وہ غافل ہے اور بیزار۔

تاریخ کی دلچسپیاں، اساطیر کی دلفریبیاں، سب اسی اصول کے ماتحت قائم ہیں، اور پیشینگوئیاں اسی لحاظ سے ہمارے خیال کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں۔ پھر چونکہ انسان ہر عسیر الحصول چیز کے لیئے سراپا تمنا ہے اور معارج اتصال کے ساتھ اسکی دلچسپیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں، اسلیئے ماضی جسقدر بعید ہے اسی قدر وہ اسے دلچسپ نظر آتا ہے اور جتنے ذرائع اس کے مطالعہ کے لیئے پیدا ہوتے جاتے ہیں اسکی بیتابیاں بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہیں۔

علماء آثار کا ایک ایک بالشت زمین اور ایک ایک ذرہ کے مطالعہ میں اپنی عمریں صرف کر دینا اسی فطرت انسانی کا نتیجہ ہے اور اکتشافات اثریہ پر پروانہ وار لوگوں کا دوڑ پڑنا اسی اقتضاء طبعی کا اظہار۔

فراعنۂ مصر کی مومیائی شدہ لاشیں اپنے مصرف کے لحاظ سے ایک ایسی جنس ہیں کہ سر میں جنکی دنیا کو مطلق ضرورت نہیں، لیکن چونکہ ان کے ذریعہ سے بعید ترین ماضی کا ایک جزو مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے اور اس طرح عدم کا ایک حصہ ہمارے لیئے مرئی ہو جاتا ہے۔ اسلیئے دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی اس کی قیمت قرار نہیں دے سکتی اور ایک جسم بیجان کا مطالعہ ہمارے لیئے حسن ذی حیات کے نظارہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔

مصر قدیم کی ملکہ توت انخ امون کا مقبرہ، زائرین کی کثرت سے آباد نظر آتا ہے اور اس حصۂ زمین تک پہونچنے والا راستہ جو کسی وقت وحشت و ویرانی کا نہایت ہولناک منظر تھا، آج تماشائیوں کے ہجوم سے لندن و پیرس کی سڑکوں کو شرمارہا ہے، یورپ کے بڑے بڑے آثار یمین، مورخین، امراء زادے، سیاح اور قاہرہ و اسکندریہ کے بہترین حصہ

آبادی کے وہ افراد جو اپنے تمدن و معاشرت کے لحاظ سے خود مغرب کے لیئے باعث رشک ہیں۔ آج اس مقبرہ کے دیکھنے کے لیئے ٹوٹے پڑتے ہیں، اور باوجودیکہ حکومت مصر نے ٹکٹ کی قیمت پانچ پونڈ تک بڑھادی ہے، لیکن ایک چپہ زمین بھی اس مقبرہ کا ایسا نہیں ہے جہاں کوئی انسانی وجود نظر نہ آتا ہو۔

ایک سال قبل جب صرف مقبرہ کے وجود کا علم ہوا تھا اور اس کے نوادر برآمد نہ ہوئے تھے، اسی وقت سارا ملک بیتاب تھا، لیکن اب کہ عہد قدیم کی بہت سی قدیم چیزیں سامنے آگئی ہیں شوق و اضطراب کا وہ عالم ہے کہ شاید اتنے زائرین فراعنہ مصر کو بھی کبھی نصیب نہ ہوئے ہونگے۔ اس زمانہ کے طلائی تخت و تاج، زرکار چادروں اور مرصع پردوں اور صندوقوں اور سب سے زیادہ یہ کہ حسین ملکہ توت انخ امون کا اپنی آرام گاہ میں حریری پردوں کے اندر محو خواب نظر آنا، یہ ایسی چیزیں نہ تھیں کہ لوگوں کے مختلف نقطہ ہائے نظر کے لیئے مختلف اسباب جاذبیت اپنے اندر نہ رکھتی ہوں، اگر ایک مورخ وہاں مصر قدیم کی تاریخ کا کوئی راز دریافت کرنے کے لیئے محو نظر آتا تھا، تو مصریات (Egyptology) کا ایک ماہر وہاں کے خطوط ہیرا غلفی پڑھنے میں مصروف تھا، اگر ایک صناع وہاں عہد بعید کے انداز صنعت کا مطالعہ کرنے کے لیئے جارہا تھا، تو بہت سے نوجوان دل ایسے بھی تھے جو صرف ایک حسن خوابیدہ کا نظارہ کرنے کے لیئے تڑپ رہے تھے،

وہاں مصری قبائیں بھی تھیں اور مغربی کوٹ بھی، عربی عمامے بھی نظر آتے تھے، اور تاتاری کلاہ بھی، اگر کہیں یورپ کا حسن بے حجاب جنت نگاہ تھا، تو دوسری طرف قاہرہ کا جمال زیر نقاب، صبر آزما و اضطرار زا۔ مختلف رنگوں کی گہری اور ہلکی رنگینیوں کا امتزاج، جسم کے لحاظ سے لباس کی مختلف تراش و خراش کا اعضاء کے تناسب کا دلفریب نظارہ پیش کرنا، ہلکے ہلکے خندہ ہائے سیمیں اور نرم نرم گفتگوئے نشینمین کا موسیقی فردوس سے فضا کو معمور کردینا، سبک رفتاری کا، قد کی رعنائیوں کو سرو ہائے خراماں میں بدل دینا، نزاکت کا ہر ہر قدم پر کمر کے لیئے ایک سخت خطرہ میں تبدیل ہو ہو کر رہ جانا، شباب کے سخت سخت تر اور سخت ترین مثالوں کا پے در پے سامنے سے گزر کر، نگاہ انتخاب کو اپنے آپ سے بیزار کرجانا، حسن کی تمام قسموں کا "اُف" اور "آہ" سے لیکر "معاذاللہ" کی قسم تک، مسلسل نگاہوں کے سامنے آ آ کر خدا کو ہمیشہ کے لیئے بھلادینے پر مجبور کر کر دینا، عطریات کی کثرت کا، دل کے عمیق ترین گوشوں میں تمناؤں کو بیدار کرکر جانا، الغرض یہ تھا عنصر غالب اُن عناصر کا جن سے اس منظر کی ترکیب وقوع میں آئی تھی۔

لوگ آجارہے تھے، اس موضوع پر مختلف حیثیات سے گفتگو میں مصروف تھے اور ہر طرف ایک عجیب قسم کی چہل پہل نظر آرہی تھی، لیکن اسی ہجوم میں ایک ایسا وجود بھی تھا جو سب سے الگ، تنہا ایک پتھر پہ بیٹھا ہوا خاموش کسی گہری فکر میں مستغرق تھا، اتنے ہجوم میں جو ہنگامہ پیدا ہو سکتا ہے، وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کر رہا تھا، لیکن جادو یہ

کے کان اسوقت بہرے تھے اور اس کے تمام حواس، اسوقت قوت خیال میں تبدیل ہوگئے تھے جس نے
اس تمام ہجوم، بلکہ ساری دنیا اور خود اس کے وجود کو بھی باطل کر دیا تھا، گویا وہ خود بھی اُسی عہد قدیم کا کوئی مجسمہ تھا جو جامد
حالت میں وہاں ہزاروں برس سے قائم تھا، وہ یہاں تنہا نہ آیا تھا بلکہ خالدہ اور اس کا باپ بھی ساتھ تھا لیکن چونکہ
خالدہ اپنے باپ کی موجودگی میں اس کے ساتھ نہ رہ سکتی تھی اور نہ زیادہ اختلاط کی باتیں کر سکتی تھی، اسلیئے وہ تنہا چھوڑ دیا
گیا کیونکہ باوجود اصرار کے اسنے سب کے ساتھ مقبرہ کے اندر جانا پسند نہیں کیا،

چونکہ محبت ایک قسم کی نکہت ہی جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے، اسلیئے اُسکا پوشیدہ رہنا ناممکن ہے
اس لیئے ہرچند خالدہ نے نہایت احتیاط سے کام لیا، لیکن بعض لوگوں کو اس کا علم ہوگیا کہ اُسے جاوید سے
محبت سے اور خالدہ کا کسی سے محبت کرنا گو فرط تاثر سے اسے تباہ کر دینا تھا اسلیئے اگر جاننے والے یہ سمجھتے تھے کہ جاوید
بھی اس کی محبت میں پھنسا جا رہا ہے تو جائے حیرت نہیں۔

سرزمین مصر میں جاوید کا صرف ایک دوست رضا ایسا تھا جس سے وہ اپنے حقیقی جذبات ظاہر کر دینے میں تامل
نہ کر سکتا تھا، لیکن چونکہ اسے واقعی اب تک خالدہ سے محبت نہ ہوئی تھی اسلیئے اسنے اس کا ذکر بھی رضا سے نہ
کیا تھا، اور رضا اپنی جگہ یہی سمجھتا تھا کہ جاوید مجھ سے چھپاتا ہے۔

جاوید اسی عالم سکوت و محویت میں بیٹھا ہوا تھا کہ رضا نے دور سے اُسے دیکھا اور آگے بڑھکر آواز دی، لیکن
جب اُسے کوئی جواب نہ ملا تو قریب آکر اسکے شانہ پر مخلصانہ انداز میں ہات رکھ کر بولا کہ "محبت بھی ایک بلا ہے"
جاوید چونکا، اور اس طرح دیکھنے لگا جیسے کسی کو نہایت گہری نیند سے بیدار کر دیا جائے، اور وہ فوراً کسی
کو نہ پہچان سکے، لیکن چند سکنڈ بعد وہ مسکرانے لگا جس سے مقصود صرف اپنی شدت محویت کو چھپانا تھا،

رضا اسکی یہ حالت دیکھکر ہنس پڑا، اور بولا کہ "تم نے سنا میں نے کیا کہا؟"

جاوید۔ "میں نے نہیں سنا"

رضا۔ "میں نے یہ کہا کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے، تم اس وقت تھے کہاں؟"

جاوید۔ "ہاں، ہوتی ہوگی، مجھے کیا خبر ہے"

رضا۔ "تمہیں خبر نہ ہوگی، لیکن یہ تمھارا اضمحلال، یہ تمہاری سوگواریاں دنیا میں اس کا اعلان کر رہی ہیں کہ جاوید کو
محبت کا آزار ہوگیا ہے"

جاوید۔ "مجھے محبت کا آزار! کس سے؟"

رضا۔ "خالدہ سے، ابراہیم کی اُس بیٹی سے کہ اگر وہ تمہاری طرح کسی اور سے محبت کرتی۔ تو فرط مسرت سے اس کا سینہ شق ہو جاتا۔ مگر تمہارا یہ سوگ، جس کا سبب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، خدا جانے کیا چاہتا ہے اور تمہارا مقصودِ حیات کیا ہے؟"

جاوید نے رضا کو دیکھا مگر اس نگاہ سے جسمیں قہر و تنفر پنہاں تھا، جس سے ملامت و نکوہش ٹپکتی تھی اور پھر خاموشی کے ساتھ گردن جھکا کر اپنی چھڑی کی نوک سے زمین پر آڑے ترچھے خطوط بنا بنا کر مٹانے میں مصروف ہو گیا،

رضا نے جو زیادہ شوخ تھا اور اس سنجیدگی کے مفہوم سے نا آشنا، جو زیادہ بلید تھا اور ان نگاہوں کا مطلب سمجھنے کے ناقابل، جاوید کو پھر چھیڑا اور طعن آمیز لہجہ میں بولا کہ:۔

"ہاں، تمہیں خالدہ کی محبت و شیفتگی کو چھپانا ہی چاہیئے، مجھے بھی اگر آج کوئی لعل شب چراغ میسر آجائے تو خاموش ہو جاؤں کہ مبادا کوئی چھین نہ لے۔ سچ ہے سوسائٹی میں ایک غریب انسان کو آزادی سے محبت کرنے اور محبت کیئے جانے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔"

جاوید نے جسے اس طویل فقرہ کے دوران میں پھر اپنے ہوش میں آجانے کے لیئے کافی وقت مل گیا تھا ذرا خشن انداز میں جواب دیا کہ "یہ تم بک کیا رہے ہو، اور بار بار خالدہ کے نام لینے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے تم کہ تمہاری نگاہ، سطح کی اندر سوئی کی نوک کے برابر بھی نفوذ نہیں کر سکتی، تم کہ تمہاری دنیا لذت کام و دہن سے آگے نہیں بڑھتی تم کہ تمہارے نزدیک حسن کا مفہوم سطح رنگین سے زیادہ نہیں، تم کہ محبت کا مقصود تمہارے پندار میں صرف اتصال جسم کا نام ہے، کیا سمجھ سکتے ہو کہ خالدہ کو مجھ سے محبت ہے یا نہیں اور میں اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہوں، تم اسے صرف ایک عورت جان کر یہی سمجھ سکتے ہو کہ اس کے سامنے صرف محبت پیش کی جا سکتی ہے، لیکن میں اسے ایک عورت سے زیادہ بلند ہستی جان کر، محبت سے زیادہ قیمتی چیز اسکی نذر کے لیئے اپنے پاس رکھتا ہوں، اور وہ میرا جذبۂ احترام ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے سمجھنے سے قاصر رہو اور تم اسے بھی میرا مکر و فریب سمجھو گے، پھر مناسب یہی ہے کہ آئندہ کے لیئے تم اس مسئلہ میں گفتگو ترک کر دو، کیونکہ اب تمہارے لیئے میرے پاس سوائے سکوت کے اور کوئی چیز نہ ہوگی۔"

جاوید یہ کہکر اپنی جگہ سے اٹھا اور رضا کو حیران و خجل چھوڑ کر مقبرہ کی پشت کی طرف چلدیا، جہاں خچروں اور گھوڑوں کی قطاریں زائرین کو واپس لے جانے کے لیئے کھڑی ہوئی تھیں، وہ تھوڑی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک عورت سیاہ کتان کے برقع میں ملفوف اسکی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی، اور جاوید وہیں ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ خالدہ کو دیکھ لینے کے بعد اس کے اعضا ڈھیلے پڑ جاتے تھے اور اسپر ایسی ہیبت طاری ہو جاتی تھی جیسے کلیوپیٹرا کے سامنے وہ

وہ حبشی غلام جسکو زہر کا پیالہ پلانے کے لیئے رات کی تاریکی میں اس کے روبرو لایا جاتا تھا،

جاوید سمجھتا تھا کہ خالدہ کی ہر نگاہ اس کے لیئے، اسکی شاعرانہ ہستی کے لیئے ایک جرعۂ سم آلود سے کم نہیں اور اسکو کسی نہ کسی وقت اسکی غیر معمولی نوازشوں اور آہن گداز ہستیوں کے سامنے سربسجود ہوکر اپنی تمام اُن گدایانہ فنا دگیوں کی لذت کو ہاتھ سے کھو دینا ہے، جو صرف ایک حسن بے پروا کے حضور میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

وہ آگے بڑھتی آتی تھی اور جاوید اندر ہی اندر کانپ رہا تھا، یہاں تک کہ وہ قریب آگئی اور جاوید بدستور گردن جھکائے کھڑا رہا گویا کہ وہ ایک ادنی خادم تھا جو اپنی مالکہ کے سامنے فرط ادب سے جنبش نہ کر سکتا تھا۔

"جاوید، تم ہم لوگوں سے جدا ہو کر کہاں رہ گئے تھے، مقبرہ کے اندر میں نے تمھاری بہت جستجو کی، لیکن تم کہیں نظر نہ آئے"

"جی ہاں، میں اندر نہیں جا سکا"

"کیوں؟"

"میں اس ہجوم میں کیا دیکھتا، خیال تھا کہ ہنگامہ کم ہو تو جاؤں"

"لیکن اب تو واپس جانے کا وقت آگیا"

"تو واپس چلا جاؤنگا"

خالدہ نے یہ جواب سنا اور ایک ایسی جھنجھلاہٹ کے ساتھ، جسکی اگر تحلیل کی جاتی تو سینہ میں خنجر مار کر مر جانے کی آرزو سے زیادہ اور کچھ نہ نکلتی، آگے بڑھی تاکہ زور سے اسکے شانہ کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے، غصہ کرے، اور اس کے اس سکون وجمود کو ریزہ ریزہ کر دے، لیکن اسنے ضبط کیا کہ اس کھلے میدان میں اس کا موقعہ نہ تھا، علاوہ اس کے خود اسکی تہذیب وشائستگی خلوت میں بھی اسکی اجازت نہ دیسکتی تھی چہ جائیکہ اس ہنگامہ میں جہاں خدا معلوم کتنی نگاہیں ان دونوں کو باہم گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ اُسنے اپنے ان تمام جذبات کے طوفان کو حد درجہ ضبط سے کام لیکر ایک ایسی ہلکی سی آہ میں تبدیل کر دیا، جو مشکل سے اسکے حریری نقاب کو بھی جنبش میں لا سکتی تھی اور غیر معمولی افسردگی کے ساتھ "تشریف لائیے" کہکر آگے آگے ہولی۔

— ۳ —

زائرین کی بڑی جماعت مقبرہ دیکھ کر واپس جا چکی ہے اور دو چار لوگ جو باقی ہیں وہ بھی صرف بیرونی نقش ونگار کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خالدہ کی خواہش یہی تھی کہ جاوید بھی اس کے ساتھ واپس جائے، لیکن ابراہیم نے یہ معلوم کر کے کہ ابھی اسنے کچھ نہیں دیکھا، ٹھہرنے کی اجازت دیدی اور ایک تانگہ اس کے لیئے چھوڑ دیا۔ البتہ وایکا

وقت یہ تاکید ضرور کر دی گئی تھی کہ یہاں سے واپس ہو کر سیدھا اس کے مکان پر پہونچے اور شام کا کھانا وہیں کھائے۔

ابراہیم، جاوید سے بڑی محبت رکھتا تھا اور اس کے اطاعت مندانہ طرز عمل سے اسقدر متاثر تھا کہ لبا اوقات وہ اس مسئلہ پر غور کرنے لگتا کہ اگر خالدہ کی شادی اس سے کر دیجائے تو کیا حرج ہی، لیکن چونکہ وہ شہر کا سب سے بڑا تاجر تھا اور بے اندازہ دولت کا مالک، اسلیئے پھر انسانی کمزوری میں مبتلا ہو جاتا اور بدنامی کے خیال سے اس خیال کو ترک کر دیتا۔

ابراہیم ہی کی عنایت سے وہ جامع ازہر میں ملازم ہوا اور اسی کی وجہ سے وہ مقبرہ دیکھنے کے لیئے ٹکٹ اور روک ٹوک سے بچنے کے لیئے مستثنیٰ ہو گیا۔ صبح کو جس وقت ابراہیم کا خاندان یہاں آیا۔ تو یہ بھی ساتھ تھا، لیکن چونکہ خالدہ کی وجہ سے ہر وقت معیت میں رہنا مناسب نہ تھا اسلیئے وہ یہاں آتے ہی جدا ہو گیا اور مقبرہ کے اندر اس خیال سے نہیں گیا کہ جب ہجوم کم ہو جائیگا تو اطمینان سے دکھیگا یہاں تک کہ روانگی کا وقت قریب آگیا اور یہ بدستور اسی نقطۂ میں باہر بیٹھا رہا۔ جب ابراہیم کو یہ حال معلوم ہوا تو اسنے تنہائی سے لطف اٹھانے کی اجازت اسکو دیدی اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا مقبرہ کی طرف چلا۔

مقبرہ کا بیرونی حصہ، جہاں ملکہ توت انخ امون کا تخت و تاج، اور دیگر لوازم حکومت نمائش کے لیئے رکھے ہوئے تھے اسوقت بالکل خالی تھا اسلیئے وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا اور اُن کے مطالعہ میں محو ہو گیا۔ اسوقت اس کا دماغ اب سے ہزاروں سال بیشتر کی تہذیب و معاشرت کا مطالعہ کر رہا تھا، اور چونکہ اسکی نسل میں ایک زمانۂ نامعلوم سے مصر ہی کی آب و ہوا سے پیدا ہونے والا خون دوڑ رہا تھا، اسلیئے اس خیال سے کہ یہ تمام چیزیں اس ہستی کی ہیں جو کسی زمانہ میں سرزمین مصر پر حکومت کرتی تھی، اس کے بدن پر ہلکا سا لرزہ پیدا ہو گیا اور اسکی نگاہ مرعوب ہو کر آہستہ آہستہ جھک گئی گویا کہ وہ حقیقتاً کسی ایوان شاہی میں موجود تھا۔

وہ دیر تک اسی حال میں مصروف رہا، یہاں تک کہ مقبرہ کا اندرونی حصہ بھی آدمیوں سے خالی ہو گیا اور سوائے اُس ایک سپاہی کے جو مقبرہ کے دروازہ پر مسلح ادہر سے ادھر ایک خط مستقیم پر آ جا رہا تھا، اور کوئی متنفس وہاں باقی نہ رہا اب جاوید اٹھا اور دروازہ کے اندر داخل ہو کر ایک ایسی خلوت میں پہونچگیا جہاں ملکہ توت انخ امون کی لاش حنوط کی ہوئی ایک صندوق کے اندر رکھی ہوئی تھی، اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا اور لاش کا سارا جسم سامنے تھا۔ ہر چند اسکو ہزاروں سال کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن اس کے چہرہ کی تازگی کا یہ عالم تھا، گویا وہ ابھی ابھی سوئی ہی اور تمام وہ تازگی جو ایک پر شباب چہرہ میں ہونی چاہیئے پورے طور پر نمایاں تھی،

گیس کے بڑے بڑے فانوس روشن تھے اور اُن کی سپید روشنی میں اس تاریک مقبرہ کا گوشہ گوشہ منور ہو رہا تھا - جاوید اندر داخل ہوا اور اس خیال کے آتے ہی کہ وہ ایک ملکہ کی حضور میں تھا، اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور بمشکل اپنے پانوں زمین پر قایم رکھ سکا، اس کا سر جھکا ہوا تھا، نگاہیں زمین کی طرف مائل تھیں - دونوں ہات سینے پر اظہار عجز کے انداز میں رکھے ہوئے تھے اور پانوں کی حرکت مفقود تھی، وہ بہت کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح دل پر قابو حاصل کرے اور ایک لاش بے جان کے سامنے اسطرح اپنی کمزوری کے اظہار پر خود ہی ملامت بھی کر رہا تھا لیکن وہ اپنے حواس مجتمع کرنے میں بہت مشکل سے کامیاب ہوا اور دروازہ سے صندوق تک دس گز زمین طے کرنے میں اُسے کم از کم آدھ گھنٹہ صرف ہوگیا -

جسوقت اسنے لاش کے چہرہ کو دیکھا تو سکتہ سا اسپر طاری ہوگیا اور اسے یہ دیکھکر کسقدر حیرت ہوئی کہ جس چیز کو وہ بھیانک اور ڈراؤنی خیال کئے ہوئے تھا، وہ حد درجہ حسین و جمیل تھی، وہ اس منظر سے متاثر ہوکر ایک جگہ ٹھٹک کر رہگیا کہ مبادا اس کے بدن کی جنبش، کپڑوں کی سرسراہٹ مصروفِ خواب ملکہ کو بیدار نہ کردے، اور تمام وہ عجز و تضرع جو ایک بادشاہ کے سامنے کسی انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے اسپر مستولی ہوگیا،

وہ اس انداز سے جھکا ہوا کھڑا تھا، جیسے اُسے کوئی حکم دیا جا رہا ہے اور اس کے جسم سے ایسی آمادگی ظاہر ہو رہی تھی گویا کہ وہ تعمیل حکم میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کر سکتا - وہ اسوقت حقیقی معنی میں اس لاش کو ایک زندہ ملکہ اور اپنے آپ کو اس کا ایک ادنی غلام سمجھ رہا تھا اور یہ سمجھنے کے بعد جو کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اسپر پوری قوت کے ساتھ طاری تھیں - ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حالت اسپر کب تک طاری رہتی اگر اسی وقت سپاہی اندر آکر اسکو وقت کے اختتام کی اطلاع نہ دیتا - وہ دیر تک کچھ نہ سمجھ سکا کہ سپاہی کیا کہہ رہا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیے کیونکہ اسکی قوت خیال اُسے اب سے ہزاروں برس پہلے کی فضا میں لے گئی تھی اور قدرتاً ردِ عمل کا اثر ہونے کے لیے اسکو معقول وقفہ کی ضرورت تھی، وہ دیر تک متحیرانہ انداز سے سپاہی کو دیکھتا رہا اور مشکل سے یہ بات اسکی سمجھ میں آسکی کہ وہ کیا ہے اور کہاں کھڑا ہوا ہے -

وہ آہستہ آہستہ نہایت ہی وزنی قدموں کے ساتھ باہر تو نکل آیا لیکن اپنی روح پر وہ ایک ایسا بوجھ محسوس کر رہا تھا کہ جنبش کرنا بھی اسپر سخت بار تھا - اس کا چہرہ زرد تھا اور لب خشک - اسکی آنکھوں سے ایک مبہم جستجو ٹپکتی تھی اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے اس بات کے شاہد تھے کہ وہ کسی سخت دماغی الجھن سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہے - اس کے قدم اٹھ رہے تھے لیکن بغیر کسی قصد و ارادہ کے اور وہ اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا لیکن بغیر اسکے

بنائے حیات

تعلیم فطری کے رواج نے مغربی ممالک میں یہ کیفیت پیدا کردی ہے کہ وہاں قدرت کے مخفی رازوں کی جستجو عام ہوگئی ہے اور اس تجسس کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن نت نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا رہتا ہے اور انسان کا احاطۂ علم وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان علمی کاوشوں سے بالکل فارغ ہے اور یہاں کے بسنے والے اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے کہ جو علمی اکتشافات اسوقت تک ہوچکے ہیں انہیں پر غور کریں۔ سب سے پہلا مسئلہ جو انسان کی توجہ کا مستحق ہے، مسئلۂ حیات ہے جس کے متعلق ایک مقالہ گزشتہ اشاعت میں وجہ حیات کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ آج کی صحبت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ عجیب شے جسے ہم حیات کہتے ہیں کیا ہے، پہلے کسطرح ظہور میں آئی، اور اسکے ظہور کے متعلق عام نظریے کیا ہیں اور کس حد تک قابل اعتماد۔

سب سے پہلے میں اس بات کو واضح کردینا چاہتا ہوں کہ حیات سے میری مراد روح نہیں ہے اگرچہ روح کے بغیر حیات کا وجود میں آنا ناممکن ہے لیکن چونکہ ہم محض روح کو حیات نہیں کہہ سکتے اسلئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حیات کیا ہے اور پہلے وہ کس نوعیت کی ہستی تھی، جو زندگی کی نعمت سے منور ہوئی۔ دیکھا جاتا ہے کہ بعض حیوانات اور نباتات کی بناوٹ بہت نازک و دقیق ہوتی ہے، اور بعض کی نہایت سادہ، یعنی بعض کے اجسام میں مشاغل حیات (Functions of life) کو جاری رکھنے کے لئے نہایت پیچیدہ اعضا بنے ہوئے ہیں اور بعض میں اسقدر سادہ کہ صرف چند اعضا سارا کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر خون کے دورہ کو لیجئے کہ انسان کے بدن میں ایک نہایت مضبوط آلہ ہے جسے دل کہتے ہیں، یہ آلہ پمپ کا کام دیتا یعنی اسمیں خون اکٹھا ہوتا ہے اور یہ اُسے زور سے پہلے پھیپھڑے کیطرف پھینکتا ہے یہاں سے صاف ہوکر پھر دل میں آتا ہے اور دل پھر اُسے سارے بدن میں جاری کرتا ہے، سارے جسم میں دو قسم کی رگوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ایک وہ جن میں خون اکٹھا ہوکر اسی پمپ میں گرتا ہے دوسرے وہ جن کے ذریعہ سے سارے بدن میں تقسیم ہوتا ہے، بمقابلہ اسکے ایک مچھلی کے بدن میں دوران خون کے لئے اور ہی سلسلہ ہے، وہاں دل یا دل نما ایک دوخانہ آلہ ہے جسمیں خون اکٹھا ہوتا ہے یہاں سے اُن گلپھڑ دل میں جاتا ہے جو آنکھ کے نیچے ایک سخت کاغذی غلاف کے نیچے واقع ہیں، یہ گلپھڑے یہاں پھیپھڑوں کا کام دیتے ہیں، یعنی جو فضلۂ کثیف ہوا کا خون کے ذریعہ سے بدن میں آتا ہے، اسے یہ پانی میں پھینکتے ہیں اور پانی سے رقیق ہوا (آکسیجن)

خون میں داخل کرتے ہیں، غرض مچھلی کے بدن میں خون کے دوران کے لیئے اسقدر پیچیدہ جال رگوں کا نہیں ہے جیسا انسان کے بدن میں پایا جاتا ہے ان مشاہدوں سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ پہلے پہل سادہ اجسام کے جانور پیدا ہوئے اور پھر کثرت مشاغل اور کثرتِ ضروریات سے پیچیدہ ہوتے گئے۔

اسلیئے جستجو اس امر کی ہوئی کہ مزید تحقیق سے اُس ہستی کا پتہ لگایا جائے جو سادہ ترین ہو یعنی جس کے بدن کے اعضاء میں مطلق پیچیدگیاں نہ ہوں اور جس کے تمام مشاغل حیات نہایت آسان طور سے انجام پاتے ہوں۔

اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جانور مسمی امیبا (amoeba) پایا گیا۔

امیبا کا جسم ایک نہایت باریک ذرہ کے مشابہ ہے جو اکثر تالابوں یا گڑھوں کی کیچڑ یا مرطوب زمین میں پایا جاتا ہے، اسکے جسم کی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک انچ میں الکھیو کیڑے ایک قطار میں آ سکتے ہیں مگر بعض بڑے بھی ہوتے ہیں جو بغیر خوردبین کے دیکھے جا سکیں اسکے بدن میں ایک زندہ سیلاب مادہ پایا جاتا ہے (یعنی living fluid) اور اسکے اردگرد یہی مادہ جو کچھ گاڑھا ہوتا ہے غلاف کیئے ہوئے ہے جسم کے قریب وسط میں ایک دانہ سا ہوتا ہے جسے نیوکلی اس (nucleus) جسم مرکزی کہتے ہیں۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ اسپر امیبا کی زندگی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ علاوہ اسکے سیلاب مادہ میں بہت سے دانے بھرے ہوئے ہیں جنکی اصل ماہیت چربی اور ایک مادہ ہے جسے پروٹیڈ (Proteid) کہتے ہیں، اس جانور کے ہاتھ پاؤں سر ناک کان وغیرہ اعضاء نہیں ہیں۔ جب اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی خوراک دار شئے نزدیک ہوتی ہے تو یہ جانور اپنے بدن سے اُسی شئے کے دونوں جانب انگلیاں سی نکال کر اُسے گھیر لیتا ہے اور پھر یہ انگلیاں ملا کر اُس شئے کو بالکل اپنے بدن میں جذب کر لیتا ہے اور اس کے بعد اپنی پہلی سی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس کے بدن میں چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی طرح خلا معلوم ہوتا ہے، ان کا فائدہ یہ ہے کہ جب فضلہ باہر پھینکنا ہوتا ہے تو یہ فضلہ پہلے نزدیک ترین خلا میں ڈالا جاتا ہے اور یہاں سے خلا بدن کے نزدیک ترین دیوار کی طرف حرکت کرتا ہے، وہاں جا کر بدن کے غلاف کو پھاڑ کر باہر نکل جاتا ہے، اس کے بعد بدن کا غلاف پھر پہلا سا ہو جاتا ہے یعنی اسی شئے کے دونوں طرف سے غلاف کی دیوار مل کر ایک ہو جاتی ہے، ہم نے ابھی تک اس کے بدن میں جو زندہ سیلاب مادہ ہے اُسکا نام نہیں بتایا، اسے ماہرین علم حیات نے پروٹوپلازم (Protoplasm) سے موسوم کیا ہے یعنی اولین سیلاب اسے زندہ اسلیئے کہا گیا ہے کہ بدن

سے جو انگلیاں سی نکلتی ہیں اور فضلہ دار خلا باہر ڈھکیلا جاتا ہے وہ سب اسی سیلاب مادہ کی حرکت سے ہوتا ہے۔ اب اس جانور کے جسم یا اشغال کے متعلق زیادہ عمیق جانے کی ہمیں ضرورت نہیں کیونکہ ہم اس مقام تک پہونچ گئے جہاں سے حیات کی ابتدا ہوئی اور اس مادہ کو پالیا جو سب سے پہلے موجودہ علم سائنس کے نقطۂ خیال سے زندہ ہوا یعنی اولین زندہ سیلاب۔ فی الحقیقت یہی وہ چیز ہے جو ہر حیوان اور ہر نبات کے بدن کا جزو لاینفک ہے، اگرچہ بعض حالتوں میں یہ کچھ مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن اصل وہی ہے جو ان سب حقیر و کبیر حیوانات و نباتات کی روح رواں ہے۔

بہت سے ماہرین علم حیات نے اس اولین زندہ سیلاب کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ چند کیمیائی مرکبات کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے، اس نتیجہ پر پہونچنے کی یہ دلیل ہے کہ چند کیمیائی مرکبات میں بڑھنے کی قدرت موجود ہے، یعنی جن اجزا سے انکی ترکیب ہوتی ہے اگر ان میں شدید اتصال پایا جائے اور ایک خاص درجہ کی حرارت اور روباد اور خاص مقدار پانی کی موجود ہو تو اجزا ایک دوسرے کو کشش کرتے ہوئے، ایک خاص مرکب بناتے ہیں اور بعد ازاں انہیں اجزا کی مزید مقدار داخل ہونے سے اس مرکب کا حجم بڑھتا ہے، اسی طریق عمل سے علم طبقات الارض (Gealogy) میں بلورات پیدا ہوتے اور بڑھتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض کیمیائی اجزا میں جب وہ خاص حالتوں میں مل کر مرکب بناتے ہیں ایک قسم کا خمیر موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ نہ صرف اپنے ہم جنس اجزا کو جذب کرتے ہیں بلکہ غیر جنس اجزا کو جذب کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

ہر کیمیائی جزو کی حقیر ترین مقدار کو جو کیمیائی نقطۂ خیال سے علیحدہ ہستی رکھتی ہے اسے مالی کیول (molecule) کہا جاتا ہے مگر یہ مقدار اسقدر حقیر ہے کہ نہایت طاقتور خوردبین سے بھی ابھی تک نہیں دیکھی گئی بخلاف اسکے امیبا جو ایک انچ کا ایک سوواں حصہ لمبا ہے خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے، اسلیئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ زندہ سیلاب مادہ پہلے اسقدر باریک تھا اور اس کا کیمیائی مرکب اسقدر چھوٹے مالی کیول کا حجم رکھتا تھا کہ خوردبین کی طاقت سے باہر تھا اور پھر یہ بڑھکر اور بہت بڑا ہو کر اس درجہ پر پہونچا کہ طاقتور خوردبین سے دیکھا جا سکے یعنی زندہ سیلاب مادہ کی ابتدا کیمیائی اجزا کی نہایت ہی قلیل مقدار سے ہوئی ہے، جسے دوسرے لفظوں میں (ultra microscopic) یا غیر خوردبینی کہیں گے۔

تجربات سے اس اولین زندہ سیلاب کے کیمیائی اجزا معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائیٹروجن، فاسفورس، سلفر، قدرے لوہا، سلیکا (جس سے شیشہ بنتا ہے) وغیرہ

موجود ہیں مگر آج تک سب تجربات اس حقیقت کی دریافت سے قاصر ہیں کہ ان مختلف اجزا کے مرکب سے کون کون سے مرکبات بنے ہیں اور ہر جزو کی کسقدر مقدار ہر مرکب میں شامل ہے،

علم الکیمیا دو حصوں پر منقسم ہے "عضوی" (organic) (۲) "غیر عضوی" (inorganic) موخر الذکر کے تحت میں اُن سب اجزا کی تحقیق ہوتی ہے جو زمین کے اندر پائے جاتے ہیں اور اول الذکر سے اُن مرکبات کی تحقیق مراد ہے جنکی ترکیب حیوانات اور نباتات کے اجسام میں ہوتی ہے۔

پہلے پہل جب ان دو حصوں کی تقسیم کی حقیقت کھلی تو اول الذکر کو اسلیئے کہ ان کو ایک زندہ جانور یا پودھ پیدا کرتا ہے یہ کہہ کر بیان کیا کہ یہ "جوہری قوت" (vital force) کا نتیجہ ہیں اور اس قوت پر انسان حاوی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو مرکبات اس طریق عمل سے ترکیب پاتے ہیں انسان انہیں عام اجزا سے نہیں بنا سکتا، مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا جبکہ ایک کیمیادان نے اتفاق سے یوریا (urea) بنا دیا۔ یہ ایک مرکب ہے جو پیشاب میں پایا جاتا ہے۔

بعض کیمیا دانوں نے کیمیائی اجزا سے مرکب تیار کیئے ہیں جو شیشے کی چھوٹی نلکیوں میں خاص درجۂ حرارت کے ساتھ ایک مدت تک رکھنے سے بنائے جاتے ہیں اور حتی الامکان احتیاط کی ہے کہ دوران تجربہ میں بیرونی مادہ اندر داخل نہ ہو، پھر جب اس مرکب کا معائنہ کیا تو اس کیمیائی مرکب میں ایسی شکلیں پائی گئیں جو چند اقسام کے بکٹیریا (Bacteria) سے مشابہ تھیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حقیر ترین زندہ ہستی کیمیائی مرکبات سے تیار یا پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ چونکہ بیرونی اجرام کو باہر رکھنے کے لیئے جو تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں وہ ناقص ہوتی ہیں کسی غیر محسوس طریق پر کوئی ذی حیات جرم نلکی کے اندر پہونچ جاتا ہے، جس سے ماہرین علم الکیمیا یہ سمجھتے ہیں کہ صرف کیمیائی اجزا سے کوئی ذی حیات چیز پیدا کی جا سکتی ہے۔

غزل

ذبح وہ کرتا رہا اور مہرباں دیکھا کیئے
دیدۂ حسرت سے ہم رنگِ جہاں دیکھا کیئے

توڑ دیں مجنوں نے اک جنبش سے زنجیریں تمام
اور ہم زنداں میں تاثیرِ فغاں دیکھا کیئے

روزِ روشن میں مجھے وہ راہزن لوٹا کیا
کس خموشی سے آہ اہل کارواں دیکھا کیئے

اپنا ساغر بزمِ ہستی میں شکستہ ہی رہا
جامِ دشمن میں شرابِ ارغواں دیکھا کیئے

تجھکو ہر دم اہتمام پردہ داری ہی رہا
اور ہم ہر سو ترا جلوہ عیاں دیکھا کیئے

ابرِ رحمت کو نہ دیکھا عمر بھر ہم نے نظیر
ہائے کس حسرت سے سوئے آسماں دیکھا کیئے

بنظیر احمد خاں

زنانِ مصر

اور

مصر کی تاریخ حریّت کا اک خونی صفحہ

(۱)

بین الاقوامی اعتبار سے اگر آج سے دس برس پہلے کا تصور کھینچئے تو معلوم ہوتا ہو کہ شاید براعظم ایشیا و افریقہ میں انسانی آبادی کا وجود ہی نہ تھا، اور اگر تھا تو اسکی آبادی میں "حیات اجتماعی" "تمدن و سیاست" اور "استقلال و حریت" کا نشان تک نہ تھا، گو سیاسی نقطۂ نظر سے مشرقی اقوام کا یہ سکون مغرب کے اُس طریق حکمرانی کی وجہ سے تھا جس نے اپنے مکاید سیاسی سے اُنہیں "حصول حریت" کے طبعی حق کی طرف سے غافل و بے خبر کر دیا تھا، لیکن اُنمیں ارتقار کا ایک طبعی جذبہ ضرور موجود تھا، جس سے کام لینے کے لیئے ایک ادنیٰ تحریک کی ضرورت تھی،

بارے ۱۹۱۴ء میں مغرب میں ایک زلزلہ آیا جس نے اپنی تمام آبادی کو باہم ٹکرا کر مشرق کی خواب آلود اقوام کو بھی بیدار کر دیا۔ یہ بھونچال حادثۂ جنگ تھا جسمیں مغرب کی چند خونخوار و خود غرض قومیں، تہذیب و شائستگی اور اصلاح و آزادی کے نظر فریب دعووں کے ساتھ آپسمیں مصروف پیکار ہوگئیں اور نتیجہ سوائے اسکے کچھ نہوا کہ آج وہ اپنے ایک کروڑ چودہ لاکھ نوجوانوں کی موت پر بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں اور بس۔ اُن کا اندرونی نظام سیاست اسوقت تک درست نہیں اور ملک کی کھوئی ہوئی فراغت و خوشحالی اب تک مفقود ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حادثہ نے مشرق کے لیئے چند مبارک و مسعود اثرات بھی پیدا کیئے جو اسوقت یہاں کی مردہ اقوام کے لیئے آثار حیات ہیں۔ چنانچہ انہیں مشرقی اقوام میں جنہوں نے جنگ مذکور کے بعد ہی آزادی حاصل کرنے کا عزم کیا، مملکت مصر کی وہ مجاہد آبادی بھی ہے جو لوائے حریت لیکر نکلی ہے،

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ جنگ فرنگ نے مشرق کو بیدار کر کے ایک معجزہ سے کم کام نہیں کیا ہو اور آج تمہیں جمہوریۂ عظمیٰ ٹرکی سے لیکر، جمہوریۂ یوکرین جمہوریۂ آذربائیجان، جمہوریۂ ارمنستان، جمہوریۂ داغستان۔ ——— اور دولت مستقلۂ افغانستان تک کی آزاد و خود مختار حکومتیں سب اسی حادثہ کے نتائج نظر آئیں گے، لیکن جہاں جنگ فرنگ نے مشرقی اقوام کو میدان جہاد و حریت میں لا کر کھڑا کر دیا ہے وہاں اُس کا لطیف ترین اثر خواتین

مشرق کی بیداری ہے" مردوں کے دوش بدوش ملکی و معاشرتی مسائل میں شریک عمل نظر آتی ہیں، پھر کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ وہی زنانِ شرق جن کے متعلق یہ خیال پایۂ تصدیق کو پہونچ گیا تھا کہ وہ صرف گھر کی زینت ہیں، آج مردوں کے دوش بدوش میدانِ عمل میں نظر آرہی ہیں، ٹرکی میں خالدہ ادیب و لطیفہ کمال، عائشہ و فاطمہ اور نگار و نزہت خانم نے اپنی حیرت فزا قابلیت سے ترکی خواتین کو میدانِ عمل میں لاکر خدمت و شجاعت، ایثار و قربانی، اور تہذیب و دانش پژوہی کے جو حوصلہ افزا مظاہرے کئے اُن سے تاریخ زنانِ شرق کے صفحات ابد الآباد تک جگمگاتے رہیں گے، اور مصری خواتین کی سیاسی و معاشرتی جدوجہد بھی ایک ایسا سبق ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور دنیا کی تاریخ ہمیشہ انہیں یاد رکھے گی۔

مصر و ٹرکی ترکوں نے سولہویں صدی عیسوی میں مصر کو فتح کیا، انیسویں صدی کے آغاز میں محمد علی نے موجودہ خاندان کی بنیاد ڈالی، پہلے اُس نے خود کو ترکوں کا باجگزار تسلیم کیا، لیکن چالیس برس کے بعد خود مختار بن بیٹھا، ۱۸۷۹ء میں مصر کے خدیو اور سلطان ٹرکی میں ذیل کے اصول پر تعلقات قائم ہوئے۔

(۱) خدیو مصر سالانہ خراج ادا کریگا

(۲) امن کے زمانہ میں اسکو اپنے فوجی مصارف محدود رکھنے پڑینگے

(۳) ٹرکی سے جن حکومتوں کے معاہدے ہونگے ان کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بہت سے یوروپین تجارتی اغراض سے مصر گئے، فضول خرچی کی وجہ سے خدیو اسمعیل قرضدار ہوگیا تھا اسلیئے مصر غیر ملکی قرض خواہوں کے ہات میں پہونچ گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں فرانس اور انگلستان کا رقیبانہ تسلط قائم ہوگیا۔ اور آخر کار یورپین طاقتوں کی متحدہ کوششوں سے اسمعیل کو معزول کردیا گیا۔

تحریکِ آزادی کا آغاز مصری قوم پرستوں کی تحریک کا آغاز اُس وقت ہوا جبکہ برطانی و فرانسیسی سرمایہ داروں اور ان کی حکومتوں کی طاقت خطرناک ثابت ہونے لگی تھی لیکن ابتدا میں انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار ترکی حکومت کے خلاف کیا، اور ترکی افسروں کے عہدوں پر مقرر کئے جانے کی مخالفت کی اس تحریک کے محرک اول عربی پاشا تھے جنہوں نے خدیو کو اپنے جدید اصول قبول کرنے اور مصر کو غیر اقوام کی مالی و سیاسی قیود سے آزاد رہنے کی کوشش پر مجبور کیا۔

دوسرے سال خدیو نے عربی پاشا کی روز افزوں مقبولیت سے خوف زدہ ہوکر (جو اسوقت مصر کے وزیر جنگ تھے) برطانیہ و فرانس کے دامن میں پناہ لینی چاہی لیکن خدیو کے اس طرز عمل پر اسکندریہ میں ایک زبردست شورش پیدا ہوگئی جو غیر ملکی اقوام کے لیئے ایک خونریز بغاوت تھی برطانیہ نے خدیو کی حمایت میں اسکندریہ پر گولہ باری شروع کردی اور وہاں اپنی فوجیں اتار دیں، جنکی کثرت و طاقت کی وجہ سے عربی پاشا کی فوجوں کو ہٹ جانا پڑا۔ عربی پاشا جلاوطن کردیئے گئے اور یہ آگ کچھ دنوں کے لیئے دب گئی اور اسطرح برطانیہ نے مصری احرار کی ابتدائی جدوجہد کو دبادیا، اسوقت حکومت برطانیہ کا مشہور وزیراعظم مسٹر گلیڈ اسٹون تھا، اس نے فوراً ایک اعلان کیا جسمیں یہ ظاہر کیا گیا کہ:-

"برطانیہ کا ایک ریاست محصورہ قائم کرنے کا ارادہ نہیں ہے"۔ ۵ جنوری ۱۸۸۳ء کو دول یورپ کے نام ایک تار بھیجا گیا جسمیں لارڈ گرینوی وزیرخارجہ برطانیہ نے لکھا تھا کہ:-

جب ملک مصر کی حالت کو خدیو سنبھالنے کے قابل ہوجائینگے اور ان کے اندرونی انتظام حکومت میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے کا خطرہ مٹ جائیگا تو حکومت برطانیہ اپنی فوجوں کو فوراً واپس بلالیگی لیکن اس اثنا میں برطانیہ خدیو کو مشورہ دیتا رہیگا"

یہ وہ وعدہ تھا جس کا ایفا آج ۱۹۲۴ء میں بھی نظر نہیں آتا۔

مصر پر ایک مطلق العنان حکومت

مصر پر انگریزوں کے قبضہ و اقتدار کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس سلسلہ میں لارڈ کرومر کا عہد کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

لارڈ کرومر نے مصری قوم پرستوں سے ہمیشہ زبانی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اسپر کبھی عمل نہیں کیا ہرچند اُس نے مصر میں کچھ اصلاح کی یعنی آبپاشی کو ترقی دی اور جبری خدمت کو برائے نام موقوف کردیا، لیکن اس کے ساتھ اُس نے مصر میں انگریزی حکام اور ملازمین کا ایک سیلاب بلالیا، ۱۸۹۶ء میں مصری حکومت میں انگریزی ملازمین کی تعداد (۲۸۶) تھی، ۱۹۰۶ء میں (۲۶۲) ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں (۱۶۷۱) تھی اسطرح رفتہ رفتہ مصری قوم پسندوں کی جماعت میں اصلاح و ترقی ہوتی گئی، اور آزادی کی تحریک میں ایک تازہ روح پیدا ہوتی گئی، لارڈ کرومر کے سبکدوش ہونے کے بعد برطانی حکومت نے مخالفتوں کی یہاں تک چشم پوشی کی کہ ان کو ۱۹۱۳ء میں ایک مجلس وضع قوانین قائم کرلینے دی لیکن

باوجود اس نام کے اس مجلس کو قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہ تھا، یہ مجلس تجویزیں پیش کرتی تھی لیکن حکومت ان کے قبول و منظور کرنے سے انکار کر دیتی تھی ہاں اگر اس مجلس کو کچھ آزادی تھی تو صرف اسقدر کہ وہ محصولوں کے اضافہ کئے جانے کے مسئلہ میں دخل دے سکتی تھی لیکن وہ مصر کی خارجی تعلقات کے مسئلہ پر بحث کرنے کی مجاز نہ تھی،

ایک نئی حکومت

باوجودیکہ اس مجلس کی نیابتی طاقت بہت ضعیف تھی، لیکن اس نے ایک حد تک مصریوں کو اپنے اظہار خیالات اور حکومت پر اعتراضات کے اکثر مواقع بہم پہنچادیئے اور اسلیئے مصری قوم لپند اسے ایک قسم کی "نیم ملکی حکومت" خیال کرتے تھے لیکن اس مجلس کو اپنے اجلاس کا صرف ایک بار موقع ملا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ فرنگ کا آغاز ہوا، اور مصر کو برطانیہ کی ریاست محصورہ میں شامل کر کے، ملک میں فوجی قانون جاری کر دیا گیا اور خدیو عباس کو معزول کر کے محمد علی کی نسل کا ایک شاہزادہ مصر کی مسند حکومت پر بٹھا دیا گیا۔

مصر کے وزیر اعظم رشدی پاشا سے برطانیہ نے اسوقت وعدہ کیا تھا کہ اگر مصری اسوقت برطانیہ کی جنگی نقل و حرکت میں مزاحم نہوں گے تو ان کو صلح ہوجانے پر خود مختار حکومت دیدی جائیگی، باوجودیکہ مصری ان تمام وعدوں پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے کوئی فعل قانون وضابطہ کے خلاف نہ کیا پھر بھی، ڈاک خانوں، تارگھروں، اور مصری اخبارات کا احتساب ہونے لگا، اور مجلس وضع قوانین کو اجلاس کرنے سے روک دیا گیا، باوجود اس قرارداد کے کہ "مصریوں کو جنگ کی آگ میں نہیں جھونکنا چاہیئے" تقریباً (دس لاکھ) آدمی بھرتی کر لیئے گئے، اور ملک کے مواشی، اجناس اور چارہ وغیرہ کی ناقابل برداشت روک ٹوک کر دی گئی جس سے مصریوں کی کثیر آبادی کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔

آزادی کا خواب پریشان

جنگ فرنگ کا زمانہ گو مصری احرار کے لیئے نہایت صبر آزما تھا، لیکن خیال تھا کہ اختتام جنگ کے ساتھ ہی مصر کی کامل آزادی کا اعلان کر دیا جائیگا، لیکن بجائے آزادی کے مصریوں پر اور بھی مظالم توڑے گئے، وزیر اعظم مصر رشدی پاشا نے برطانیہ کے محکمہ خارجہ سے گفت و شنید کی کوشش کی لیکن جواب دیا گیا کہ:-

"ابھی ہم مصروف ہیں، اور ہم کو مصری معاملات پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں"۔

محکمۂ خارجہ کا یہ خشک جواب پاکر غیور مصری وزراء اسیوقت مستعفی ہوگئے اور مصری حکومت کے لیئے یہ نہایت تکلیف دہ دور تھا جبکہ کامل پانچ ماہ تک کسی مدبر نے عہدۂ وزارت قبول نہ کیا۔ "سنسرشپ" نے اخبارات میں اس واقعہ کا اشارہ تک نہ کیا، لیکن اس حالت سے مصریوں میں برطانیہ کے خلاف شدید نفرت پھیل گئی، پریزیڈنٹ ولسن کی حکومت خود اختیاری کے اعلانات سے مصریوں کو یوروپین صلح کانفرنس کی طرف سے کچھ امید قائم ہوگئی تھی، لیکن اس امر پر انہیں سخت حیرت ہوئی کہ شام کی محدود اور نوخیز نام نہاد حکومت کو تو صلح کانفرنس میں نمائندگی کا حق دیا گیا۔ لیکن مصری نمائندوں کو ممانعت کردی گئی، اس فیصلہ سے مصریوں کے اندر سخت غیظ و غضب کے جذبات پیدا ہوگئے، ٹھیک اسی وقت ایک شخص پیدا ہوا۔ جو لارڈ کرومر کے عہد میں مصر کا وزیر تعلیم تھا، اس کا نام سعد زاغلول پاشا تھا جو اسوقت قاہرہ یونیورسٹی کے چانسلر تھا، اس کے ثبات و استقلال نے اس کو تمام ملک میں ہر دلعزیز بنادیا اور جب وزیر اعظم رشدی پاشا کو صلح کانفرنس میں شرکت کرنے سے منع کردیا گیا تو سعد زاغلول پاشا اٹھا اور اس نے پیرس کے لیئے ایک قومی وفد مرتب کیا جسمیں مصر کے اٹھارہ نہایت متبحر سیاست داں شریک تھے سعد زاغلول پاشا کو امید تھی کہ اس وفد کے ذریعہ سے شاید برطانیہ اپنے فیصلہ پر نظرثانی کریگا؟ یا پریزیڈنٹ ولسن اس وفد کے ذریعہ سے مصری مطالبات کی شنوائی و پذیرائی پر آمادہ ہوجائے، اس وفد نے اپنی عرضداشت مرتب کرکے جب اسے ملک کے سامنے پیش کیا تو اسپر (۲۰ لاکھ) دستخط کردیئے گئے، لیکن برطانیہ حکومت نے اس درخواست کی اشاعت روک دی اور اس وفد کے تین ارکان کو پروانہ راہداری دینے سے محض اس عذر لنگ کے ساتھ انکار کردیا کہ ان کے پاس کوئی قومی پروانہ نہ تھا

آگ اور خون کی بارش اور مصریوں کا صبر و استقلال

برطانیہ نے نہ صرف مصری وفد کے مظاہروں کو روک دیا، بلکہ زاغلول پاشا اور اُن کے چار ساتھیوں کو پابہ زنجیر کرکے مالٹا بھیج دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد زاغلول پاشا کی نظربندی تمام ملک میں مشہور ہوگئی اور لوگوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ سلسلۂ رسل و رسائل منقطع کردیا گیا۔ مصری احرار نے مقام اساوٹ میں انگریزوں کو محصور کرلیا اور قاہرہ کے جنوب میں برطانی افسر بُری طرح قتل کرڈالے گئے، دیسی پولیس ان ہنگاموں کو فرو کرنے کے لیئے بھیجی گئی لیکن اس نے بھی ملکی

بھائیوں کے خلاف کام کرنے سے انکار کر دیا، مصر کی تمام آبادی نے خفیہ و علانیہ اس بغاوت سے ہمدردی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ مسلمانوں کے ساتھ قبطیوں اور مصری عیسائیوں نے بھی ان ہنگاموں میں پورے خلوص و انہماک سے کام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرزمین مصر کا ذرہ ذرہ بیتاب نظر آتا تھا اور سارے ملک میں بیداری انتقام کی آگ مشتعل ہو گئی تھی، ملک کی کوئی جماعت ایسی نہ تھی جس نے اپنی قوت حصول آزادی کے لیئے وقف نہ کر دی ہو۔ اور کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو روایات استبداد سے بیزار ہو کر اس کے فنا کر دینے پر آمادہ نہ ہو گیا ہو، چنانچہ اسی سلسلہ میں خواتین مصر بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور مردوں کے دوش بدوش انھوں نے وہ کام کیئے جو یقیناً ہندوستان کے مردوں کو بھی شرما سکتے ہیں اور جن کی تفصیل آپ آئندہ ملاحظہ فرمائیں گے۔

ملا رموزی توحیدی

گلِ تر

خورشید کے سینے میں — میں سوز محبت تھا
کرنوں کے سفینے میں — میں پیک مسرت تھا
ظاہر میں گل تر ہوں
باطن میں پیمبر ہوں

~۲~

اے تشنہ لب دوراں! — میں جام مسرت ہوں
اے نوحہ گر ناداں! — پیغام مسرت ہوں
لے جام مسرت لے!
پیغام مسرت لے!

~۳~

ماضی ہے نہ مستقبل — یہ خواب وہ افسانہ
ہے حال تری مشعل — تو اسکا ہے پروانہ
شعلے پہ فدا ہو جا!
محبوبِ خدا ہو جا!

آمین حزیں

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا لکھنا ضروری ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف
منیجر نگار

استفسارات

کھدر، جن، تعویذ، اُردو لغت

(عبدالحی۔ پٹنہ)

(۱) آپ کے خیال میں کھدر کے استعمال سے کیا کیا فائدے مترتب ہوتے ہیں۔ کھدر اور اُن ملوں میں جو کانگرس مل کہلاتی ہیں کیا فرق ہے، اسکو فوقیت حاصل ہے اور کہاں تک؟

(۲) جنوں کا دخل ہمارے کاموں میں کہاں تک ہے، ان کو ہم پر غلبہ حاصل ہے یا ہم کو اُن پر۔ غلبہ یا عدم غلبہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالیے۔

(۳) بہت سے لوگ تعویذ و حمائل کے قائل نہیں، پھر بھی ہزاروں چشم دید واقعات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سانپ بچھو کے کاٹے ہوئے لوگوں کو جھاڑ پھونک سے افاقہ ہوگیا، حالانکہ ان منتروں کی حقیقت چند بے معنی الفاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

(۴) اُردو کی اسوقت بہترین لغت کون ہے؟ فرہنگ آصفیہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(نگار) (۱) اس ماہ میں جو مقالہ افتتاحیہ درج کیا گیا ہے اسکو ختم ہو جانے دیجیے۔ اگر اسکو تمام و کمال پڑھنے کے بعد بھی آپ کھدر کے فوائد سے بے خبر رہیں، تو دریافت کر لیجیے گا۔ مل کے کپڑوں سے زیادہ کھدر کا استعمال زیادہ موصل الے المطلوب ہے۔

(۲) جنوں کو ہمارے کام میں کوئی دخل نہیں، رہا غلبہ یا عدم غلبہ کا سوال، سو اس کے لیے پہلے جنوں کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور میں ان کے وجود کی طرف سے بہت شک میں ہوں۔

(۳) دعا، تعویذ، جھاڑ پھونک کا اثر صرف اپنے خیال کے زیر اثر اور اعتقاد کی بنا پر ہوا کرتا ہے، جو شخص اس کا قائل نہیں ہے اسکو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ ایک صاحب نے خدا جانے کیونکر یہ یقین کر لیا کہ میں تعویذ اچھا لکھتا ہوں میں نے بہت انکار کیا، لیکن نہ مانے اور بخار کا تعویذ مجھ سے لے گئے۔ دوسرے دن آکر بولے کہ "تم تو انکار کرتے تھے حالانکہ تمھارے تعویذ سے میرا بخار جاتا رہا، مجھے بھی بتا دو"۔ میں نے جواب دیا کہ "تعویذ کھول کر پڑھ لیجیے اور اسمیں جو کچھ لکھا ہے وہی آپ بھی لکھ دیا کیجیے"۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بازو سے تعویذ کھولا اور کپڑے کے اندر سے اُسے نکال کر پڑھا تو یہ شعر لکھا ہوا تھا:

اہل تدبیر کی وا ماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

(۴) اُردو میں اسوقت کوئی لغت اچھا موجود نہیں ہے۔ امیر اللغات اگر مکمل ہوجاتا تو بیشک ایک چیز ہوتی، اسلیے اس عہدِ قحط اللغات میں فرہنگ آصفیہ ہی کی قدر کرنی پڑتی ہے۔

دیوار قہقہہ

(محمد بخش۔ آگرہ)

کیا دیوار قہقہہ، دیوار چین دونوں ایک ہیں اور اگر فی الحال موجود ہیں تو کس جگہ، اور اُن کے پس پشت کون سے ملک واقع ہیں، کس زمانہ میں انکی تعمیر ہوئی اور ہفت عجائبات عالم میں کیوں درج نہیں۔

(نگار) دیوار قہقہہ اور دیوار چین دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ دیوار اب بھی چین میں موجود ہے جس کے دوسری طرف سائبریا کا حصہ واقع ہے، اس کا شمار ہفت عجائبات عالم میں ہے۔ مفصل حال انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں دیکھ لیجیے۔

بُتِ غالیہ مُو

(احمد سعید۔ ڈھاکہ)

غالب کا مشہور شعر ہے، کہتے ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے۔ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے۔
غالیہ مو سے کیا مراد ہے؟ بہار عجم میں لکھا ہے کہ یہ ایک عطر کا نام ہے جو مختلف چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو کیا بتِ غالیہ مو کے معنے "محبوب یا موئے معطر" ہونگے، لیکن کیا ترکیب الفاظ اس معنی کو ظاہر کرسکتی ہے؟۔

(نگار) بیشک بہار عجم میں یہی معنی لکھے ہیں اور یقیناً غالیہ ایک مرکب عطر ہے جسے فارسی میں عطر مثلثی بھی کہتے ہیں، لیکن میرے نزدیک غالب کے اس شعر میں غالیہ کا لغوی مفہوم لینا چاہیے، جسکے معنے طویل و دراز کے ہوسکتے ہیں۔ اسلیے بتِ غالیہ مو سے "محبوب صاحب زلف دراز" مراد ہے۔

طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت

(محمد مشہود فاروقی۔ بھوپال)

طبقہ نسواں کے لیے کس نوع کی تعلیم مفید ہوسکتی ہے اور وہ اصول تربیت کیا ہیں جن کے بغیر دنیا کی ہر تعلیم بجائے مفید ہونے کے نقصان و ضرر میں اضافہ کرتی ہے۔

(نگار) آپ کے سوال میں یقیناً کوئی اہمیت ایسی نہ تھی کہ اس کے جواب کی زحمت گوارا کی جاتی، کیونکہ ایسے پامال اور

ناخوشگوار اور لایعنی مسئلہ پر بحث کرنا کم از کم میرے لیئے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا ہے، لیکن میں نے آپ کا استفسار صرف اسلیئے درج کردیا کہ اس طرح میں ایک بار اور ہمیشہ کے لیئے یہ ظاہر کردوں کہ میں کبھی اس مسئلہ کی طرف اعتنا نہیں کرسکتا آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، آپ کی خواتین کو ایک دن بے پردہ ہوجانا ہے، اور موجودہ نظام تعلیم کا کوئی اصول کوئی قاعدہ اور کوئی مقررہ نصاب ایسا نہیں ہوسکتا جو ایک عورت کو عورت رکھکر دنیا میں رونما کرے، سب سے پہلے آپ اپنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کیجیئے اور اپنی اصلاح کے درپے ہوجیئے کہ عالم نسواں میں خرابی کے تمام تر ذمہ دار مرد ہیں۔ بدقسمتی سے آپ ہی ان اصول تربیت سے بیگانہ ہیں جو صحت اخلاق کے ضامن ہوسکتے ہیں آپ اپنی عورتوں کی اصلاح کیا کرسکتے ہیں۔

۱۹

(احمد حسین خاں۔ تلہر)

میں آپکی مہربانی سے امید کرتا ہوں کہ بذریعہ نگار مندرجہ ذیل استفسارات کے جوابات دیکر بندہ کو مشکور فرمائیں گے:۔

(۱) ذیل کا شعر کس کا ہے۔ اس کے بقیہ اشعار آپ کو معلوم ہوں تو تحریر فرمائیے۔

حقیقت حال می گشتم کند دریائے بے پایاں

چہ اشکم بحر الکاہل بود سیلاب بے ساماں

(۲) کیا نگار صاحب اپنی وسیع تحقیقات سے بتائیں گے کہ شعراء فارسی کے منکشفہ محویات کی عفوصت، اور قافیہ میں نزاجف منفعل کی ماہیت ردیف ملبوس کے مجادلہ فن کی نسبت شعراء اردو، ہندی میں سے کن کن ماہرین فن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

(نگار)

اسماء نجوم

انگریزی میں سیاروں کے نام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی سے ماخوذ ہیں، لیکن بسا اوقات یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کو بگاڑا گیا ہے، اور اسکی اصلیت کیا تھی مثلاً:۔

(۱) Al Katurpos (۲) Al Kaphrah (۳) Aolari

۵۲ Centaurus ۵۳ Zubanelgenubi
۵۷ Jamulhout ۵۸ Cephens

بعض کی اصلیت البتہ کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مثلاً (۱) الحناء = Alhena ،
(۲) Algieba = الزبہ (۳) Atik = عتیق

(نگار) انگریزی میں اکثر اسماء نجوم عربی سے لیے گئے ہیں لیکن ہر اسم کی اصلیت بغیر کاوش کے نہیں معلوم ہو سکتی آپ نے جو اسماء لکھے ہیں اُن کی اصلیت عربی میں علی الترتیب اس طرح پر ہے (۱) القطربوس (۲) القفزہ (۳) الحذاری (۴) قنطوروس (۵) زبانا العقرب (۶) فم الحوت (۷) قیفاوس۔

آپ نے جن اسماء کی اصلیت کھلی ہوئی سمجھ کر عربی مترادف الفاظ لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ یوں درست کر لیجیے۔

(۱) الہنقعہ (۲) الجبہتہ (۳) عاتق الثریا۔

بروج اسماء کی حقیقت

(حسن علی۔ لکھنؤ) بروج افلاک کیونکر قائم ہوئے اور اسکی ابتدا کب ہوئی؟

(نگار) بروج افلاک کے قیام کی ابتدا کلدانیوں کے عہد سے ہوئی ہے۔ پہلے ان کے ہاں زمانہ کی تقسیم چاند کے حساب سے ہوتی تھی، لیکن چونکہ بارہ قمری مہینوں سے پورا سال نہیں بنتا تھا، اسلیئے انہوں نے آفتاب کی گردش ظاہری کو دیکھکر مہینوں کی تقسیم کی، لیکن جب انہوں نے اسپر غور کیا تو ان کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ آفتاب کا جائے وقوع کواکب کے درمیان روزانہ بدلتا رہتا ہے اسلیئے انہوں نے آفتاب کی اس سیاحتِ فلک کو بارہ منزلوں میں تقسیم کیا اور ہر منزل کا نام مختلف حیوانات کے نام پر رکھا۔

بابلی لغت میں بُرج کا نام منزلت تھا جب یونانیوں نے اس تقسیم کو اختیار کیا تو بُرج کا نام دودوکا تیموریا (یعنی بارہ میں سے ایک حصہ) رکھا جیسا کہ کلامِ افلاطون سے ظاہر ہوتا ہے، عبرانیوں نے توریت میں اس کا نام مسلوث رکھا۔

چونکہ یونانی میں اُسے برجس بھی کہتے تھے اسلیئے سریانی میں اُسے بُرج کہنے لگے اور یہی لفظ بجنسہ عربی میں آ گیا۔

مطبوعات جدیدہ

مضامین شرر حصہ اول

اس حصہ میں مولانا شرر کے وہ "شاعرانہ و عاشقانہ" مضامین یکجا کردیئے گئے ہیں جو اس سے قبل دلگداز میں وقتاً فوقتاً شائع ہوچکے ہیں۔ مولانا شرر کی ادبی خدمات ایسی معمولی و کم مایہ نہیں ہیں کہ ان کے اظہار کے لیئے کسی تقریب کی ضرورت ہو۔ ہندوستان کا ہر اُردو داں شخص آپ کے ادبی کارناموں سے واقف ہے اور اب بھی جب کہ اُردو کے طرز انشاء میں بہت کچھ ترقی ہوچکی ہے، مولانا شرر کے ادبی مضامین بدستور تازہ و شگفتہ نظر آتے ہیں۔

ملک کو سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے حضرت شرر کے تمام تاریخی، علمی و ادبی مضامین متعدد مجلدات میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور پہلا حصہ پبلک میں آچکا ہے، یہ حصہ دلگداز کی تقطیع پر ۲۰۰ صفحات کو محیط ہے اور طباعت و کتابت بھی بری نہیں ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ :- ام غلام رسول ۳۰ مزنگ روڈ لاہور

سیاسیات

مصنفہ محمد اجمل خاں بی اے (علیگ) - ملنے کا پتہ قومی دار الاشاعت سرائے گڈھا- الہ آباد قیمت عہ ضخامت ۲۲۸ صفحات تقطیع ۱۸ + ۲۲، کتابت طباعت معمولی۔

خالص فن سیاست کے متعلق غالباً اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علمی حیثیت سے پیش کی گئی ہے، قابل مولف نے اسکو آٹھ ابواب میں تقسیم کرکے سب سے پہلے لفظ سیاسیات کی اصطلاحی تعریف بیان کی ہے اور پھر سلطنت کی کیفیات، حقوق ملی غلامی و آزادی، سلطنت و افراد کے تعلق، سلطنت کے نصب العین، اقسام حکومت اور اس کے اسباب عروج و زوال سے بحث کی گئی ہے، عبارت بہت صاف و شگفتہ ہے اور اندازِ بیان، اسلوب ترتیب اور طریق استدلال میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو ایسے خشک مباحث کے لیئے ازبس ضروری ہے۔

گزشتہ دس سال کے اندر اردو کے اہل قلم افراد کی ذہنیات میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اب علوم و فنون کی کتابیں بھی اردو میں شائع ہونے لگی ہیں اور وہ ادبی یادہ گوئی جس کا تعلق صرف قلب کی سطحی مسرت سے ہے کم ہوتی جاتی ہے۔ ملک کو محمد اجمل خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اُردو کی مطبوعات میں قابل ذکر اضافہ کرکے زبان کی ایک اہم خدمت انجام دی۔

بعض بعض جگہ اصطلات کے ترجمہ سے ہمیں اختلاف ہے۔ مثلاً (Dominion) کا ترجمہ امارت